

# زندگی دُھوپ اور چھاؤں

نگہت عبداللہ



# زندگی دُھوپ چھاؤں

نگہت عبداللہ

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: 37211468 - 37314169

## انتساب

اس کہانی ”زندگی دھوپ چھاؤں“ کے ہر اس کردار کے نام  
جو اپنی محبت، اپنی منزل کو پانے میں ٹھوکر ضرور کھاتا ہے  
مگر کوئی قبل از وقت سنبھلتا ہے  
اور کوئی ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے

(نگہت عبداللہ)

بیسی لفظ

قارمین لرام.....!

ناول ”زندگی دھوپ چھاؤں“ لکھنے کے دوران میں جن نشیب و فراز سے گزری ہوں، یہ میں یا میرا اہل خانہ میری کوشش تھی کہ مختصر عرصہ کے بعد آپ کی خدمت میں اپنا ایک نیا ناول پیش کروں، مگر ہوتا ہوا نہ تھا۔ وہ نہیں جو اس کا بندہ چاہے۔

مذہبِ عرصہ کے طویل ہونے میں کئی مسائل درپیش رہے اور کسی اپنے کے پھٹرنے کا غم بھی شامل حال آیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اپنی ذہنی روح کو بھٹکنے دیا۔ اسی کوشش کی بناء پر میرا یہ نیا ناول ”زندگی اور مہم“ ایک طویل عرصہ کے بعد ہی سہی، مگر آج آپ کے ہاتھوں میں موجود تو ہے۔

۱۱۔ ان کے دوپ چھاؤں میں، میں نے ایک طویل کہانی اور ایک مختصر کہانی تخلیق کو کیا ہے۔ مختصر کہانی میری ۱۲۔ ان کے ایک یادگار کہانی ہے جس کو میں نے ایک نئے انداز میں ایک طویل کہانی میں ضم کیا ہے۔

شیطان.....!

شیطان ازل سے آدم اور حوا کے درمیان موجود ہے۔

بے شک شیطان موجود ہے۔

ہاں.....! شیطان واقعی ہی موجود ہے، لیکن اس سے بڑی ذات اللہ کی ہے، اور یہ ہماری بد قسمتی ہے  
۱. اے اللہ! ہجر و سہ کرنے کی بجائے خود کو آرام سے شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔

بڑے رنگین خواب دکھاتا ہے یہ شیطان مردود۔ انسان اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھتا ہے۔ ہوش تب آتا ہے جب وہی رنگین خواب بھیا تک تعبیر لے کر سامنے آتے ہیں۔



میرے اس ناول ”زندگی دُھوپ چھاؤں“ میں، میں نے ایسی ہی ایک کوشش کی ہے کہ ہم دو کے درمیان موجود تیسرا شیطان کس طرح ہمیں اپنے جال میں پھانسا ہے اور ہمیں اپنی منزل سے کیسے بھٹکا دیتا ہے.....؟

نتیجہ کیا نکلا ہے.....؟

کون بھٹکتا ہے.....؟

کون سنبھلتا ہے.....؟

جیت کس کی ہوتی ہے.....؟

شیطان مردود کی.....؟

یا پھر خاک آدم کی.....؟

اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے گا۔

امید ہے کہ آپ کو میرا یہ ناول ”زندگی دُھوپ چھاؤں“ بھی شروع سے آخر تک اپنے سفر میں لئے رکھے گا اور بے حد پسند آئے گا، انشاء اللہ.....!

اپنے رائے سے ضرور نو ازیئے گا۔

☆.....☆.....☆

## زندگی دُھوپ چھاؤں

ڈور تیل بڑی دیر زور سے بجی تھی۔ ٹانیہ نے گھبرا کر دانیال کو ”خدا حافظ“ کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ پھر گیٹ کی طرف دوڑ لگادی۔ اس کے گیٹ کھولنے تک ڈور تیل پھر بجنے لگی تھی۔

”کھول رہی ہوں بھی.....!“

اس نے گیٹ کھول دیا اور اماں کو اکیلے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”راہو نہیں آئی.....؟“

”نہیں.....!“

اماں گرمی سے پریشان تھیں۔ مختصر جواب دے کر سیدھی اندر چلی گئیں تو وہ ان کے پیچھے آتے ہوئے

بولی۔

خیر اندیش

گلمت عبد اللہ

”اماں.....! میں نے کہا بھی تھا کہ راہو کو ساتھ لے آئے گا۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے۔“

”اپنے گھر کے کھیزروں سے نکلے گی تو آئے گی ناں.....؟“

اماں نے یوں ناگواری کا اظہار کیا جیسے وہ اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں سنا چاہتی تھیں، اور وہ سمجھ کر پوچھنے

لگی۔

”کیسی ہے راہو اور شوہنی.....؟“

”ٹھیک ہیں.....! شوہنی دانت نکال رہا ہے، جب ہی کترو رنگ رہا تھا۔“

اماں جواب دے کر پوچھنے لگیں۔

”تم نے کھانا کالیا کیا.....؟“

”جی.....! لے آؤں.....؟“

”نہیں.....! ابھی تو بھوک بھی نہیں ہے۔ پانی چلا دو۔! ازبیا وہ سخت اذیت لانا۔“

”جی اچھا.....!“

وہ بھاگ کر پانی لے آئی اور گلاس انہیں تھما کر پیٹھنے ہوئے کہنے لگی۔

”کیوں جاتی ہیں آپ رابعہ کے گھر؟“ مت جا یا کریں۔ اب بیٹھی کرو حقیر چیں گی۔“

اماں نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر پانی پی کر لیٹ گئیں تو وہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

”اماں.....! کیا پھر رابعہ کی ساس نے کچھ کہہ دیا ہے؟“

”نہیں.....!“

اماں نے آنکھیں بند کر لیں تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اچھا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے دانیال کے فون نے اس کے دل میں خوش گواہی بپل جپائی تھی۔ اب اماں کی طرح وہ بھی آرزو ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں، خوشی کا دوسرا نام شادی ہے۔ لیکن رابعہ کی شادی کر کے تو اماں ابا کو روگ ہی لگ گیا تھا۔ حالانکہ رابعہ خصوصاً اماں ابا سے تو سوال والوں کی شکایت نہیں کرتی تھی۔ اپنی طرف سے تو بے چاری ”سب ٹھیک ہے“ کا سٹل دیتی تھی، لیکن ماں باپ اس کا چہرہ دیکھتے تھے، جس پر ہر قسم انہیں واضح نظر آتا تھا۔

خوبصاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی رابعہ جس کی ڈیڑھ سال پہلے شادی ہوئی تھی اور وہ تھی تانیہ۔ اس نے اس سال گرجویشن کیا تھا اور اب اماں کے ساتھ گھر داری میں مصروف تھی۔ چار بیٹے پہلے تک اس کی زندگی میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ برسوں سے لگی بندھی روٹین چلی آ رہی تھی کہ اچانک دانیال کی آمد نے اس کے اندر پچھل چھادی تھی۔

یہ چار بیٹے پہلے کی بات تھی۔ وہ کالج سے آ رہی تھی کہ دانیال ایک دم اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

”آپ خوبصاحب کی بیٹی ہیں ناں؟“

”کیوں؟“ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

وہ گھبرا گئی تھی۔

”مجھے خوبصاحب سے آپ کی شکایت کرنی ہے۔“

وہ بظاہر ہر بختیدگی سے بولا تھا۔

”بیمری شکایت.....؟“

وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا نہیں کیا؟“ اچھے بھلے انسان کو پاگل کر دیا ہے۔“

وہ ہنوز سنجیدہ بنا۔

”پاگل؟“ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ خود سوچیں، یہ آفس ٹائم ہے اور میں اس وقت یہاں کھڑا ہوں۔ یہ

پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟“

دانیال کی وضاحت پر وہ اُٹھ گئی۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”سراسر آپ کا ہی قصور ہے۔“

وہ فوراً بولا تھا۔

”سر جھکائے قدم اٹھائی سیدھی دل میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔“

”جی.....؟“

وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹتی۔

”جی.....!“

وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”میں صرف آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس وقت آفس سے بھاگا چلا آتا ہوں۔ وہ دیکھیں

سامنے میرا گھر ہے۔ وہاں نہیں پکڑا ہوتا ہوں آپ کے لئے۔“

اس نے بے اختیار اس کے اشارے کی طرف اس کے گھر کو دیکھا، پھر پلٹ کر تیز قدموں سے چل تو پڑی تھی لیکن اس کا دھیان وہیں رہ گیا تھا اور اگلے روز کالج جاتے ہوئے اس کا دل انجانی نے پڑھڑک رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

میننگ کے دوران وہ بار بار ٹائم دیکھ رہا تھا۔ پھر وہاں سے نکلنے ہی اس نے گاڑی گھر کے راستے پر ڈال

دی۔ گوکہ معمول سے کچھ لیٹ ہو گیا تھا، پھر بھی جانے کیوں اسے یقین تھا کہ تانیہ سے ملاقات ضرور ہوگی، اور آج

کل تو وہ اپنے دل کی ہر بات پر ایمان لے آتا تھا۔ جب ہی لیٹ ہونے کے باوجود وہ چل پڑا تھا۔

اور ابھی آدھا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایک جگہ روڈ کے کنارے خوبصاحب کو پیٹھ دیکھ کر اس نے ایک دم

گاڑی کو بریک لگائے تھے۔

”خوبصاحب یہاں.....؟“

وہ سوچتے ہوئے گاڑی سے اتر کر ان کے پاس چلا آیا اور قدرے تشویش سے پوچھنے لگا۔

”خیریت خوبصاحب.....؟“ آپ یہاں.....؟“

”تم؟“

خولید صاحب اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگے تو وہ فوراً بولا۔

”جی میں دانیال ہوں۔ دانیال حسن! آپ کے گھر کے قریب ہی رہتا ہوں۔ بس..... اتفاق ہے کہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ہاں!.....“

خولید صاحب نے ”ہاں“ کی صورت سانس کھینچی تھی۔

”آپ یہاں.....؟“

اس نے پھر پوچھا تو خولید صاحب خود کو ذمہ پر بیٹھے دیکھ کر بولے۔

”بس بیٹا! ایک یا ایک والے نے ٹکڑا کر یہاں پھینک دیا۔“

”اوہو.....! کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“

اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”بس.....! اللہ نے بچا لیا۔“

خولید صاحب نے کہا تو وہ ان کا بازو تھام کر بولا۔

”آئیے.....! میں گھری جا رہا ہوں، آپ کو بھی چھوڑ دوں گا۔“

”خوش رہو میاں!.....“

اس نے خولید صاحب کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا تو اس وقت اسے صرف انہیں گھر پہنچانے کا خیال تھا، لیکن جب گاڑی ان کے گھر کے سامنے روکی تب ایک دم وہ پری جیکر لگا ہوں میں آسانی تھی جس کی خاطر اس کی روٹین ہی بدل گئی تھی۔

خولید صاحب کے شاید پیر میں موج آئی تھی یا گھٹنے میں چوٹ لگی تھی کہ ان سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور وہ ان کے ساتھ گھر کے اندر آ گیا۔

”ہائے اللہ.....! انہیں کیا ہوا.....؟“

اماں خولید صاحب کو دیکھتے ہی پریشان ہو گئیں۔

”کچھ نہیں!.....! بس.....“

خولید صاحب اسی قدر بولے تھے۔

”کیا بس.....؟ اچھے بھلے گھر سے گئے تھے، اپنے پیروں پر چل کر؟“

”ابھی بھی اپنے پیروں پر چل کر ہی آ رہا ہوں۔ کندھوں پر سوار ہو کر نہیں آ رہا۔“

خولید صاحب جھنجھلا گئے تھے جب اسے بولنا پڑا۔

”آئی.....! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوا خولید صاحب کو، بس.....! چلتے چلتے پیر مڑ گیا تھا۔“

”ہاں!.....! پیر مڑ گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ.....“

خولید صاحب نے تائید کے ساتھ اسے دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

”جی..... دانیال!.....“

”ہاں!.....! دانیال نے دیکھ لیا ورنہ جانے کب تک بیٹھا رہتا سڑک کنارے.....؟“

خولید صاحب نے کہا تو اماں مزید پریشان ہو گئیں۔

”سڑک کنارے.....؟“

”اوہو بیگم! اب سڑک کا نام پوچھنے مت کھڑی ہو جانا.....؟ پہلے شکر یہ ادا کرو دانیال کا، اور کوئی چاہنے پانی لاؤ!.....“

”نہیں خولید صاحب! بہت شکر یہ! اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ فوراً بول پڑا۔

”ہاں!.....! اگر آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو بتائیے!.....! میں لے چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں میاں!.....! معمولی چوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے!.....! پھر میں چلتا ہوں، دوبارہ اللہ آؤں گا۔“

وہ جلدی سے انہیں ”خدا حافظ“ کہہ کر کمرے سے نکلا تھا کہ سامنے کھڑکی میں تائیہ کو کھڑے دیکھ کر بے اختیار ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا تو جوابی اشارہ کرتے ہوئے تائیہ کے چہرے پر شرمیں سکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ سرشار ہو گیا اور یوں سینے پر ہاتھ رکھا جسے میرا دل غلط نہیں کہتا۔

☆☆☆☆

وہ گھر آیا تو ایک ذرا سی ملاقات کا خوش گوار تاثر اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ خولید صاحب تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور یہ موقع اسے قدرت نے فراہم کیا تھا۔ بہر حال اس سے خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ بچن سے کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ سیدھا ادھر ہی آ گیا اور سالن کی دہلیزی میں بیچ چلائی سیما بھابی کو زوردار سلام کر ڈالا۔

”السلام علیکم!.....!“

”ہائے!.....!“

سیما چانک آواز پر اچھل پڑی۔

”تو بہ!.....! ڈرا ہی دیا تم نے۔“

”اِس اودکے!“

حنا مسکرائی، پھر ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”آپ کہاں ہیں؟“

”میں یہاں ہوں۔“

سیما بچن سے نکلے ہوئے کہنے لگی۔

”بڑی عمر ہے تمہاری، ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”اچھا۔۔۔ اب جلدی سے بتا دیں، کیا کام ہے؟“

حنائے یاد کرنے سے کچھ کر کہا تو سیما جھڑکی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ میری اچھی آپ! آپ ہمیشہ مجھے کسی کام سے ہی یاد کرتی ہیں۔“

حنای صاف گوئی پر سیما جڑ بڑھ کر بولی۔

”ہاں تو کام کے وقت وہی یاد آتے ہیں جن سے محبت ہوتی ہے۔ کیوں دانیاں؟“

”بالکل بالکل!“

اس نے فوراً تائید کی۔

”آپ تو ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔“

حنائے اس سے کہا تو وہ کھنڈے اچکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”جاؤ۔۔۔ اجلدی سے دانیاں کسے لئے کھانا نکال دو۔ میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں۔“

سیما کہتے ہوئے آخر میں معنی خیز انداز میں مسکرائی تو بظاہر افسان بن کر حنا بچن کی طرف بڑھ گئی اور

جلدی سے ٹرے میں کھانا رکھ کر دانیاں کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر بمشکل اپنی ناگواری چھپا کر کہنے لگا۔

”ارے۔۔۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟ میں۔۔۔ میں آئی رہا تھا۔“

”تو کیا ہوا؟ میں آگئی، کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“

حنائے مان سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ نظریں چرا گیا۔

”یہ بات نہیں ہے! انٹریفہ گھیس۔“

”شکریہ۔۔۔! کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔“

”جی۔۔۔؟“

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ آپ بے چاری ایک وقت میں کس کس کو دیکھیں؟ گھن چکر پکری رہتی

”کیا بھائی! سلام ہی تو کیا ہے؟“

وہ محفوظ ہو کر بولا۔

”تو بھیا! پہلے ذرا دُور سے کھانس لیا کر دتا کہ بندہ ہوشیار ہو جائے۔ طریقہ بھی یہی ہے۔“

سیمائے کہا تو اس نے پہلے گدی بھجائی، پھر شرارت سے بولا۔

”اچھا! تب ہی میں کہوں، بس اب ہر وقت کھانستے کیوں رہتے ہیں؟“

”انہیں تو خیر پیداؤنی کھانسی ہے۔“

سیما فوراً بولی تھی۔ اے بے اختیار نسی آئی۔

”نہیں بھائی! آپ ذرا پیچھے چلی گئی ہیں۔ بس اب کو کھانسی شادی کے بعد ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے، میری وجہ سے؟“

سیمائے ہاتھ میں پکڑا بیچ اُسے دکھایا تو وہ فوراً کان پکڑ کر بولا۔

”تو پکڑ کریں! آپ کی وجہ سے کیوں؟ آپ تو ان کی زندگی میں بہار بن کر آئی ہیں۔ بس! یہ ہے کہ بس اب کو بہار کا موسم راس نہیں آتا۔“

”نہیں راس آتا ہے؟“

سیما جھٹی تھی۔

”ارے بھائی! میں تو پیدا ہی بہار کے موسم میں ہوا تھا۔ ہر طرف پھول کھل رہے تھے اور ایسی

مست ہوائیں چل رہی تھیں کہ میں پیدا ہوتے ہی کلکھلا لگا تھا۔“

وہ جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔

”اچھا۔۔۔! ذرا اب کلکھلاؤ تو۔۔۔!“

سیما سے بیچ مارنا چاہتی تھی کہ وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن آگے اور مصیبت آ رہی تھی۔ سیما کی بہن

حنا، جس سے وہ بری طرح ٹکرا رہا تھا۔

”اُف!“

حنائے اپنی پیشانی پکڑ لی۔

”سوری سوری! اچھوٹ تو نہیں لگی آپ کو۔۔۔؟“

اس نے پوچھا کہ پوچھا تو پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر دھیر سے بولی تھی۔

”گلی تو ہے۔۔۔!“

”سوری! گنیں!“

ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا، ہمارا گھر قرب ہی ہے۔ میں آکر ان کی ہیلپ کر دیتی ہوں۔“

حتا کی وضاحت پر اسے کہنا پڑا۔

”یہ تو آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔“

”میں تو اچھا کرتی ہوں، آپ کو بھی خیال کرنا چاہیے بلکہ احساس۔“

حتا جانے اسے کس بات کا احساس دلانے جاری تھی کہ اس کا اپنا دھیان بٹ گیا۔ کتابوں کا ریک ویک کر پو پھینگی۔

”آپ کو مطالعے کا شوق بھی ہے؟“

”جی۔! تھوڑا بہت۔!۔!۔“

وہ کھانا شروع کر چکا تھا۔

”مجھے تو بہت شوق ہے۔“

حتا کہتے ہوئے ریک کی طرف بڑھ گئی۔ پھر ایک کتاب نکال کر اس کے صفحے اُلٹتے ہوئے بولی۔

”انشاء جی میرے بھی فیورٹ ہیں۔ کیا خوب کہا ہے انہوں نے۔۔۔۔۔“

جب دہر کے غم سے امان نہ ملی ہم لوگوں نے عشق ایجاد کیا

کبھی شہر بناں میں خراب پھرے کبھی وحش جنوں آباد کیا“

وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا اور رش بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”یہ ٹرے لے جائیے۔!۔“

☆ ☆ ☆

”پتا ہے جائیہ۔۔۔۔۔ ارات امی، ابو کیا باتیں کر رہے تھے؟“

چنگی نے سر کوئی کی اور کچھ راز داری سے کہا تو وہ جھکی ہاری ابھی آ کے لیتی تھی، بغیر کوئی تجسس اور شیطاقت ظاہر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”حالانکہ امی نے مجھے وہاں سے بھگا دیا تھا۔“

”پھر مجھ کو تم نے ان کی باتیں سن لیں؟“

وہ فوراً ٹوک کر بولی کیونکہ چنگی کی عادت سے واقف تھی کہ وہ اصل بات سے پہلے پوری پچویشن ضرور بیان کرتی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔! امی کے کہنے پر کمرے سے تو نکل آئی، لیکن پھر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔“

”کتی بری بات ہے۔“

اس نے غلامت کی۔

”بری بات تو ہے، لیکن کیا کروں؟ بات ہی ایسی تھی۔“

”اچھا چلو، اب اصل بات بتاؤ۔!۔“

وہ اکتا کر بولی۔

”اصل بات۔۔۔۔۔؟ ہاں۔۔۔۔۔! میں نے سنا کہ ابو اپنے کسی دوست کا ذکر کر رہے تھے، جنہوں نے اپنے بیٹے کے لئے جہیں مانگا ہے۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں کچ کبہ رہی ہوں، اپنے کانوں سے سنا ہے میں نے۔“

”افو۔! تو میں نے کب کہا کہ تم جھوٹ کبہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟ اچھا، یہ بتاؤ کون سے دوست۔۔۔۔۔؟ وہ شفیع

صاحب تو نہیں جو اکثر یہاں آتے ہیں۔؟“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔! ابو کوئی اور نام لے رہے تھے۔“

چنگی نے کچھ دیر سوچا، پھر ٹپٹی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

”اوہو۔! مجھے تو نام بھی یاد نہیں آ رہا۔“

”خیر۔۔۔۔۔! نام کو چھوڑو، یہ بتاؤ، اور کیا باتیں ہوئیں۔؟“

”پتا نہیں۔! میں نے تو بس اتنا ہی سنا تھا۔“

چنگی نے کہا تو اس کے اندر جو ایک تجسس جا گا تھا، مایوسی میں بدل گیا۔ وہ دوبارہ لیٹنے ہوئے بولی۔

”چلو جاؤ، تمہیں ابھی روٹی بھی پکانی ہے۔“

اس وقت امی بھی پکارنے لگیں تو چنگی اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے بس کچھ دیر چنگی کی کہی ہوئی بات کو سوچا، پھر منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے اٹھ گئی۔

وہ کوئی بہت کم عمر اور نا سمجھ لڑکی نہیں تھی۔ گزشتہ سال بی اے کرنے کے بعد ایک مقامی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ وہ کسی حد تک حقیقت پسند ہونے کے باعث اتنا جانتی تھی کہ والدین نے اسے پڑھایا لکھایا اور اب جب بھی مناسب سمجھیں گے، اس کی شادی کر دیں گے۔ اس کے خیال میں لڑکیوں کے ساتھ بس یہی کچھ ہوتا ہے، اور غالباً اپنی اسی سوچ کے باعث اس نے خود سے اپنے بارے میں کسی نہیں سوچا تھا اور نہ تو خیال خراب سمجھائے تھے۔ البتہ پڑوسی لکھی لڑکی ہونے کے ناطے یہ ضرور چاہتی تھی کہ اس کے والدین جس شخص سے بھی اس کی شادی کریں، وہ اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم تعلیم یافتہ بھی نہ ہو اور جسے اپنے خاندان کے کسی بھی فرد سے متعارف کراتے ہوئے وہ سبکی محسوس نہ کرے، بصورتِ شکل کے بارے میں تو کہ اس کا خیال تھا، سب اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، پھر بھی شادی سے پہلے وہ

”ابو کی غلطی ہے جو اتنی ذہیل دے رکھی ہے۔ ہر وقت میرے چاند، میرے لال کرتے رہتے ہیں اور چاند کا دماغ ہے کہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا ہے۔“

وہ کچھ اس انداز سے بولی کہ کچھ کوئی آگئی جسے نظر انداز کر کے وہ تاسف سے کہنے لگی۔

”کسی کا کچھ نہیں گزرا۔ چھوٹے بھیاں اسرار اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تنقید کرنے میں کتنے ماسٹر ہیں، لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔ امی، ابو کی خواہش اور پھر ہزار منتوں کے باوجود ان کے بعد پڑھ کے نہیں دیا، نہ کوئی ہنسی کیا، اور جب نوکری کی بات آتی ہے تو جزل بیچر سے کم سوچے نہیں۔“

”چہ چہ.....! واقعی، ان کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔“

”شش.....! وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔“

چکی نے آواز دو بار کرا کر خبردار کیا تو وہ اخبار پھیل کر بظاہر اس میں مصروف ہو گئی۔

”یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو.....؟“

چھوٹے بھیا کو بلاوجہ رعب بھانڈنے کی عادت تھی۔

”آپ کہاں سے آ رہے ہیں.....؟“

وہ ان کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”میں ایک ایجنٹ کے پاس گیا تھا۔“

خلاف توقع وہ رانا نے بغیر تانے لگے۔

”اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جاپان کا بڑا ذرے رہا ہے۔“

”چھا، تو آپ جاپان جائیں گے.....؟“

چکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ہاں.....! کوشش تو کر رہا ہوں۔“

”لیکن جاپان جانا آسان تو نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ کافی پیسے چاہئے ہوں گے.....؟“

”بارہ لاکھ مانگ رہا ہے ایجنٹ۔“

”بارہ لاکھ.....؟“

اس نے تعجب سے ڈھیر لپٹا پھر اپنے طور پر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”چھوڑیں بھیا.....! اگر اسے پیسے ہوتے تو آپ یہیں کوئی کاروبار کر لیتے۔“

”اتنے پیسوں میں کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں.....؟ بارہ لاکھ کم تو نہیں ہوتے۔“

”کوئی بہت زیادہ بھی نہیں ہیں۔ اگر ابو کی کہیں سے انتظام کر دیں تو.....“

دیکھنے کی قائل تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ امی، ابو اس بات کے قائل ہیں یا نہیں۔ بہر حال جب سے چکی نے اسے یہ بات بتائی تھی، جب سے فطری طور پر وہ کچھ ہوشیاری ہو گئی تھی۔

گھر میں کون آ رہا ہے.....؟ کون جا رہا ہے.....؟ بڑے بھیا کی وقت بے وقت آمد اور امی سے سرگوشیوں میں باتیں کرنا، گویا ایک غیر محسوس سی پچھلی شروع ہو گئی تھی اور ادھر یہ پچھلی شروع ہوئی، ادھر اس کے نظریے اور سوچیں آپ ہی آپ زرخشت ہو کر فطری تجسس بیدار کر گئیں۔

”کون ہے.....؟“

”کیسا ہے.....؟“

ہر سوچ اسی سے شروع ہو کر اپنی پختہ ہونے لگی۔ کئی بار اس نے باتوں باتوں میں چکی کو کریدنے کی کوشش کی، لیکن وہ مزید معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی، اس لئے کچھ نہیں بتا سکی۔

”ایسا کرو.....!“

وہ سوچ کر بولی۔

”تم اب براہ راست امی سے پوچھ لو۔“

”ہاں، بھئی ناں.....!“

چکی نے صاف انکار کر دیا۔

”کیوں.....؟“

”اس روز امی اسی سلسلے میں کوئی بات کر رہی تھیں، میں وہاں بیٹھنے لگی تو چھوٹے بھیا نے بری طرح

ڈانٹ کر مجھے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔“

چکی نے وجہ بیان کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تو وہ برا سامنہ بنا کر بولی۔

”چھوٹے بھیا تو بس ایسے ہی ہیں۔ چاہیں اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں.....؟ حالانکہ بڑے بھیا بھی تو ہیں، انہوں نے تو مجھے ہم پر ایسی پابندیاں نہیں لگائی تھیں۔ ایک یہ ہیں، انہیں کوئی کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔“

”ہاں.....! اور پتا ہے، صبح جب تم اسکول جاتی ہو تو یہ روزانہ گھنٹہ بھر تو ضروری سے اٹھتے ہیں کہ کیا

ضرورت ہے چھپیں نوکری کرنے کی.....؟“

”خود جو نہیں کرتے۔“

وہ جل کر بولی۔

”آخر چھوٹے بھیا ایسے کیوں ہیں.....؟ انہیں کم از کم ہمارے میں تو سوچنا چاہئے۔ امی بھی ان کی

طرف سے اتنی پریشان رہتی ہیں۔“

اس نے کچھ تاسف سے انہیں دیکھا اور کچھ کے بغیر وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆☆

رات میں بچن کے آخری کام جلدی جلدی نمٹاتے ہوئے اس کا دھیان ٹیلی فون کی طرف تھا۔ کیونکہ دانیال حسن سوئے سے پہلے اسے فون ضرور کرتا تھا۔ جبکہ اسے فون ریسیور کرنے کا موقع کبھی بھی ہی ملتا تھا۔ اگر اماں یا ابافون اٹھا لیتے تھے۔ پھر وہ ان کی بڑ بڑاہٹ سنتی تھی کہ پتا نہیں کون ہے؟ آواز سن کر فون بند کر دیا۔ لیکن وہ سمجھ جاتی تھی۔

اور آج کیونکہ ابافون کے باعث لینے ہوئے تھے اور اماں مسلسل ان کی تمارداری کر رہی تھیں۔ اس لئے وہ بچن سے فارغ ہوتے ہی ٹیلی فون بیٹ لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ ٹیلنچ اٹھی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھا لیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔؟“

فوراً کال ریسیور ہونے پر دانیال کو یقین تھا کہ وہی ہوگی، جب ہی مخطوط ہو کر بولا تھا، اور ناشیہ کے ہوٹوں سے دہلی دہلی ہنسی کی آواز ابھری تھی۔

”بڑی ظالم ہو.....! صرف فون پر ہنسی ہو۔ سامنے آؤں تو یوں بن جاتی ہوں جیسے جاتی ہی نہیں.....!“ اس کے ہنکھوہ کرنے پر وہ دھیر سے بولی تھی۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیسا ہے۔؟“

وہ شریر ہوا۔

”مجھے نہیں پتا.....!“

وہ کشیدہ ہو گئی۔

”لیکن مجھے سب پتا ہے۔ بلکہ اب تو سا۔۔۔ زمانے کو پتا چلنے والا ہے۔“

دانیال نے کہا تو وہ گھبرا گئی۔

”سنگ..... کیا پتا چلنے والا ہے۔؟“

”جی کہہ راتوں کو چپ چپ کر فون پر باتیں کرنے والے اب دنیا کے سامنے ہاتھ ڈال کر

چلا کریں گے۔“

اس نے کہا تو وہ پھر زروں ہو گئی۔

”میں فون رکھ رہی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور رکھ دیا اور کچھ دیر اسے سوچتی رہی، پھر ایک دم ابا کا خیال آنے پر جلدی سے جا کر ٹیلی فون بیٹ اس کی جگہ پر رکھا، پھر اماں ابا کے کمرے میں آکر پوچھنے لگی۔

”ابا.....! آپ کے گھٹنے میں درد تو نہیں ہو رہا۔؟“

”نہیں بیٹا.....! تمہاری اماں نے آپو کیس دی تھی۔ اب کافی آرام ہے۔“

ابا نے کہا تو وہ بیٹھے ہوئے بولی۔

”وہی آپ کو ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا چاہئے تھا۔“

”ختم سے میں بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن یہ سنتے کب ہیں کسی کی.....؟ اب بتاؤ.....! رات میں کوئی

مسئلہ ہو گیا تو۔؟“

اماں اسی فکر میں بیٹھی تھیں۔

”تو بھلی چوٹا لگا دیتا۔“

ابا فوراً بولے تھے۔

”سن لیا.....؟“

اماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”اچھا چلیں.....! اب آپ بھی آرام کریں۔ انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اور ہاں.....! کچھ چاہئے

تو بتاؤ۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں.....! بس جاؤ تم بھی.....!“

اماں نے کہا تو وہ ”شب بخیر“ کہہ کر پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی کوئی اتنی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی،

اور پہلے تو وہ بڑے آرام سے سو جایا کرتی تھی، لیکن جب سے دانیال زندگی میں آیا تھا، نیند آنکھوں سے زخمت ہو گئی

تھی۔ اس کی جگہ سونوں نے لے لی تھی۔ اس کی سنگت میں ایک اُن دیکھی دنیا کا سفر بڑا حسین لگتا تھا۔ وہ اس سفر کے اختتام پر منزل کا تصور لئے سو گئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ اماں نے بھی نہیں چکایا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر

اماں کے پاس آئی تو وہ بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔

”اماں.....! میں اتنی دیر تک سوئی رہی.....؟ ابا کہاں ہیں.....؟“

اس نے متوجہ ہو کر پوچھا تھا۔

”آفس چلے گئے۔“

اماں کا انداز ناراضگی لئے ہوئے تھا۔

”آفس؟ لیکن ان سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔“  
”کہہ رہے تھے ضروری کام ہے۔ لنگڑا اتے ہوئے گئے ہیں۔ جاؤ تم ناشتر کرو۔!“  
اماں نے جواب کے ساتھ کہا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔ لائیے! یہ سب میں کاٹ دوں۔“  
اس نے بیٹھے ہوئے اماں کے ہاتھ سے چھری لے لی تو وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”پتا نہیں شوہنی کی طبیعت کیسی ہے؟ کبھی کبھی تمہارا بچہ سے فون کر کے بتا دیتا۔“  
”ارے اماں! آپ کو رابعہ کی ساس کا پتا تو ہے۔ فون کے قریب بھی نہیں پھٹکتے دیتیں اسے۔“  
وہ کلر ہو کر بولی تھی۔

”ہاں! بڑی بڑی کوڈر خدا کا خوف نہیں ہے۔ ایسے ترساتی ہے میری بیٹی کو جیسے میکے میں تو اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔“

”بڑی بڑی کو چھوڑیں اماں! عباد بھائی کون سا رابعہ کا خیال رکھتے ہیں؟ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ہی ہیں۔“

اس نے کہا تو اماں نے ٹوک دیا۔

”اچھا بس! تم نہ زیادہ بولا کرو۔“

”لیجئے! میں کیوں نہ بولوں؟ میری بہن کو فریال بنا کر رکھا ہوا ہے انہوں نے۔“

وہ تیز ہو کر بولی تو اماں اسے دیکھنے لگیں۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں اماں! اویسے غلطی آپ لوگوں کی ہے۔ بنا چھان بین کے اٹھا کے دے دی لڑکی۔“

”ارے! چھان بین کا موقع کب دیا تھا انہوں نے؟ بس! بات ڈالی اور بیماری کا ناکہ رچایا تھا اس کی ساس نے۔“

”بیماری کا ناکہ تو اب تک چل رہا ہے ان کا۔“

وہ کہتے ہوئے سبزی کی باسٹ اٹھا کر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سیما کو اپنے گھر پر مکمل عکرائی حاصل تھی۔ ساس، سرسختے نہیں، شوہر سادہ مزاج اور خصوصاً گھر کیلئے کھیتوں سے خود کاشت کی ہوئی رکھتے تھے اور ایک دیور دانیال حسن جس پر اسے مکمل کنٹرول تھا۔ اس کی کسی بات پر تاں

کہتا تو دور کی بات، اختلاف تک نہیں کرتا تھا، اس سے وہ بہت خوش تھی اور اپنی خوشی انی ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دانیال کی شادی اپنی بہن حنا سے کرے گی۔

حنا انگریزی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ وہ قدرے آزاد خیال اور لا اُنہالی سی لڑکی تھی۔ خوب صورت بھی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی کے دل میں اُس نے کئے کے ظاہری خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بہر حال اسے بھی دانیال پسند تھا۔ مزید سیما سے سہرے خواب دکھائی تھی اور اس نے اپنی ماں سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ حنا کو ہی اپنی دیور بنائی بنائے گی۔ اس وقت وہ فون پر اپنی اماں کو ٹولی دے رہی تھی۔

”اوہو اماں! میں نے کہا تھا! اب یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بالکل فکر مت کریں۔ میں حنا کی شادی دانیال سے ہی کرادوں گی۔“

”نہیں! اب در تو نہیں ہے، بس! میں! آج کل میں ہی بات کروں گی۔“

”ارے امی! آپ کو پتا ہے، میرا دیور میری بہن نہیں نکالتا۔ میں جہاں کہوں گی، وہ وہیں شادی کرے گا، اور میں نے سوچ لیا ہے، حنا ہی اس گھر میں آئے گی۔“

”ہاں! آپ سہ نظر ہو جائیں۔“

”اچھا! اب میں فون رکھتی ہوں۔ کھانا بنانے جارہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے! انشاء اللہ!“

وہ فون رکھ کر کچن میں آ گئی۔ بچوں کے اکیڑی سے آنے سے پہلے وہ کچن کے کاموں سے فارغ ہو جاتا چاہتی تھی۔ اس کی سہی روٹین تھی۔ ہر کام وقت پر کرنے کی عادت نے ہی اس کا سناں اور یورپی نظریں مقام بنایا ہوا تھا۔ پھر سلیقہ مند بھی تھی۔ پھیلاؤ تو بدداشت ہی نہیں کرتی تھی۔

حقیقتاً اس کی طرف سے کبھی اس کے میاں حسن کو اور دیور دانیال حسن کو شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے یہ محض اس کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دانیال کی شادی کے لئے حنا کا نام لے گی تو وہ دونوں بھائی بلاچن وچر امان جائیں گے۔

اور ایسا وہ بھی سکتا تھا۔ اگر جو دانیال کی زندگی میں ٹائی نہ آئی ہوتی۔ پھر انگریزی اس نے اشارتاً بھی سیما کو یہ سیکل نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے لئے جیون ساتھی کا انتخاب کر چکا ہے، نہ ہی اس کی کسی حرکت سے سیما کو شبہ ہوا تھا۔ جب ہی رات کے کھانے پر اپنا مقصد بیان کرنے سے پہلے اس نے تمہید مانگ لی تھی۔

”تم میری اچھی خاصی پریذکرا دیتے ہو دانیال! میرا ایک پیڑ بچن میں ہوتا ہے، دوسرا تمہارے کمرے میں۔ اب خدا کے لئے خود سے ناشتر، کھانے پر آنے کی عادت ڈال لو۔“

”جی؟“

دانیال نے ان اکھیوں سے کمال حسن کی طرف دیکھا تھا۔



”کیا لوگے؟ چاول یا روٹی؟“

سیرا نے اس سے پوچھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”بس! تھوڑے سے چاول!“

”تھوڑے سے کیوں؟ پیٹ بھر کر کھاؤ!“

کمال حسن نے کہا تو سیرا معنی خیز انداز میں کہنے لگی۔

”آپ سمجھے نہیں کمال! اصل میں اب اسے میرے ہاتھ کا کھانا اچھا نہیں لگتا۔ کچھ نیا پن چاہ رہا ہے۔“

”نیا پن؟“

کمال حسن نے دانیال کو دیکھا، پھر سمجھ کر بولے۔

”اوہ! یہ تو اچھی بات ہے۔ مجرور کس بات کی ہے؟“

”کسی بات کی نہیں!“

سیرا فوراً بولی تھی۔

”میں تو خود کب سے کہہ رہی ہوں کہ دانیال اپنے بیروں پر کھڑا ہو چکا ہے۔ اب اس کی شادی کا

سوچیں، لیکن آپ سنتے ہی نہیں!“

”سن تو رہا ہوں۔“

کمال حسن، سیرا سے کہہ کر دانیال کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں بھئی! دانیال! لڑکی وڑکی دیکھی جائے؟“

”جی۔“

اس نے شٹا کر سیرا کو دیکھا تو ہنس کر بولی۔

”شرما کیوں رہے ہو؟ بتا دو اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو۔“

”جی وہ وہ۔“

وہ کمال حسن کے سامنے کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

”ہاں ہاں! بتاؤ۔“

کمال حسن نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا تو وہ دک کر بولا تھا۔

”جی وہ۔“

”جانے۔“

سیرا کے اندر یک لحظ جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔

”یہ تانیہ کون ہے؟ میں نے تو پہلے یہ نام بھی نہیں سنا۔؟ خاندان کی ہے۔؟“

”نہیں بھائی!۔۔۔ اوہ نہیں آگے خلیفہ صاحب رہتے ہیں ناں! ان کی بیٹی ہے۔ بھائی! آپ تو

ٹایہ جانتے ہوں گے خلیفہ صاحب کو۔۔۔ محلے میں بڑی عزت ہے ان کی۔“

وہ کمال حسن سے مخاطب ہو گیا تھا اور سیرا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔؟ فوراً محالمت کر

لے وہ ان بھائیوں کی نظروں میں بری بھی نہیں بننا چاہتی تھی، اس لئے برتن رکھنے کے بجائے وہ وہاں سے اٹھتی

تھی۔

پھر اسے زیادہ غصہ نہ آئے آپ پر تھا کہ اس نے کیوں دانیال کی پسند پوچھی؟ پہلے ہی حنا کا نام لے

لیٹی۔ اگر دانیال ٹال مٹول کرتا بھی تو کمال حسن ضرور اس کی حمایت کرتے۔ اس وقت وہ بیٹھی تھلا رہی تھی کہ حنا کاپری

ہوئی آگئی۔

”آپا! آپا!۔۔۔“

سیرا اندرونی کشش کے باعث بے دھیانی میں حنا کو دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا آپا!۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔؟“

حنانے قریب آ کر پوچھا تو چونکے کے ساتھ وہ نظر میں چر آ گئی۔

”ہاں بس!“

”کیا بس؟ مجھے تو آپ ٹھیک نہیں لگ رہی ہیں۔ ٹینشن میں لگ رہی ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے

لیا۔۔۔؟“

حننا مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ہوں؟ نہیں! کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس! ایسے ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔“

وہ ابھی حنا کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن حنا بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”آپا!۔۔۔ اب کیا آپ مجھ سے بھی چچا نہیں گی؟“

”اوہو! تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔“

وہ جھنجھائی۔

”بہت ہے کہ میں بات جانے بغیر پیچھا نہیں چھوڑ دوں گی تو بتاؤں!۔۔۔“

”ابھی نہیں!۔۔۔ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں اس کا پتہ صاف کروں۔“

وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”پتہ صاف کروں؟ کس کی بات کر رہی ہیں؟ پلیز آپا!۔۔۔ یہ اذھوری باتیں مت کریں۔

صاف صاف بتائیں مجھے۔“

حنا بیٹھے والی نہیں تھی۔

”کیا بتاؤں؟“

سماں نے ہتھیرا ڈال دیئے۔

”مجھے دانیال سے یہ امید نہیں تھی۔ میں تو اسے بہت سیدھا سمجھتی تھی، لیکن وہ تو بڑا تیز نکلا۔ اتنی بڑی

بات مجھ سے چھپا کی؟“ ہوا تک نہیں لگنے دی۔

”کس بات کی ہوا نہیں لگنے دی؟“

حنا نے زنج ہو کر ٹوکا۔

”موصوف کا دل آ گیا ہے، وہ خوبصورت صاحب کی بیٹی پر۔“

سیما تو جھلنے انداز میں بولی تھی، حنا بھی اُچھل پڑی۔

”تھک..... کیا.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟ کس نے بتایا آپ کو.....؟“

”ارے..... کوئی اور بتاتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی، خود اپنے من سے پھوٹا ہے دانیال، اور یہ بھی کہہ گیا

ہے کہ میں آج اس کا رشتہ لے کر جاؤں خوبصورت صاحب کے گھر۔“

”آپا.....!“

حنا رو ہنسی ہوئی تو وہ ایک دم سنبھل کر کہنے لگی۔

”ارے.....! تم مل چھوٹا نہ کرو۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔“

”کیا کریں گی آپ؟“ بلکہ آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔ یوں میں آپ کے دیور صاحب مجھ سے سیدھے

منہ بات ہی نہیں کرتے۔“

حنا کی مامی پر اسے پتھلے لگ گئے۔

”پاگل ہو تو.....! تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں.....؟ لیکن ہاں.....! ذرا

مجھے ہوشیاری سے چلنا پڑے گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لالچی بھی نہ ٹوٹے۔“

پھر وہ نرم پڑ کر حنا کو یقین دلانے لگی تھی کہ دانیال اسی کا ہے۔

☆ ☆ ☆

”اچھا.....!“

رابرہ ہنسنے ہوئے اماں کے گلے لگ گئی۔

”خوش رہو.....!“

اماں نے رابرہ کا سر چوم کر اسے دُعا دی۔

”اماں.....! دیکھیں تو شوہنی کتنا پیارا ہو گیا ہے۔“

اس نے شوہنی کو ہاتھوں پر اُچھالے ہوئے کہا۔

”ماشاء اللہ.....! اللہ نظر بد سے بچائے۔“

اماں نے شوہنی کی پائیں لیں۔ پھر رابرہ سے پوچھنے لگیں۔

”تم کس کے ساتھ آئی ہو.....؟“

”عباد چھوڑ گئے ہیں اماں.....!“

رابرہ کے جواب پر اماں تنجب ہوئیں۔

”ہائیں.....؟ عباد اندر نہیں آیا.....؟“

”نہیں.....! انہیں کسی کام سے جانا تھا، شام میں آئیں گے۔“

رابرہ نے سہولت سے بتایا تو اس بار وہ بول پڑی۔

”اب تم شام میں عباد بھائی کے ساتھ چلی مت جانا۔ اسنے دنوں بعد آئی ہو، رکوگی ناں.....؟“

”ہاں.....! میری ساس کو جانتی نہیں ہو.....؟ ابھی بھی آ رہی تھی تو بار بار کے جارہی تھیں کہ جلدی آتا۔“

رابرہ شاید کچھ زیادہ ہی بلی بخنی ہوئی تھی، جو اماں کے سامنے ہی کہہ گئی۔

”غلطی تمہاری ہے۔ خواہ خواہ اتنا ڈرتی ہو۔ کیا عباد بھائی بھی تمہاری طرف داری میں کچھ نہیں

بولتے.....؟“

”وہ کیا بولیں گے.....؟ وہ تو خود اپنی اماں سے اتنا ڈرتے ہیں۔“

”تو ایسا کرو.....“

وہ کوئی مشورہ دینے جارہی تھی کہ اماں نے ٹوک دیا۔

”بس ٹائیٹ.....! تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ لاؤ شوہنی کو مجھے دو، اور بہن کے لئے شربت بنا

لاؤ۔“

”اماں.....! آپ بھی بس.....“

وہ شوہنی کو اماں کی گود میں ڈال کر بڑ بڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے رابرہ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ اپنی

زندگی میں آنے والے نئے نمونے کے بارے میں بھی بتانا تھا، لیکن اماں رابرہ کے پاس سے اُٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ تب

وہ گھر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو کر ابھی اپنی الماری تھیک کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ رابرہ آگئی۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور اس کی گود سے جھپٹنے کے انداز میں شوہنی کو لے کر بولی۔

”ہائے.....! آج، تم نے تو ہمیں ترسائی دیا ہے۔ اماں روز دن کہتی ہیں کہ رابرہ کو دیکھے ہوئے اسنے دن

ہو گئے ہیں۔“

وہ کھانا پکانے میں لگ گئی۔ پھر کھانے کے بعد جب اماں نماز کے لئے اٹھیں تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، رابعہ اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولی تھی۔

”تو اب تم بھی پرائی ہونے والی ہو۔؟“

”کیا مطلب۔؟“

وہ اس اچانک بات پر ہلکا مٹی تھی۔

”مطلب یہ کہ عیدہ خالہ نے تمہارے لئے کوئی پرپزل بتایا ہے۔ اماں، اب آج کل اسی پر غور کر رہے ہیں۔“

رابعہ نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”سگ۔ کیا۔؟ یہ کس نے کہا تم سے۔؟“

”اماں نے۔! ابھی وہ بیٹی باتیں تو کر رہی تھیں۔“

رابعہ حیرت سے بتاتے ہوئے اچانک تھکی تھی۔

”تم پریشان کیوں ہو گئیں۔؟ کوئی اور پکرے کیا۔؟“

وہ نظریں چرا کر اٹھنے لگی تھی کہ رابعہ نے پھر اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”پاکل مت ہوتا یہ۔! اچھا کڑی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ کیونکہ اماں، اب عیدہ خالہ کے بتائے ہوئے

پرپزل پر سنجیدہ ہو رہے ہیں۔“

”نہیں رابعہ۔! تم۔ میرا مطلب ہے تم روکواں کو، بلکہ وہاں منع کروادو۔!“

وہ پریشانی سے بولی۔

”وہ تو میں منع کروادوں گی، لیکن یہ بھی تو پتا چلے، ہاں کہاں بھروانی ہے۔؟“

رابعہ نے شرارت سے اس کے بازو میں پتلی کاٹ کر پوچھا تو وہ قصداً بے نیازی سے بولی۔

”جہاں بھروانی ہوگی، بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔! پھر اماں ہی کو بتا دینا۔ کیونکہ میں تو اتنی جلدی جلدی نہیں آسکتی۔“

رابعہ نے اس سے زیادہ بے نیازی دکھائی تو وہ وادہ دانت نہیں کر بولی۔

”زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھی۔؟“

”کیوں۔؟ تم اتر آسکتی ہو، میں کیوں نہیں اتر آسکتی۔؟ بتانا ہے تو ابھی بتاؤ تاکہ میں اماں کے کان

میں بات ڈالتی جاؤں، ورنہ ایسا نہ ہو، اگلی بار میں آؤں تو پتا چلے اماں، اماں تمہاری بات کچھ کر دی ہے۔“

رابعہ نے اسے متوقع صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ خائف ہو گئی۔

”اچھا بس۔! اچپ ہو جاؤ۔!“

رابعہ نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر اٹھکی رکھی، پھر آنکھوں سے اسے بتانے کا اشارہ کیا تو وہ جھنجھپ کر

بولی۔

”دانیال۔! دانیال حسن۔!“

”ارے۔! یہ تو بڑا افسانوی سامان ہے۔ کون ہے۔؟ کیا ہے۔؟ کہاں ملا۔؟“

رابعہ نے نام سے متاثر ہو کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تو وہ پہلے ہی، پھر پہلی ملاقات سے جو بتانا شروع ہوئی تو اس کی داستان ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کو بڑے بھیا آئے، ساتھ میں بھائی اور بچے بھی تھے۔ اسے دیکھ کر جس طرح بھائی معنی خیز مسکرائیں، اس سے وہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی بات ہے اور یقیناً امی نے انہیں خاص طور پر بلوایا ہے۔ پھر بھی اپنے طور پر وہ انجان بنی رہی۔ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھی، پھر رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں بچن میں آ گئی، اور ابھی وہ چالو نکال ہی رہی تھی کہ بھائی اس کے پیچھے آ گئیں۔

”کیا پکاری ہو۔؟“

وہ آتے ہی پوچھنے لگیں۔

”مٹر پلاؤ، اور۔۔۔“

”بس۔! مٹر پلاؤ کافی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اہتمام مت کرنا۔“

”کیوں۔؟“

”اس لئے کہ مٹر کوئی مہمان نہیں ہیں۔“

پھر مسکرا کر بولیں۔

”البتہ تم اب مہمان ہو۔“

”میں۔؟“

وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔

”اب بنو مت۔!“

بھائی نے شرارت سے گھورا۔

”اسنے دلوں سے بات چل رہی ہے، آخر تمہیں کچھ تو خبر ہوگی۔؟“

”نہیں بھائی۔! مجھے واقعی کچھ پتا نہیں۔ بس ایک روز جنگی نے بتایا تھا کہ ابوائے کسی دوست کے بیٹے

کا ذکر کر رہے تھے۔“

وہ صاف گوئی سے بولی۔

”ہاں.....! اور اے آج مجھے اسی لئے بلا یا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں۔“

”صرف بتا دوں.....؟“

اس نے سوچا اور سوالیہ نظروں سے بھابی کی طرف دیکھا تو وہ تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”لو کے کا نام جہانزیب ہے اور بینک میں منیجر ہے۔ زیادہ لمبی چوڑی ٹیلی بھی نہیں ہے۔ بس دو ہفتیں ہیں اور دونوں شادی شدہ ہیں، البتہ چھوٹا بھائی ہے جو آج کل کوری کی تلاش میں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہے اس پر۔ تھوڑا بہت اس کے والد بھی کما لیتے ہیں اور اس کی والدہ بھی اچھی خاتون ہیں۔“

بھابی خاموش ہوئیں، تب بھی وہ اسی طرح ان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی، کیونکہ جو بات وہ جانتا چاہتی تھی، وہ تو بھابی نے بتائی ہی نہیں تھی۔

”اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

بھابی اس کے دیکھتے رہنے پر جو سمجھیں، اسی حساب سے کہا تو وہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”آپ نے اسے دیکھا ہے.....؟“

”کسے؟“ اچھا اچھا.....! کیا تم جہانزیب کا پوچھ رہی ہو.....؟ ہاں.....! میں نے دیکھا ہے، خاصا

بینڈم ہے۔“

پھر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

”کیا تم بھی دیکھنا چاہتی ہو.....؟“

”ہاں.....!“

وہ آہستہ سے بولی۔

”میں نے تمہارے بھیا سے پہلے ہی کہا تھا، اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ کہنے لگے کہ جب جہانزیب نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی اور اپنے والدین کی پسند کو قبول کر رہا ہے تو ہمیں بھی ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”اس لئے کہ ہم لڑکی والے ہیں۔“

”شاید.....! بہر حال ہر گز تم نہ کرو۔ جہانزیب واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔“

بھابی کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چاول چبھنے میں مصروف ہو گئی۔ تب یکدم پھر بعد

بھابی کہنے لگی۔

”دو بیسے دیکھنا کوئی اتنا مشکل نہیں ہے۔ جس اسکول میں تم جاتی ہو، اس سے بس ایک اسٹاپ آگے

ہی تو اس کا بینک ہے۔ چاہو تو کسی دن جا کر نہ صرف دیکھ لیتا، بلکہ بھی لیتا۔“

”نہیں بھابی.....! یہ مناسب نہیں ہے۔ کیا سوچے گا وہ کہ.....“

”بیوقوف.....!“

بھابی فوراً ٹوک کر بولیں۔

”میرا مطلب ہے، اپنا تعارف کروائے بغیر اسے دیکھ آنا، یا پھر انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے کسی دن وہ گھر

آ جائے۔ دے دیے بھی اس کے یہاں آنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے نا.....!“

”چھوڑیں بھابی.....! آپ نے تو اس بات کو سمجھ گئی ہے ہی لے لیا۔“

وہ موضوع ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”کیا مطلب.....؟ یعنی میں تو تمہاری خواہش کو سمجھتے ہوئے تمہارا ساتھ دے رہی ہوں اور تم.....“

بھابی نے براہ راست ہوئے کہا تو وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔

”پلیز.....! روٹھے نہیں، میں جانتی ہوں آپ میری بہت اچھی بھابی ہیں۔“

”چلو ہو.....!“

”ایسے نہیں، پبلش کر دکھائیں۔“

اس کے گدگدائے پر بھابی ہنس پڑیں۔

☆.....☆.....☆

وہ صبح سہا سے کھڑے آئے تھا کہ وہ آج خوبصورت صاحب کے ہاں چلی جائے اور کیونکہ سہانے بھی بڑے جوش کے ہاں بھری تھی، اس لئے وہ آفس ہی میں اس کے فون کا منتظر تھا کہ وہ خوبصورت صاحب کے ہاں سے آکر شام تک انتظار نہیں کرے گی اور ابھی اسے خوش خبری سنائے گی۔ اس انتظار میں اس کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار ٹیلی فون اٹھا کر چیک کرتا۔

آخر صبر نہیں ہوا تو جلدی جلدی ایک دو ضروری کام نمٹا کر گھر چلا آیا اور لاؤنج ہی سے ”بھابی.....!“

بھابی.....! پکارتے ہوئے سہا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اسے بیڈ پر لیٹی نظر آئی۔

”ہیں.....؟“

وہ حیران ہوا۔

”کمال ہے بھابی.....! آپ اتنے آرام سے لیٹی ہیں.....؟ میرا تو خیال تھا آپ میرے انتظار میں

بے چینی سے ٹہل رہی ہوں گی.....؟“

”کیوں.....؟ آج تم نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے کیا.....؟“

سیما کچھ کر بھی انجان بن گئی، لیکن وہ اپنی دُشمن میں بولا تھا۔  
 ”میں تو اسے کارنامہ ہی کہوں گا۔ البتہ میرے کارنامے کو پایہ تکمیل تک آپ نے پہنچانا ہے۔“  
 ”مم۔ میں کبھی نہیں! تم کس کارنامے کی بات کر رہے ہو۔؟“  
 سیما نے مزید اٹھنے کی ایکٹنگ کی۔  
 ”کیا مطلب۔؟ آپ واقعی نہیں سمجھیں۔؟ یا مجھے تنگ کر رہی ہیں۔؟ آپ کو خوبصورت صاحب کے ہاں جانا تھا۔“

اس نے زور دے کر کہا۔  
 ”اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔! تو تم اسی لئے آفس سے جلدی آ گئے ہو۔۔۔؟“  
 سیما نے سمجھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولا۔  
 ”جی۔۔۔! آپ بتائیے۔ کیا پروگرام ہے۔۔۔؟“  
 ”بھئی۔۔۔! امیرا تو کیا پروگرام تھا، کپڑے بھی استری کر لئے تھے لیکن۔۔۔“  
 ”کیوں نہیں؟“

اس نے بے صبری سے نوا کو سیما اٹھنے کی کوشش میں کراہ کر بولی۔  
 ”میرا پیر سلپ ہو گیا، کمر میں کافی چوٹ آئی ہے۔ اب چلنا تو کیا، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔“  
 ”اوہ۔۔۔!“  
 وہ پریشان ہو گیا۔

”تو بھائی۔۔۔! آپ مجھے اسی وقت غن کر دیتیں، میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلا۔“  
 ”تمہارے بھیا آگئے تھے، لیکن ڈاکٹر کے پاس جانے کی میری ہمت نہیں تھی۔ خیر۔۔۔! وہ دو الے آئے تھے۔ شام تک دیکھو اٹھنے کے قابل ہوئی تو چلی جاؤں گی۔“  
 ”ارے۔۔۔! انہیں بھائی۔۔۔! ابھی آپ آرام کریں۔ جب فٹ فالٹ ہو جائیں، تب جائیے گا، اور کوئی میڈ۔۔۔ن۔ غیر لائی ہے تو بتائیں۔!“  
 ”نہیں۔۔۔! تب۔۔۔! سے بھیلے آئے تھے۔“  
 ”چلیں۔۔۔! آپ آرام کریں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لیجئے گا۔“

وہ پورے خلوص سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ جتنا وہ غفلت تھا، تو دوسرے کو بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ سیما اس کے لئے کیا سوچے بیٹھی ہے۔؟ جبکہ اس کا دھیان ثانیک کی طرف سے ہٹ گیا تھا اور وہ سیما کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ کمرے میں آ کر بھی وہ الرٹ بیٹھ گیا کہ کسی وقت بھی سیما کا رکنتی

تھی، اور سیما نے تو نہیں پکارا، حواس کے لئے چائے لے کر آگئی تو وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔  
 ”آپ کب آئیں۔۔۔؟“  
 ”میں اتفاق سے یہ یونیورسٹی سے ادھر ہی آگئی تھی۔ دیکھا تو آپا گری پڑی تھیں۔ میں نے جلدی سے ذہبا بھائی کو فون کر کے بلالیا تھا۔“

حنایتا تے ہوئے بیٹھ گئی تو اس نے جڑبڑ ہو کر چائے کا کپ اٹھالیا تھا۔  
 ”آج آپا کا سارا پروگرام چو پٹ ہو گیا۔“  
 حنا نے کہا تو وہ نا سمجھے ہوئے بولا۔  
 ”جی۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! آپا تیار ہی تھیں، انہیں آپ کا پرنسزل لے کر جانا تھا۔ بہت خوش ہو رہی تھیں آپا، لیکن بے چاری سلپ ہو گئیں۔“  
 حنا کی بات سن کر وہ خاموش ہو رہا تو قدرے ڈک کر وہ پھر کہنے لگی۔

”ثانیہ نام ہے ناں اس لڑکی کا۔؟ میں اسے جانتی تو نہیں ہوں، لیکن آنکھ نظر آتی ہے۔“  
 اس نے فوٹس نہیں لیا تو پوچھنے لگی۔  
 ”آپ نے کہاں دیکھا تھا ثانیہ کو۔؟“  
 ”جی۔۔۔؟“

اس کے چوٹنے پر حنا ہنس کر بولی۔  
 ”ارے۔۔۔! آپ کتنے خیالوں میں گم ہیں۔؟ میں کب سے آپ سے بات کر رہی ہوں۔“  
 ”سوری۔۔۔! میں آپ کی بات نہیں سن سکا۔“  
 وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر چائے کا کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔  
 ”مانسٹرمت کیجئے گا، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اور ہاں۔۔۔! بھائی کا خیال رکھئے گا۔“  
 ”آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی بھابی میری بھی کچھ لگتی ہے۔“  
 وہ اندر ہی اندر تھلا کر بولی تھی۔  
 ”جب ہی تو میں اطمینان سے جا رہا ہوں۔“

وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ حالانکہ ابھی اسے کہیں نہیں جانا تھا۔ اس وقت کوئی دوست بھی نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ دن کے تیسرے پہر ہی آپس میں مصروف ہوتے تھے۔ وہ صرف اس لڑکی حنا سے بھاگ کر نکلا تھا۔ وہ اس کی بزدلی فرقی ہونے کی کوشش سے سخت ڈالاں تھا۔ اگر وہ سیما کی بہن نہ ہوتی، تب تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب مجبوراً اسے نہ صرف برداشت کرنا پڑتا، بلکہ اخلاقی تھانے بھی بھانے پڑتے تھے، جس کے لئے اسے خود پر بہت

ابھی بھی وہ محض اس کی وجہ سے بلا وجہ سڑکیں تپتا پھرتا رہا تھا۔ پھر شام میں وہ ایک ریسٹورینٹ میں جا بیٹھا تو وہاں اتفاق سے ایک دوست مل گیا جس کے ساتھ باتوں میں وقت کا پتا نہیں چلا۔ کھانا بھی وہیں کھالیا، اور جب گھر لوٹا تو گیارہ بج رہے تھے۔ خاموشی سے وہ یہی سمجھا کہ سب سو چکے ہوں گے، اس لئے سیدھا اپنے کمرے میں آ رہا تھا کہ نہ صرف ٹھکا، بلکہ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کی آرام دہ چیز پر حنا بیک پر سرنگائے سو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا اسے کرسی سمیت اٹھا کر باہر پھینک دے۔ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے زور سے کھانسا تو حنا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”سو رہی! وہ..... پڑتے پڑتے میری آنکھ لگ گئی۔“

”لیکن اس وقت آپ کو میرے کمرے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

وہ کی طرح اپنی ناگواری چھپا نہیں سکا۔

”معاف کیجئے گا، میں شوق سے یہاں نہیں بیٹھی تھی۔ مجھے آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں اور آپ کو کھانا کھا کر سوؤں۔“

اس کی ناگواری دیکھتے ہوئے حنا بھی جھک کر بولی تھی۔

”شکریہ.....! میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“

”یہ اگر آپ جانتے ہوئے کہہ کر جاتے کہ کھانے کے لئے آپ کا انتظار نہ کیا جائے تو میں بھی اس ذلت سے بچ جاتی۔“

حنا کی بات پر وہ پکڑا گیا۔

”ذلت؟“

”تو اور کیا؟ عزت افزائی تو نہیں کی آپ نے میری؟“

حنا کا انداز ہنوز تھا۔ دانیال کو احساس ہوا کہ وہ غلط فیہو کر گیا ہے۔

”اے بیٹی! سو رہی.....! میں اصل میں آپ کو یہاں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔“

”کیوں؟ خود پر پھر وسوسہ نہیں ہے کیا؟“

وہ چوٹ لگنے سے باز نہیں آئی۔ پھر فوراً ”گنڈ ناٹ“ کہہ کر چلی گئی تو کتنی دیر وہ اس کے پیچھے دیکھتا رہا۔ پھر جس جگہ کہ پہلے خود کو نال کیا، اس کے بعد کارڈ لیس اٹھا کر ٹائیٹ نمبرڈ اکل کیا تو ادھر تیل جاتے ہی اس نے فون اٹھایا تھا۔

”انتظار کر رہی تھی؟“

اس نے کہا تو وہ دھیر سے سے بولی تھی۔

”ہاں.....! بہت دیر ہے۔“

”سو رہی.....! میں اصل میں ایک کام میں پھنس گیا تھا۔“

”میں سمجھ گئی تھی، ایسی ہی بات ہوگی، اور میں نے آپ سے شکوہ تو نہیں کیا۔“

حانیہ نے کہا تو وہ سانس سمجھ کر بولا۔

”تمہاری یہی بات تو مجھے ابھی لگتی ہے۔ ویسے کبھی کبھی شکوہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، کر سکتی ہو۔“

”اچھا.....!“

اس کی دلی دلی غمی میں وہ دھوکا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اماں، ابا کی باتیں سن رہی تھی۔ ناشیدہ کرتے ہوئے اماں سے پوچھ رہے تھے۔

”پھر مجیدہ کا فون نہیں آیا کیا؟“

”ہاں.....! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔“

”اچھا.....! کیا کہہ رہی تھی؟“

”وہی جو اسے دنوں سے کہہ رہی ہے کہ جا کر لڑکے کو دیکھ آئیں۔ پھر جو چھان بین کرنی ہو، وہ بھی کر لیں۔“

اماں نے بتایا تو ابا نے غالباً اثبات میں سر ہلایا تھا، جب ہی ان کی آواز نہیں آئی تھی۔ پھر اماں بولی

”حیں۔“

”سچ کچھ نہیں تو میرا دل تو ڈرتا ہے۔ انجان لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پہلے کیسے نظر آتے ہیں، بعد میں کیا لگتے ہیں؟“

”راہبہ کا حال نہیں دیکھا؟“

”سب نصیب کی باتیں ہیں بیگم! قسمت ساتھ نہ دے تو اچھے کو برا بننے میں دیر نہیں لگتی۔“

ابا کی بات پر اماں کڑھ کر بولی تھیں۔

”تو کیا میں یہ سوچ کر ممبر کروں کہ راہبہ کا نصیب ہی برا ہے؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“ دعا کر، اللہ بڑا کا ساز ہے، اور دیکھو، ہم اس ڈر سے کہ کہیں حانیہ کا نصیب

بھی راہبہ جیسا نہ ہو، حانیہ کو بھٹائے تو نہیں رکھیں گے ناں؟“

”نہیں.....! کیوں بھٹائے رکھیں گے؟ میں تو خود چاہتی ہوں اب جلدی حانیہ کی شادی ہو

”اسی لئے تو میں حیدہ کا پوچھ رہا تھا۔ فون کر کے اس سے لڑکے کا آتا پتا معلوم کر لو، میں چھان بین کرنے سے ہی انہیں گھر بلاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔! میں آج ہی حیدہ سے معلوم کر لیتی ہوں۔“

اماں کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ راجہ نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ اماں کو دانیال کے بارے میں بتا کر جائے گی۔ پتا نہیں وہ بھول گئی تھی یا اماں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ بہر حال نہ صرف پریشان تھی، بلکہ اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

راجہ کو فون تو کر سکتی تھیں لیکن ادھر اس کی ساس راجہ سے بات ہی نہیں کرنے دیتی تھیں، اور اماں سے وہ خود پوچھ نہیں سکتی تھی۔ اسی پریشانی میں کھڑی تھی کہ اماں آ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا کر رہی ہو ناٹھی؟“

”کچھ نہیں اماں۔! آپ بتائیں کیا کام ہے۔؟“

اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”وہ۔! میں یہ کہہ رہی تھی کہ درزن کے ہاں چلی جاؤ۔ کبھی کے پیسے دینے ہیں اور ایک دوست بھی ملنے دے دو۔“

اماں نے کہا تو وہ ٹھٹک کر پوچھنے لگی۔

”سوٹ؟ سوٹ کون سے؟“

”میں ابھی دیتی ہوں۔“

اماں نے کہہ کر الماری کھولی اور دو سوٹ شاپر میں ڈال کر اسے تھمتے ہوئے بولیں۔

”بہت دن لگا دیتی ہے درزن، ابھی دو گی تو پتا نہیں کب سی کر دے گی، اور یہ کمپنی کے پیسے بھی دے دیتا۔“

وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ کہاں کے ہاتھ سے پیسے لے کر بولی۔

”آپ بھی چلیں اماں! پچھلی بار درزن خال خال آپ کا پوچھ رہی تھیں۔“

”ارے بیٹا! مجھ سے کہاں اتنا چلتا جاتا ہے؟ تم جا کر دے آؤ، اور دیکھو۔! بیٹھ مت جانا

وہاں۔“

”کیا کروں؟ درزن خالی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔“

وہ چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔

”اچھا جاؤ۔! میں جب تک برتن وصولیتی ہوں، پھر تم آکر کھانا بنالیا۔“

”ارے۔! نہیں اماں۔! آپ بیٹھیں آرام سے، میں آکر برتن بھی وصولوں گی۔ سن رہی ہیں ناں

آپ؟“

”ہاں ہاں۔! جاؤ۔!۔!“

”بس۔! میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔“

وہ کپڑوں کا شاپر اٹھا کر تیزی سے نکلی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیما کے ذور زور سے پکارنے، حنا بھاگی آئی تھی۔

”کیا ہے آیا۔؟ کیوں اتنا شور مچا رہی ہو۔؟“

”تم کہاں تھیں؟ کب سے پکار رہی ہوں۔“

سیما نے چڑ کر پوچھا۔

”یکن میں تھی۔“

حنا بھی محل کر بولی تھی۔

”بس آیا۔! اب آپ اٹھ جائیں۔ آپ کا یہ ڈرامہ زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے۔“

”ارے۔! اصل ڈرامہ تو اب شروع ہوگا۔ یہ ڈھونگ تو میں نے اس لئے رچا یا تھا کہ فوری طور پر سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟“

سیما کی آنکھیں اسے کسی بلان پر چپکنے لگی تھیں۔

”اچھا۔! اب کیا سمجھ میں آیا ہے۔؟“

حنا فوراً اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا کرنے کا ارادہ ہے۔؟“

”ابھی تو میری بہن، اوہی کرنا پڑے گا جو دانیال چاہ رہا ہے۔“

سیما نے کہا تو حنا اچھل پڑی۔

”کیا مطلب۔؟ یعنی آپ دانیال کا پرنسزل لے کر جائیں گی۔؟“

”ہوں۔! جانا تو پڑے گا۔“

سیما پڑ سوچ انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر حنا کو دیکھ کر بولی۔

”کمال بھی ساتھ جانے کو تیار ہیں۔! صبح آفس جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ جلدی آ جاؤں گا، پھر خوب

صاحب کے ہاں چلیں گے۔“

”پھر تو آیا.....! آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔“

حنایا یس ہو گئی، پھر کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے مجھے اماں کی بات مان لینی چاہئے۔“

”کون سی بات.....؟“

یسائے چونک کر پوچھا تھا۔

”وہ..... میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا، بدر صاحب کی بیگم میرے لئے آئی تھیں، اپنے بیٹے کا رشتہ لے

کر.....؟ اماں نے ابھی تک انہیں جواب نہیں دیا۔“

حنائے یاد دلاتے ہوئے بتایا تو سہا سمجھلا کر بولی۔

”کیوں.....؟ کیوں لڑکا کر رکھا ہوا ہے اماں نے انہیں.....؟ لگتا ہے اماں کو مجھ پر بھروسہ نہیں

ہے.....؟“

”بھروسے کی بات نہیں ہے آپ.....! جو بات آپ کے اختیار میں ہی نہیں ہے۔“

حنائے جھوٹے ہنس بول رہی تھی کہ یسائے اس کی بات کاٹ دی۔

”سب اختیار میں ہے میرے۔ جان مارتی ہوں میں اس گھر کے لئے، پھر میری مرضی کے خلاف یہاں

کیسے کچھ ہو سکتا ہے.....؟ اور اگر کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، یہ تم بھی دیکھنا.....!“

”آپ جذباتی ہو رہی ہیں آپ.....!“

حناروٹھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”جذباتی ہی تو نہیں ہو رہی۔ پوری پلاننگ سے چلوں گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لالچی بھی نہ نوٹے۔“

یسامی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ حنار دیکھتی ہی دیکھتی گر جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ جہانزیب کی والدہ ایک روز پانی بیٹیوں کے ساتھ آ کر اسے انگوٹھی پہنا گئی تھیں اور اس سے اگلے روز گھر کے افراد سی سادی سے جہانزیب کے گھر پر دم ادا کر آئے۔

”جگ جانے.....! جہانزیب بھائی اتنے اچھے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

موقع ملتے ہی چنگی نے اسے جہانزیب کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

”بالکل افسانوی کرداروں جیسے لگتے ہیں۔ اتنا اونچا قد، خوب صورت آنکھیں، سلیپتے سے جے ہوئے

بال، اور باتیں اتنے دھمے لیجے میں کرتے ہیں کہ بندہ چپ چاپ سنتا جائے۔“

پھر لہجہ بھڑک کر بولی۔

”بس ایک خامی ہے۔“

”وہ..... وہ کیا.....؟“

وہ جو پوری توجہ سے سن رہی تھی، چونک کر پوچھنے لگی۔

”ڈرارنگ کالا ہے۔“

”کیا.....؟“

اس کے منہ سے بے ساختہ جھج نکلی گئی۔

”زیادہ کالا نہیں ہے، سا نولا کہہ سکتی ہو۔“

اس کے چپٹے پرچنگی نے فوراً کہا، پھر شرارت سے آنکھیں نیچا کر بولی۔

”اچھا ہوا میں نے تمہیں بتا دیا، ورنہ اگر تم انہیں دیکھ کر اس طرح چپٹیں تو بیچارے کتنے ہرٹ ہوتے۔“

”حکومت.....!“

وہ اپنی فحالت مٹانے کو اس پرچنگی نے فوری طور پر دوا نہ کرتے ہوئے گنگنانا شروع کر دیا۔

”او..... کالا شاہ کالا

میرا کالا اے دلدار

تے گوریاں نوں پراں کرو۔“

”کیا بکواس ہے۔“

اس نے چنگی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر عرب سے پوچھنے لگی۔

”جگ جگ بتاؤ، کیا واقعی ان کا رنگ کالا ہے.....؟“

”گورا ہوا یا کالا، اب کیا ہو سکتا ہے.....؟ اب تو بات چکی ہو گئی ہے۔“

چنگی کا انداز اب بھی چھیڑنے والا تھا۔

”جی نہیں.....! میں کسی کالے ولا لے سے شادی نہیں کروں گی۔“

”نہیں جانے.....! ایسی بات مت کرو۔“

چنگی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”جہانزیب بھائی بہت اچھے ہیں، ان کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔ ویسے ہی میں تم سے مذاق کر رہی

تھی۔ ان کا رنگ اتنا کالا نہیں ہے، اور میں سمجھتی ہوں کہ کالا رنگ برائیاں ہوتا۔ بس بندے کا دل کالا نہ ہو، باقی سب

خیر ہے۔“

اس نے چنگی کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ جانے کیا سمجھی کہنے لگی۔

”بتا ہے، جب ہم ان کے گھر جا رہے تھے تو تمام راستہ میں یہی سوچتی رہی کہ پتا نہیں جہانزیب بھائی



کیسے ہوں گے.....؟ ان سے ملنے ہی سارے خدشے زور ہو گئے۔ تم جب انہیں دیکھو گی تو اپنی قسمت پر رشک کرو گی۔“

”تم ان کی تصویر لے آئیں۔“

وہ ناخوش سے کھینٹتے ہوئے ہٹا کر سرسری انداز میں بولی۔

”میں نے کہا تھا ان سے۔ کہنے لگے، تمہیں نہیں دوں گا، اور جسے چاہئے وہ خود مانگے۔ ان کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔“

وہ بے اختیار اپنی طرف اشارہ کر گئی۔

”یعنی میں مانگوں.....؟“

”ہاں۔“

”جی نہیں! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

چٹکی کے سامنے اس نے اپنے آپ کو خاصا ریزہ روڑ کیا، لیکن اس کے اندر ایک ہلچل بچ چکی تھی کہ جس شخص کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں جکھا رہا ہے، وہ انجانا نہیں رہا۔ پھر شاؤدی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے کی قائل تو وہ پہلے سے تھی۔ اب چٹکی کی تعریفوں نے اس کے اندر مزید اشتیاق پیدا کر دیا تھا۔ جب ہی وہ اگلے کی دن تک انتظار کرتی رہی کہ شاید جہانزیب خود آ جائے، لیکن جب وہ نہیں آیا جب وہ بھابی کے مشورے پر غور کرنے لگی اور ابھی شش و پنج میں تھی کہ اس روز اس کی کو لیگ مس صائمہ اس سے کہنے لگیں۔

”سنو! ذرا میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں.....؟“

”بس، یہیں اگلے اسٹاپ تک بینک جانا ہے۔“

”کیا.....؟“

وہ یوں چونکی جیسے چوری چکری ہو گئی ہو۔

”کمال ہے تم تو یوں اُچھلی ہو جیسے میں نے کوسوں دور جانے کی بات کی ہو۔“

”نہن! نہیں.....؟ وہ تجھی ہی ہوئی۔“

”میرا مطلب ہے، وہاں کیا کام ہے تمہیں.....؟“

”بینک میں کیا کام ہوتا ہے.....؟“

اس نے اُلٹا ٹوکا۔

”ہائیم.....؟“

وہ گھڑی دیکھنے لگی۔

”ابھی کچھ وقت ہے، جلدی چلو ورنہ بینک بند ہو جائے گا۔“

صائمہ نے کہا تو وہ دھڑکنے والے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑی گو کہ اس کی طرح جہانزیب بھی اس کا صورت آشنا نہیں تھا، پھر بھی اسے پہچان لئے جانے کا دھڑکا لگا رہا۔

وہ صائمہ کے ساتھ بینک میں داخل ہوئی تو اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ پہلے اپنے آپ کو صائمہ کے ہچے چھپانے کی کوشش کی، لیکن پھر منو چاہا جب یہاں تک آئی گئی تو جہانزیب کو بھی دیکھ لینا چاہئے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے سب سے الگ رکھی بیچر کی ٹیبل کی طرف دیکھا۔ اسی وقت صائمہ کا دستہ کی طرف بڑھی اور وہ بے ہالی میں چلتی ہوئی اس ٹیبل تک آ گئی۔

”جی فرمائیے.....!“

وہ چونکی بھی تھا، اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”جہانزیب صاحب ہیں.....؟“

وہ دل میں جس نام کو ذرا ہراسی تھی، زبان پر آ گیا اور غالباً وہ اس وقت شرارت پر آمادہ تھا کہ سینے پر ہاتھ لگا کر بولا۔

”جی.....! میں جہانزیب ہوں۔“

”آ..... آپ.....؟“

”آپ“ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ نیم دا ہوئے۔

”فرمائیے.....! کیا کام ہے مجھ سے.....؟“

وہ اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

”کک کچھ نہیں.....!“

غیر ارادی طور پر اس کا ایک قدم پیچھے کی طرف اٹھا۔

”پلیزز.....!“

اس نے پیٹنے کا اشارہ کیا جسے نظر انداز کر کے وہ فوراً پلٹ آئی۔ صائمہ ابھی وہیں کھڑی تھی، اس نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس نے اسے جہانزیب سے بات کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا، پھر جیسے ہی صائمہ فارغ ہوئی، وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

وہ بڑی سرشاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اچانک ایک نیا احساس ملا تھا کہ دھڑکنیں انداز ہی بدل گئی تھیں۔ اس کا دل چاہا وہ یوں ہی بے سبب کھٹکھٹا کر بیٹھے، لیکن چھوٹے بھیا کو می سے اُٹھتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر براہمت چل رہی تھی، وہ بھی مدوم ہو گئی۔

”کیا بات ہے.....؟“

اس نے یوں ہی پوچھ لیا اور چھوٹے بھیا جو اس کی آمد پر ڈر اور پرکھا خاموش ہوئے تھے، پھر شروع ہو گئے۔  
ای سے کہنے لگے۔

”اصل میں آپ لوگ چاہتے ہیں نہیں کہ میں کچھ کروں۔ ابوبی ابھی تک مجھے بچی سمجھتے ہیں، حالانکہ میری عمر میں آپ لوگ بڑے بھیا کی شادی کر چکے تھے۔“

”ظاہر ہے، وہ اپنے بیروں پر کھڑا ہو چکا تھا، پھر کیوں نہ کرتے اس کی شادی؟ تم بھی کمانے لگو تو۔۔۔“

”آپ لوگ کمانے دیں تب ناں۔۔۔!“

وہ امی کی بات کاٹ کر بولے۔

”منع کیا ہے ہم نے؟“

”اور کیسے منع کیا جاتا ہے۔؟ میں نے جاپان جانے کے لئے ابوبی سے بات کی۔“

وہ اپنی مجبوریوں سے ہنسنے لگے۔

”تو تم کسی اولاد ہو جو تمہیں خود سے باپ کی مجبوریوں کا احساس نہیں۔؟ اور حرجانیہ کی بات طے ہو گئی ہے، اس کی شادی کریں یا تمہیں پیسہ دیں۔؟“

”جانیہ کی شادی دو سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ بڑے آرام سے بولے۔

”نہیں۔۔۔! جہاز زیب کے گھر والے ابھی بھی اتنا عرصہ انتظار نہیں کریں گے۔ اتنی مشکل سے ایک سال کا وقت دیا ہے انہوں نے۔“

”تو آپ منع کر دیں انہیں، ہمیں اس سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔“

”کیا۔۔۔؟“

ای کتنی دیر تک تاسف سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”کچھ شرم کرو تا قب۔۔۔! اب جبکہ سب کو خبر ہو گئی ہے، تو تم کہتے ہو رشتہ ہی ختم کر دیں۔؟ میں کتنی ہوں، اگر بوڑھے باپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تو اس کے مسائل میں اضافہ بھی مت کرو، اور نہ، آج کے بعد اگر تم نے ایسی کوئی غلط بات منہ سے نکالی تو۔۔۔“

”امی۔۔۔!“

اس نے بڑھ کر امی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”بس۔۔۔! آپ خاموش ہو جائیں، اور چھوٹے بھیا۔۔۔! آپ امی کے سامنے کیوں جھکا رہے ہیں۔؟ یہ ساری باتیں ابوبی سے کریں۔“

”ان سے بھی کرلوں گا، ڈرنا نہیں ہوں کسی سے۔“

چھوٹے بھیا کہتے جھکتے چلے گئے تو وہ امی کے سامنے آ بیٹھی۔

”پتا نہیں یہ لڑکا کب مدھرے گا۔؟ اتنی عمر ہو گئی ہے، لیکن۔۔۔“

”چھوڑیں امی۔۔۔! جب انہیں خود اپنا کڑی عمر کا احساس نہیں ہے تو آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔؟“

”میں پریشان نہیں ہوں گی تو اور کون ہوگا۔؟ اتنی فکر تو مجھے تم دونوں بہنوں کی نہیں ہے، جتنی اس کی ہے۔“

”کہتے کیا ہیں وہ۔۔۔؟“

”جاپان جاؤں گا، پتا نہیں کس نے دماغ میں ڈال دیا ہے کہ پچھلے ایک مہینے سے مسلسل ہی رٹ لگا رہا ہے۔“

”تو جانے دیجئے۔“

بنا سوچے اس کے منہ سے نکل گیا۔

”لو۔۔۔ تم بھی یہی کہہ رہی ہو۔؟ کہاں سے لا کر دیں اسے بارہ لاکھ۔۔۔؟“

”میرا مطلب ہے، ان سے کہیں، پہلے یہیں کہا کر اتنا پیسہ جمع کریں پھر چلے جائیں۔ آپ کو کیوں تنگ کر رہے ہیں۔۔۔؟“

پھر موضوع بدلنے کی خاطر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”چکی نہیں آئی ابھی۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! اور آج تو کہہ کر لگی تھی کہ دیر سے آئے گی، شاید پریکٹیکل ہو رہے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔!“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، اپنی چادر تہہ کے الماری میں رکھی، پھر پوچھنے لگی۔

”روٹی پکانی ہے ابھی۔؟“

”نہیں۔۔۔! میں پکا چکی ہوں۔“

”لے آؤں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، تم کھانا چاہو تو کھاؤ۔“

”نہیں۔۔۔! چکی آ جائے تو پھر ساڑھ ہی کھاں لیں گے۔“

اس نے کہا اور منہ ہاتھ دھوئے کی غرض سے کمرے سے نکل آئی۔ پھر جب وہ منہ ہاتھ دھو کر آ رہی تھی تو

ای وہی چکی بھی آ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ اندر جانے کی بجائے بہن میں آ کر کھانا ٹالنے لگی۔ وہ جانتی تھی جب تک

وہ دھاڑا تھا۔

”خبردار جو مجھے بھائی کہا تو، نکاح ٹوٹ جائے گا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اسد بھائی.....“

”ہیں.....!“

اسد نے دار تک کے انداز میں اُنکی اُٹھا کر دائیں بائیں بلائی۔

”کہہ دیا ناں.....! بھائی نہیں.....!“

”مجھے جانے دیں.....!“

اس نے یہ کہہ کر قدم بڑھا دیے تو وہ پھر سامنے آگیا۔

”جانے دیں ناں.....! اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“

وہ روہا ہٹی ہوئی۔

”ہائے.....! اماں کے انتظار کا بڑا احساس ہے، اور جو میں یہاں دھوپ میں جلتا ہوں، وہ کسی کھاتے

میں نہیں.....؟“

وہ سینے پر ہاتھ مار کر یولا تھا۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

وہ اس کی سائیڈ سے نکل کر تفریبا بھاگ پڑی تھی اور پھر گھر میں داخل ہوتے ہی چٹانے لگی تھی۔

”اماں.....! اماں.....!“

”کیا ہو گیا ہے.....؟“

اماں یوں کھلا کر کمرے سے نکلیں تو وہ ایک دم ان کے سینے سے لگ گئی۔

”سمجھالیں اماں.....! اے، میں رابعہ کی وجہ سے چپ رہتی ہوں۔“

”ہائیں.....؟ یہ کیا کہہ رہی ہو.....؟“

اماں اسے خود سے الگ کر کے پوچھنے لگیں۔

”کس کی بات کر رہی ہو.....؟ کسے سمجھاؤ.....؟“

”میں رابعہ کے دیوارسد کی بات کر رہی ہوں۔ جب بھی میں گھر سے نکلتی ہوں، راستے میں آجاتا ہے۔“

اس نے بتایا تو اماں اس سے زیادہ پریشان ہو گئیں۔

”ہیں.....؟ یہ کب سے ہو رہا ہے.....؟ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا.....؟“

”پہلے بتاتی تو کیا کرتیں آپ.....؟ میرا ہی گھر سے ٹھکانا بند کر دیتیں۔“

اس نے ناراضگی سے کہا تو اماں فوراً بولی تھیں۔

چھوٹے بھیا کھانا نہیں کھائیں گے، امی بھی نہیں کھائیں گی۔ اس لئے پہلے چھوٹے بھیا کو ان کے کمرے میں کھانا دے آئی، پھر لاکر امی کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”میں چھوٹے بھیا کو کھانا دے آئی ہوں، اب آپ بھی کھالیں۔“

امی نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا، پھر اسی خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔

☆☆☆☆

اس نے درزن کے ہاں ہی دیکھتے تھے کہ اماں نے کون سے کپڑے سٹنے کے لئے بھیجے ہیں۔ وہ جو اس کے جینز کے لئے جمع کر رہی تھیں، ان ہی میں سے دو جوڑے تھے، جس سے وہ مزید پریشان ہوئی تھی، اور یہ سوچتے ہوئے کہ گھر جاتی ہے رابعہ کو فون کرے گی، وہ تیز قدم اُٹھا رہی تھی کہ اچانک رابعہ کے دیوارسد نے سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا۔

”کہاں جا رہی ہو.....؟“

”جی.....؟“

وہ اسد کو دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔ تھوک نچتے ہوئے بمشکل بولی تھی۔

”کھانا کھو.....!“

”کھانا کھو.....؟“

وہ موزا نا انداز میں ہنسا، پھر گانے لگا۔

”میں نے تمہاری کھانا کھوے

کبھی پانی پیا تھا

پیا سا تھا میں

یا کرو.....!“

”اُف.....!“

وہ جھکی نظروں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

”بڑی آزادی دے رکھی ہے تمہارے اماں باواؤں نے نہیں.....؟ انکی نکل پڑتی ہو گھر سے.....؟ پتا نہیں

ہے، زمانہ کتنا خراب ہے۔ چلو میں تمہیں گھر پہنچا دوں، بحفاظت.....!“

اس کی آفر پر وہ بے اختیار پیچھے ہٹ کر بولی تھی۔

”نہیں.....! میں چلی جاؤں گی اسد بھائی.....!“

”بھائی.....؟“

”ہاں.....! تو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے کھرے ٹکڑے کی۔“  
 ”کیوں ضرورت نہیں ہے.....؟ ابھی بھی میں کہیں گھومنے نہیں نکلی تھی۔ درزن خالہ کے ہاں کام سے گئی تھی، اور بھی ایسے کتنے کام ہوتے ہیں۔ کون کرے گا.....؟“  
 ”کوئی بھی کرے گا، تم کھرے نہیں نکلو گی۔“

اماں نے فیصلہ نہ دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی اماں.....؟“

اس نے احتجاج کیا۔

”اسکو سمجھانے والا کوئی نہیں ہے کیا.....؟ آپ جا کر رابعہ کی ساس سے بات کریں۔“

”جینا.....! رابعہ کی ساس سے بات کرنے کا مطلب تم جانتی ہو۔ آنا، میں اترام دیں گی۔ پھر رابعہ کو

الگ پریشان کریں گی۔“

اماں نے نرم پز کر سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو ایسا کب تک ہوتا رہے گا.....؟ رابعہ کی ساس کے ڈر سے ہم جینا ہی چھوڑ دیں.....؟ ہوا بنا لیا ہے

آپ نے اس عورت کو۔“

وہ غصے سے پیر پختی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیما بظاہر بہت خوشی سے تیار ہو گئی تھی اور چوں کو دانیال کے حوالے کر کے کمرے میں آئی تو کمال حسن کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر غصے کر کہنے لگی۔

”آپ نے تو عورتوں کو مات دے دی۔ کتنا وقت لیتے ہیں آپ تیاری میں۔ گھنٹے بھر سے آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔ کیا ضرورت ہے خود کو اتنا تیار کرنے کی.....؟“

”جیلس ہو رہی ہو۔“

کمال حسن اس کی طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

”اصل تم سے بے برداشت نہیں ہوتا کہ میں شادی کے اتنے عرصے بعد بھی پہلے جیسا بینڈم اور ایئر کینو

ہوں۔ ہاں.....! البتہ تم پھر کے اثرات نظر آنے لگے ہیں۔“

”اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹو۔“

سیما استہزاء سے ہنسی بھری تھی۔

”چلو.....! تو کسی اور سے پوچھ لیتے ہیں۔“

”بس کر دیں.....!“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”اب چلیں.....! شام تو آپ نے ہمیں کر دی ہے۔“

”لو.....! میں تو کب سے تیار کھڑا ہوں، اور ہاں.....! کچھ لے کر نہیں جاؤ گی، میرا مطلب ہے مٹھائی

و غیرہ.....؟“

کمال حسن نے چلنے پر آمادہ ہو کر پوچھا۔

”ابھی کیوں.....؟ ابھی تو ہم رشتہ لے کر جا رہے ہیں، آگے پتا نہیں وہ لوگ کیا جواب دیتے

؟“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب وہاں آ کر سمجھاؤں گی۔ اب چلیں پلیز.....!“

وہ یہ کہہ کر چلی گئی کمال حسن نے اس کا بازو تھام لیا۔

”سیما.....! آئی انم پراؤ ڈ آف یو۔“ تم نے جس طرح دانیال کا ایک ماں کی طرح خیال رکھا ہے،

اس لئے ہم دونوں بھائی تمہارے بہت مشکور ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ دانیال کا خیال میں نہ رکھتی تو اور کون رکھتا.....؟ اماں، ابھی چارے تو

اہال کو بڑا آدمی بننے دیکھنے کی حسرت لئے چلے گئے۔“

وہ قوی طور پر مغلوب ہو گئی تھی۔

”پھر بھی آج ان کی رودہن بہت خوش ہوں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں خوش ہو رہا ہوں، دانیال خوش

ہو اور ہماری خوشیوں کا سہرا تمہارے سر ہے سیما.....!“

کمال حسن دل سے اسے سہرا رہے تھے۔

”میں سوچتا ہوں سیما.....! اگر تم دانیال کے ساتھ روایتی بھائیوں والا سلوک کرتی تو ہم دونوں بھائی

نہ انہز ہو جاتے۔“

”افوہ.....! یہ باتیں آپ وہاں آ کر بھی کر سکتے ہیں۔ چلیں.....! دیر ہو رہی ہے۔“

وہ گھبراہٹ سے چلی۔ کمال حسن کا بازو تھام کر فوراً چل پڑی۔

راستے میں کمال حسن نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں بالکل اتاری ہیں۔ لہذا وہی بات

کی، اور وہ کب تک ٹائیپ جائے کے ساتھ دوسرے لوازمات نہیں پرکھ رہی تھی تو بغور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

اس لئے اسے جیسا ہی اماں سے پوچھنے لگی۔

”بس یہی ایک بیٹی ہے آپ کی.....؟“

”نہیں! بڑی راجہ ماشاء اللہ اپنے گھر کی ہے۔ ابھی دو سال ہوئے ہیں اس کی شادی کو، ایک بٹا ہے اس کا ماشاء اللہ!“

امان نے بتایا تو وہ ایک نظر کمال حسن کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”اچھا! ماشاء اللہ! ہم آپ کی بیٹی ثانیہ کے لئے آئے ہیں۔“

”جی؟“

امان بے اختیار خواجہ صاحب کو دیکھنے لگیں۔

”جی! میں اپنے پورا دنیا کی بات کر رہی ہوں۔“

وہ فوراً بولی۔ پھر خواجہ صاحب سے پوچھنے لگی۔

”آپ نے تو دیکھا ہوگا دنیا کی کو؟“

”جی جی! بالکل دیکھا ہے، بلکہ ملاقات بھی ہوئی ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو وہ جیسے ریلیکس ہو کر بولی تھی۔

”پھر تو مجھے دنیا کیل کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جی ہاں! دنیا کیل سے اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ! لکھا ہوا بااخلاق لڑکا ہے۔ پھر بھی آپ برا

نہ مانیں تو ہم کچھ وقت لینا چاہیں گے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو سیماندر سے مطمئن ہو کر بولی تھی۔

”بالکل بالکل! وقت لیں آپ، یہ آپ کا حق ہے۔“

”شکریہ! آپ کچھ لیں ناں!“

خواجہ صاحب نے کہتے ہوئے بیگم کو اشارہ کیا تو انہوں نے فوراً سوسوں کی پلیٹ اٹھا کر سیماندر کے آگے کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑی بے قراری سے سیماندر کمال حسن کی واپسی کا منتظر تھا۔ جاتے ہوئے سیماندر تو اسے یقین دلا گیا تھا کہ وہ خواجہ صاحب سے ہائی ہوا کر رہی آئے گی، اور اتنا تو اسے بھی یقین تھا کہ خواجہ صاحب اسے ناپسند نہیں کرتے۔ پھر بھی اس سے یہ وقت گزارنا دو بھر ہو رہا تھا۔ نتیجتاً جتنی کی دلچسپی باتوں اور شرارتوں سے بھی اب وہ نہیں بہل رہا تھا۔ کبھی گھڑی دیکھتا، کبھی دروازے پر نظریں جم جاتیں۔ پھر جب سیماندر کمال حسن آئے تو وہ بے قراری سے سیماندر کو دیکھنے لگا۔

”بچوں نے جنہیں شک تو نہیں کیا۔؟“

سیماندر نے پوچھا تو اس نے کمال حسن کو اپنے کمرے میں جاتے دیکھا، پھر ایک ہی جھٹ میں بڑھ کر سیماندر کو کندھوں سے قدام لیا۔

”آپ بتائیں وہاں کیا ہوا؟“

”ارے! اتنی بے قراری؟ سانس تو لینے دو۔۔۔!“

سیماندر نے پیچھے صوفہ دیکھ کر کھڑے ہو گئی۔

”ادھر میری سانس لڑی ہوئی ہیں۔“

”پلیز میری ادھی بھائی! بتائیں ناں! خواجہ صاحب نے برا تو نہیں مانا۔؟“

اس نے سیماندر کے قریب کھنکھانے لگا دیئے۔

”لو! ابرا کیوں مانیں گے؟ جہاں میری ہوتی ہے، وہاں پھر تو آتے ہی ہیں، اور تمہارے جیسا

انہیں کہاں لے گا؟ خوش ہو گئے تھے خواجہ صاحب اور ان کی بیگم بھی۔ لیکن۔۔۔“

سیماندر اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر چاکا چاکا اے ہوا دیا تھا۔

”کیا لیکن۔؟“

”پتا نہیں کیوں سوچنے کا وقت مانگا ہے؟ حیرت ہے تمہارے رشتے کے لئے سوچنا کیا؟ ہو سکتا ہے خواجہ صاحب نے اپنی بیٹی کے لئے کچھ اور سوچ رکھا ہو۔؟“

سیماندر نے ہوتے انداز میں بول رہی تھی۔ وہ ایک تک اس کا چہرہ دیکھ گیا۔

”خیر! انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں ناں!“

سیماندر نے انہیں سے اسے دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

”چلو جاؤ! اے لگے ہو کر سو جاؤ!“

”پہلے یہ بتائیں، پھر کب جائیں گی؟“

اس نے پوچھا تو سیماندر نے مارنے کو ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”بتاؤں جنہیں کب جاؤں گی۔؟“

وہ ایک دم چپ ہو گیا، پھر سہمے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے ٹائی کو فون کیا

”کیسے تھے جنہیں میرے بھائی اور بھائی؟“

اس نے چھوٹی سی پوچھا تو ٹائی نے حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔

”کیسے تھے؟ یہ کیسا سوال ہے دنیا کی! جب آپ اچھے ہیں تو آپ کے بھائی بھی اچھے ہی

تھے۔۔۔“

”اور بھائی؟ یہاں کسی گلیں نہیں؟“

وہ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

”وہ بھی بہت اچھی ہیں، اور کچھ؟“

ٹائیٹھی تھی۔

”اور یہ کہ تمہارے گھر والوں کو میری فیملی پسند آئی کہ نہیں؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا، کیونکہ میرے سامنے اماں، ابا نے کوئی ذکر نہیں کیا۔“

وہ صاف گئی سے بولی تھی۔

”لیکن تم ان کے چہروں سے اندازہ تو لگا سکتی ہو کہ وہ میرے پر پوزل پر خوش ہیں یا ناخوش؟“

اس کی تفسیر نہیں ہو رہی تھی۔

”کبھی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ مجھے تو اماں، ابا کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔“

ٹائیٹھ نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اچھا!“

”آپ کوئی اور بات کریں ناں!“

وہ مزہ ہو کر بولی تھی۔

”اور بات یہ کہ میں ابھی سے یہ سوچنے لگا ہوں کہ جب تم اس گھر میں آ جاؤ گی تو۔۔۔“

وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ ادھر سے ٹائیٹھ نے گھرا کر فون دیا تھا اور وہ نہ دیکھ کر بھی جیسے اسے ہی

دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمائی دل میں آتری جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اسکول جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ امی دے پاؤں اس کے کمرے میں آئیں اور اسے مخاطب کر

کہے آہستہ آواز میں کہنے لگیں۔

”سنو! یہ پیسے رکھ لو اور اسکول کے بعد وہیں سے بازار چلی جانا۔ دو تین اچھے سوٹ لے لینا، جینز

میں رکھنے کے لئے۔“

وہ ایک نظر پیسوں پر ڈال کر بولی۔

”اسکول سے کیوں جاؤں؟ شام میں آپ کے ساتھ۔۔۔“

”نہیں!“

امی نے فوراً ٹوکا۔

”میں نہیں جا سکتی۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ آج کل تمہارے چھوٹے بھیا اس چکر میں ہیں کہ گھر میں جو پیسہ ہے، اسے دے دیں اور

میں مسلسل اس سے یہی کہہ رہی ہوں کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ اب اگر اس نے مجھے بازار جاتے دیکھ لیا تو

ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ تم بھی بہت چچا کرانا، اس کی نظر نہ پڑے۔“

پھر خود کھامی کے انداز میں کہنے لگیں۔

”میں چاہتی ہوں، پکڑوں اور کرکری میں جو کی بیشی ہے، وہ اسی طرح آہستہ آہستہ پوری کر دوں

تاکہ تمہارے ابو جی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔“

اس نے اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کیا اور نظریں چرا کر بیک میں پیسے رکھنے لگی۔

”ٹائیٹھ تیار ہے کر کے جانا۔“

امی کہتی ہوئی چلی گئیں تو کچھ دیر بعد وہ بھی کمرے سے نکل آئی۔

اسکول سے بازار جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر ہی اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی اشیاء کے لئے

وہ اور صائمہ اسکول کے بعد وہیں سے بازار چلی جایا کرتی تھیں۔ آج بھی اس کا خیال تھا کہ وہ صائمہ کو ساتھ لے

جائے گی، لیکن اتفاق سے صائمہ اسکول آئی ہی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا، یہ کام کل پر چھوڑ دے، لیکن پھر جانے

کیا خیال آیا کہ اس کی بی بی چلی گئی۔ اس کی خیریداری کا یہ پہلا تجربہ تھا، پھر بھی وہ اطمینان سے اور جلدی فارغ ہو گئی۔

کیونکہ بلا ضرورت وہ کہیں نہیں رہتی تھی۔ اپنے لئے روزمرہ کے استعمال کی کسی چیز کا خیال آیا بھی تو آئندہ پڑا لے

ہوئے لوگوں کی جھپٹ سے نکل آئی اور رد و کراس کرنا چاہتی تھی کہ نیلے رنگ کی گاڑی اس کے بالکل قریب آن رکی۔

وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور کچھ فاصلے سے گاڑی کے اندر نظر ڈالی تو جہاز زیب کو دیکھ کر فوراً سیدھی کھڑی ہو گئی اور وہ

گاڑی سے اتر کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

”کبھی ہیں آپ؟“

اس نے رکی جملے کو بھی خاص انداز دیا۔

”جی!“

وہ اس قدر کہہ سکی۔

”اس روز آپ اتنی جلدی چلی گئیں، مجھے لگا جیسے آپ صرف میرا نام پوچھنے آئی تھیں۔“

وہ کچھ نہیں بولی تو وہ اس کے پیچھے نظر دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اکیلی ہیں یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟“

”جی!“

وہ بے حد گہرا رہی تھی۔

”مگر کیا کیلی ہیں۔“

وہ سمجھ کر بولا۔

”چلے.....! میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“

”شکر ہے.....!“

”کس بات کا.....؟“

”میرا مطلب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“

وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پارہی تھی۔ غالباً یہ خیال حوصلہ بخش رہا تھا کہ قریب کھڑا اجنبی اور غیر نہیں ہے، گمان بھی نہیں تھا کہ جس کے لئے وہ دل میں اپنا تپتے محسوس کر رہی ہے، وہ تصور سے زیادہ اجنبی اور غیر ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ اگر اکیلی آ سکتی ہیں تو اکیلی جا بھی سکتی ہیں، لیکن اس طرح میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔“

”جی.....؟“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ ڈرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، اس روز کی طرح آئیں بھی اور چلی بھی نہیں۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

وہ جلدی سے بولی۔

”کوئی دیر نہیں ہو رہی۔ آئیے میرے ساتھ، اور جتنی دیر آپ بس کا انتظار کریں گی، اس سے پہلے میں آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔“

”لیکن..... لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“

”کیوں.....؟“

”اچھا نہیں لگتا۔“

”چلے تو پھر ایک کپ چائے.....؟“

اس نے سامنے کیلئے کی طرف اشارہ کیا، پھر بہت اصرار سے اسے لے آیا اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے جہاں وہ اندری اندر رڑ رہی تھی، وہاں اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

وہ جانے کا آ رڑو دینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا تو اس نے چمک کر دیکھا۔ پھر تعجب سے

بولی۔

”کیا آپ میرا نام نہیں جانتے.....؟“

اور وہ یقیناً شاطر تھا، فوراً جان گیا کہ وہ اس پر کسی اپنے کا گمان کر کے دھوکہ کھا رہی ہے اور وہ دھوکہ دینے میں ماسٹر تھا، سنبھل کر دینشن مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں آپ کے منہ سے سنا چاہتا ہوں۔“

”جانیہ.....!“

”جانیہ جہاز زیب.....!“

اس نے غالباً ان دو ناموں کو ڈھرا کر ذہن نشین کیا۔ وہ کچھ اور کچھ کر گھلا بی ہوئی اور وہ جو اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، الجھ بھر کو حیران رہ گیا۔

”چائے لیجئے.....!“

وہ اس کی نظروں سے گھرا کر بول پڑی۔

”ہاں.....!“

اس نے کپ اپنی طرف کھینچا، پھر پوچھنے لگا۔

”اور کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے.....؟“

آدھا دن تو اسکول میں ہی گزر جاتا ہے، اس کے بعد بس گھر کے کام۔“

وہ سادگی سے بتانے لگی۔

”پہلی کے امتحان قریب ہیں، اس لئے کہیں لکھنا بھی نہیں ہوتا، ورنہ کسی کسی دن کہیں اور نہیں تو ہم دونوں بڑے بھیا کے گھر تو طے ہی جاتے ہیں۔“

”میں مگر یہ لی سکتا ہوں۔“

وہ جیب سے پکٹ نکال کر اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”بھئی تو بتا رہی تھی، آپ مگر یہ نہیں پیتے۔“

”بس..... ابھی کبھی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے پکٹ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

”میں نے منع تو نہیں کیا۔“

”منع تو نہیں کیا، لیکن اگر آپ نے بھئی کو بتا دیا تو وہ مجھے جھوٹا سمجھے گی۔“

”میں اسے نہیں بتاؤں گی۔“

”اچھا.....!“

وہ ذرا سا ہنسا، پھر سرگرم نکال کر سلاگنے لگا۔ اس دوران وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور جب اس نے سر اٹھایا تو کھڑی دیکھ کر بولی۔

”اب میں چلوں گی۔“

”پھر کب ملیں؟“

وہ فوراً پوچھنے لگا۔

”چاہئیں!“

”نالے والی بات مت کرو جانیہ! میں بار بار تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ لمبے میں بے قراری سمو کر بولا۔

”لیکن میں بار بار گھر سے نہیں نکل سکتی۔“

وہ متاثر ہو کر عاجزی سے بولی۔

”تو اپنا ٹیلی فون نمبر دے دو۔“

”آپ کو نمبر یاد نہیں ہے؟“

وہ پھر متوجہ ہوئی۔

اس معاملے میں میرا حافظہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ لو..... اس پر نمبر دے دو۔“

اس نے ڈائری اس کے سامنے رکھی اور جب سے پتہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادیا تو وہ نمبر لکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ! میں مل پے کر دوں۔“

اس نے ویڈیو بلا کر مل پے کیا، پھر اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے بعد جب تک وہ بس میں سوار نہ ہوگی، تب تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اماں بظاہر سوچوں میں گم، لیکن انتظار میں بیٹھی تھیں کہ خواجہ صاحب، ثانیہ کے لئے آنے والے دانیال کے رشتے کے بارے میں کچھ کہیں گے، اور خواجہ صاحب بھی اسی بیچ پر سوچ رہے تھے، پھر پوچھنے لگے۔

”ہاں تو بیگم! کیا کہتی ہو تم؟“

”کس بارے میں؟“

اماں چونک کر نہیں دیکھنے لگیں۔

”ارے بیٹی! یہ جو دانیال کے بھائی بھانج آئے تھے، اس کا رشتہ نہ کر!“

خواجہ صاحب نے کہا تو اماں نے مجھے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

”میاں! مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں، آپ کی زیادہ ملاقات ہے دانیال سے۔ میں نے تو بس دو

تین بار ہی دیکھا ہے اسے۔“

”ہوں!“

خواجہ صاحب پڑ سوچ انداز میں سر ہلا کر گویا ہوئے۔

”لا کا تو اچھا ہے، پڑھا لکھا ہے۔ میرے خیال میں تو ثانیہ کے لئے بہت مناسب ہے۔“

”اگر آپ کو مناسب لگ رہا ہے تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

اماں جیسے پہلے سے رضامند نہ تھیں۔

”پھر بھی بیگم! پہلے ثانیہ کی مرضی معلوم کر لو۔ اس کے بعد پھر دانیال کے بھائی بھانج کو کھانے پر

بلائیں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے! لیکن اس سے پہلے آپ کو رابعہ اور اس کے میاں عباد کو بتانا چاہئے۔ ورنہ رابعہ کے

لئے نفی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ میاں کے ساتھ ساس بھی طعنے مارے گی کہ سیکے والوں نے اسے کچھ سمجھای

نہیں۔“

اماں، رابعہ کی ساس سے کچھ زیادہ ہی خائف تھیں۔

”ہاں! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ پہلے داماد صاحب سے مشورہ کرنا چاہئے۔ خیر! تم کل رابعہ

کو فون کر دیتا۔“

خواجہ صاحب یہ ڈمداہری بیگم پر ڈال کر لیت گئے۔

”فون پر بتانا ٹھیک نہیں ہے، میں خود چلی جاؤں گی۔“

اماں نے کہا۔ خواجہ صاحب نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی خاموش ہو رہیں۔ کیونکہ رابعہ کی ساس اور میاں

بھی جس بدلتی نظر کا مظاہرہ کرتے تھے، وہ برداشت کرنا خواجہ صاحب کی مجبوری تھی۔ بیٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ان

لوگوں کو کبھی منہ بھی نہ لگاتے۔

اور چ تو یہ ہے کہ اماں ہی رابعہ کی وجہ سے مجبور تھیں، ورنہ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ داماد سے مشورہ

کریں جو رہ بات میں کیڑے نکالنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی عادت سے واقف ہونے کے باوجود ناچار اماں کو جانا

پڑا، اور وہاں اپنے تئیں انہوں نے مجھداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ ثانیہ کا رشتہ طے کر رہی ہیں، اسی سلسلے میں

وہ جیسے کوئی نہ ہونے والی سسرال کی دعوت کر رہی ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے رابعہ اور عباد کو بھی آنے کی دعوت

دے ڈالی تھی۔ یعنی عباد کو ناگ لڑائے کا موقع نہ دے کر وہ بہت خوش واپس آئی تھیں۔

لیکن ان کی خوشی بس اسی دن تک تھی کہ اگلے دن ہی رابعہ کی ساس اپنے لوفر بنے اسد کا رشتہ لے کر



آگئیں، اور بعد ازاں کہ ہا ہی بھرا کر ہی جائیں گی۔ بھول ان کے انہوں نے تو بہت پہلے سے ٹانہ کو بہو بنانے کا سوچ رکھا تھا، اور وہ راہبہ سے کہہ بھی چکی تھیں جس مفید جھوٹ کو اماں جھٹا بھی نہیں سکیں اور بڑی مشکل سے انہیں یہ کہہ کر ٹالا تھا کہ وہ خوبہ صاحبہ بات کر کے ہی انہیں جواب دیں گی۔

اور اس شام خوبہ صاحبہ انتہائی غصے میں دھاڑے تھے۔

”ہرگز نہیں.....! وہ آوارہ نکما.....؟ بڑھیا کی ہمت کیسے ہوئی ٹانہ کا ہاتھ مانگنے کی؟ ابھی فون کر کے منع کر دواے۔“

”آرام سے میاں.....! آرام سے۔“

اماں انہیں راہبہ کا احساس دلانا چاہتی تھیں، لیکن خوبہ صاحبہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہوئے، اور خود ہی فون کر کے راہبہ کی ساس کو منع کر دیا۔ اماں ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

☆☆☆☆

وہ سارا دن بے حد پریشان رہی تھی کہ اگر ابانے راہبہ کی وجہ سے مجبور ہو کر اسد کے رشتے کی ہا ہی بھری تو وہ کیا کرے گی؟ لیکن ابانے ایک دم انکار کر کے جہاں اسے خوشی بخشی تھی، وہاں وہ راہبہ کے لئے پریشان ہو گئی تھی کہ جانے اس کی ساس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ اسے عباد بھائی پر بھی غصہ آ رہا تھا جو ہر جائز ناجائز میں بس اپنی اماں کی ہاں میں ہاں ملائے تھے۔ بیوی کی تو ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اس وقت وہ راہبہ کے حالات پر کڑھ رہی تھی کہ فون کی تیل پر ایک دم اچلی تھی۔ پھر بھاگ کر ریسور اٹھایا تھا کہ اندر سے اماں نکلا کر پوچھنے لگیں۔

”ٹانہ.....! کس کا فون ہے؟“

”میری بھیلی ہے اماں!“

اس نے جواب دے کر ریسور کان سے لگا لیا تو دانیال ہنس رہا تھا۔

”اماں کو بھیلی کا نام بھی بتا دو!“

”پوچھیں گی تو بتا دوں گی۔“

”اچھا.....! کیا نام بتاؤ گی؟“

دانیال نے غصہ ہو کر پوچھا تو وہ بے ساختہ بھلی تھی۔

”دانیہ!“

”اااا!“

دانیال کا تہقہ بھی بے ساختہ تھا۔ اس نے گھبرا کر افلاں کے کمرے کی طرف دیکھا، پھر آواز دبا کر کہنے

”آپ ہنس سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو پتا ہی نہیں ہے کہ آج مجھ پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔“

”ارے.....! کیا ہوا؟“

وہ ایک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

”بس.....! جانے دیں!“

اس نے کہا تو وہ بھند ہوا۔

”نہیں.....! پہلے بتاؤ.....! اب جانے بنا نہیں آئے گا۔“

”آپ مذاق تو نہیں اڑائیں گے؟“

وہ شش و پنج میں گھر کر بولی تھی۔

”مذاق کیوں اڑاؤں گا؟ تم بتاؤ.....!“

”وہ..... میری بہن کی ساس اپنے دوسرے بیٹے کا پر پوئل لے کر آگئی تھیں۔“

اس نے بتانا شروع کیا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

”پھر؟“

”پھر بس.....! ابانے انکار کر دیا۔“

”ٹھیک گاؤ.....! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ وہ گہری سانس کے ساتھ بولا پھر پوچھنے لگا۔

”اچھا.....! یہ بتاؤ.....! اکبیل رہی ہو.....؟“

”ابھی تو نہیں.....!“

”وجہ؟“

”وجہ بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی اماں آ رہی ہیں۔“

اس نے اماں کی چٹیل کی آواز سن کر ہی کہا تھا اور فوراً ریسور رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی تو کچھ دیر ہی اسے سوچ سکی، پھر دھیان راہبہ کی طرف چلا گیا تھا۔

☆☆☆☆

راہبہ جرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ساس بھول بیگم اور میاں عباد کے سامنے مجرم بنی کھڑی تھی۔ خوبہ صاحبہ انکار سن کر بھول بیگم بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ مزید راہبہ پر احسان نہاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”تم شکر کرو بہو.....! کہ میں نے اپنے اسد کے لئے پھر سے تمہارے گھر کا انتخاب کیا۔ ورنہ لوگ تو بس گھر سے ایک بنی لیتے ہیں، و دوبارہ اجہر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ کیوں عباد.....؟“

”بالکل بالکل!“

عباد نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”میرے اسد کے لئے کوئی کی نہیں ہے۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں میں ایک ہے۔“

”جی ائی.....! مگر وہ.....“

رابعہ منہ مٹا کر رہ گئی۔

”کیا وہ؟“ جہیں کوئی اعتراض ہے اس رشتے پر.....؟“

بتول نیکو دھاڑی تھیں۔

”نہیں ائی.....! میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ثناء یہ بھی لکھی.....“

رابعہ نے نہ کہہ کر بھی بتادیا کہ اسد میٹرک فیل ہے، جس پر بتول بیگم مزید تیز ہو کر بولیں۔

”پڑھائی لکھائی کا بہت ناز ہے تمہارے سینے والوں کو.....؟ ارے.....! پڑھائی کام نہیں آتی سرال

میں۔ پھر ہمیں کیا تم نے جاہل سمجھ کر کہا ہے.....؟“

”نہیں ائی.....! وہ اسد..... میرا مطلب ہے.....“

رابعہ بے بسی سے عباد کو دیکھنے لگی، لیکن وہ یوں بیٹھا جیسے اسے جاننا ہی نہ ہو۔

”میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میرے بیٹوں کو انوکھنا سکتی ہو، مجھے نہیں.....! دیکھ رہے ہو

عباد.....! کیسی زبان چلتی ہے تمہاری بیوی کی.....؟ ارے.....! احسان فراموش خاندان ہے ان کا۔ میں اس کے

بڑے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی تھی، لیکن اس کے باپ نے کسا کسا جواب دے دیا۔ سن رہے ہو.....؟ اس

سے کہو ثناء کا رشتہ لے کر دے ورنہ یہ بھی جائیٹے سینے.....“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ائی.....؟“

رابعہ پریشان ہو گئی۔

”بس.....! میرا بی بی فیصلہ ہے۔“

بتول بیگم نے فیصلہ سن کر یوں منہ موڑا کہ اب مزید کچھ نہیں سنیں گی، اور عباد بھی جیسے ان سے متفق ہو کر

اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو وہ پریشان اس کے پیچھے بھاگی آئی۔

”عباد.....! عباد.....! میری بات سن.....! جو کچھ ائی چاہ رہی ہیں، وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

وہ فوج اور عاجز ہو کر بول رہی تھی۔

”میں اماں اب اسے صرف اسد کے رشتے کی بات کر سکتی ہوں، لیکن زبردستی ان سے منواؤ نہیں سکتی۔“

”کیوں.....؟ کیوں نہیں منوا سکتی.....؟ تم کیا بیٹی نہیں ہو ان کی.....؟“

عباد نے اٹا اٹا سے لڑا تو وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”ہوں میں ان کی بیٹی، لیکن اب میں پہلے آپ کی بیوی ہوں عباد.....!“

”تو پھر تم پہلے اس گھر کا خیال کیوں نہیں کر رہی.....؟ تمہاری وفاداریاں منگوا کیوں ہیں.....؟“

”میری وفاداریاں منگوا ہیں.....؟“

وہ دُکھ سے اسے دیکھنے لگی۔

”گر نہیں ہیں تو ثابت کرو، ساتھ دو ہمارا.....! بچائے میرا ساتھ دینے کے تم اپنے ماں باپ کی فیور کر

ہی ہو.....؟ تمہیں ان کی زیادہ فکر ہے تو جاؤ کرو ان کی فکر، رہو ان کے پاس.....!“

عباد کچھ سننے ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

”چلو اٹھاؤ شوٹی کو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”چھوڑ آتا ہوں.....؟“

وہ سناٹے میں آ گئی۔

”ہمیشہ کے لئے نہیں چھوڑ رہا، اسد کا رشتہ پکا کر کے آ جانا.....!“

”نہیں.....!“

وہ پیچھے ہٹنے لگی، لیکن عباد نے اس کی ایک نہیں سی اور اسی وقت زبردستی اسے لے کر خواجہ صاحب کے

دراڑے پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس وقت اماں اب اسے دیکھ کر کتنے پریشان ہوں گے اور اس کی روٹی صورت

دلبرہ کچھ گیانیں لگے کہ وہ کیوں تنہی گئی ہے.....؟ اس لئے اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر اسد

ن قابل ہو تا تب تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ ایک مہر کا آوارہ، لوفرقا، اور اس کے لئے تو وہ اماں اب کو مجبور نہیں کر

لتی تھی۔ اس لئے خود پر قابو پانے کے بعد ہی وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”ارے.....! رابعہ.....؟“

اماں نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا جبکہ خواجہ صاحب ٹھٹکے تھے۔

”السلام علیکم ابا.....!“

اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.....! خوش رہو بیٹا.....! یہ اس وقت.....؟“

خواجہ صاحب کو خود پوچھتے ہوئے عجیب سا لگا۔

”بس ابا.....! شوٹی تنگ کر رہا تھا، اسے لے کر کمرے نکلے تو پھر میں آپ کے پاس آ گئی۔“

اس نے ہولت سے بات بتائی۔

”اچھا اچھا.....! عباد کہاں ہے.....؟“

خواجہ صاحب نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا۔

”وہ ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ان کی دوائے کرگھر جائیں گے۔“  
اس نے بتا کر بات بدل دی۔

”ٹانہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟“  
”اپنے کمرے میں ہے، بلاتی ہوں۔“

اماں نے کا تو وہ فوراً بولی۔

”میں جاتی ہوں اماں! آپ یہیں بیٹھیں۔“  
”اچھا! کھانا تو کھاؤ گی ناں؟“

اماں نے پوچھا۔

”ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ کھانا ہوگا تو ٹانہ سے کہہ دوں گی۔“  
وہ کہتے ہوئے ٹانہ کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

گھر میں داخل ہوتے ہوئے صرف چھوٹے بھیا کا خوف تھا کہ اگر ان سے سامنا ہو گیا تو وہ اتنی دیر سے آنے کا سبب پوچھیں گے، ورنہ ای تو جانتی ہی تھیں۔

”چھوٹے بھیا ہیں؟“

اس نے امی سے دیکھتے ہی سرگوشی میں پوچھا اور ان کے نفی میں سر ہلانے پر اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے شاپنگ بیگ ان کے سامنے ڈال کر گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”کیا لائی ہو؟“

چکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”امی نے کچھ سوٹ منگوائے تھے۔“

”کس کے لئے؟“

”چپ رہو!“

امی نے ٹوکا، پھر شاپنگ بیگ سے کپڑے نکال کر دیکھنے لگیں۔ ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتی جا رہی تھیں، جس سے اطمینان ہو گیا۔

”اچھا اچھا! یہ جانی کی شادی کے لئے ہیں۔“

”ہاں!“

امی نے کپڑے دوبارہ شاپنگ بیگ میں ڈالے اور کبس میں رکھے چکی جھٹکتی رہی پہلے اس کے

پاز چکی کاٹنی، پھر شرارت سے بولی۔

”ابھی جہاز زیب بھائی کا فون بھی آیا تھا۔“

”کسک... کیا...؟“

وہ بری طرح چوکی۔

”ارے! تم تو یوں اچھلی ہو جیسے میں نے ان کی آمد کی اطلاع دی ہو۔“

چکی نے چھینٹتے ہوئے ٹوکا تو وہ چل ہی ہو گئی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو رنرلش بھی کرنے لگی۔  
”کم از کم پوچھ لو کہ کیا کہہ رہے تھے وہ۔؟“

”میں کیوں پوچھوں؟“

وہ اتر کر بولی۔

”مت پوچھو! میں بھی نہیں بتاؤں گی کہ وہ تمہارے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔؟ اور یہ کہ انہوں نے تمہارے لئے کیا پیغام دیا ہے۔؟“

چکی نے تجسس پیدا کرنے کے لئے کہا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں انہوں نے بتا تو نہیں دیا کہ وہ ابھی ابھی ان سے مل کر آ رہی ہے۔ مشکل تمام خود پر قابو پا کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے۔؟“

”اب کیوں پوچھ رہی ہو۔؟“

اس لئے کہ میں جانتی ہوں، جنہیں بتانے بغیر چین نہیں آئے گا۔“

چکی بے ساختہ ہنسی پھر اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولی۔

”جہاز زیب بھائی کہہ رہے تھے کہ تم نے ابھی تک ان سے تصویب کی فرمائش نہیں کی۔“

”کروں گی بھی نہیں۔“

بلا ارادہ اس کے منہ سے فوراً نکل گیا۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ میں انہیں دیکھ چکی ہوں۔“

”کیا۔؟“

چکی حیرت کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”کب؟ کہاں؟“

”کچھ دن پہلے سائیکے کے ساتھ چیک گی تو انہیں بھی دیکھ لیا۔“

اس نے محفوظ ہو کر بتایا، البتہ آج کی ملاقات گول کر گئی۔

”بڑی وہ ہو، مجھے بتایا تک نہیں؟“  
 چنگی لمحہ بھر کو خفا ہوئی، پھر فوراً اشتیاق سے پوچھنے لگی۔  
 ”کیا تم نے اپنا تعارف بھی کروایا تھا؟“  
 ”نہیں! میں ڈور ہی سے انہیں دیکھ کر آ گئی۔“  
 ”ڈور سے دیکھ کر آ گئی۔“  
 چنگی اس کی نقل آتا رہتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ پتا نہیں کس کو دیکھ آئی ہیں؟“  
 ”جی نہیں! میں نے ان کا نام پوچھا تھا اور وہ جہاز زیب ہی تھے۔“  
 ”ایسے ہیں ناں جہاز زیب بھائی؟“  
 ”ہاں!“  
 اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا، پھر کہنے لگی۔  
 ”اب انہیں بتا مت دینا۔“  
 ”کیوں؟ میں تو ضرور بتاؤں گی۔“  
 ”اچھا چاہیے! امی آ رہی ہیں۔“  
 امی کو آتے دیکھ کر اس نے سرگوشی میں چنگی کو چپ کرایا۔  
 ☆ ☆ ☆

سیانے بچوں کو ٹکڑا کر کھانا گرم کیا، پھر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر دانیال کا انتظار کرنے لگی۔ اندر ہی اندر جھنجھلا بھی رہی تھی کہ جانے کن کا مومن میں لگا ہے؟ سب کے ساتھ کھانا کھالے تو وہ بھی آرام سے ہو جائے۔ لیکن پتا نہیں اسے بھی کیا ضد تھی؟ اکثر رات کے کھانے سے عائب ہو جاتا تھا۔ پھر گیارہ بارہ بجے کہتا تھا، بھوک لگ رہی ہے۔  
 اور پہلے تو وہ برا نہیں مانتی تھی، لیکن جب سے دانیال نے ٹانہ کا نام لے کر اس کی امیدوں پر پانی پھیرا تھا، وہ اس کے پوچھنے سے چڑنے لگی تھی، لیکن ظاہر نہیں کرتی تھی۔ ابھی بھی دانیال آیا تو اس نے لہجے میں فرق نہیں آئے دیا، لیکن اس کے چہرے سے ناگوار ہی ظاہر ہو گئی تھی۔  
 ”حد کرتے ہو دانیال! صرف تمہارے کھانے کے لئے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔“  
 ”بس! اب تو کچھ دنوں کی بات ہے بھائی! پھر تو ٹانہ آ جائے گی۔“  
 وہ پلیٹ میں سائین نکالتے ہوئے اپنی ٹون میں بولا تھا۔

”پتا نہیں! مجھے تو خواجہ صاحب کے ارادے نہیں لگ رہے۔“  
 وہ پہلے سے سوچ کر بولی تھی۔  
 ”کیا مطلب؟“  
 دانیال ایک دم ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔  
 ”بھئی! دیکھو ناں! اسنے دن ہو گئے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اتنا بھی کیا سوچنا۔ دیکھئے بھالے ہو تم۔!“  
 ”ہاں! لیکن۔۔۔“  
 وہ اس قدر بولا تھا کہ سیہ سار شروع ہو گئی۔  
 ”ویسے مجھے اسی دن ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کا انداز لیا دیا سا تھا۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہے تھے۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی؟ خواجہ صاحب تو بڑے مہذب اور وضع دار انسان ہیں۔“  
 دانیال کو حقیقتاً یہ بات مبہم نہیں ہوئی تھی۔  
 ”بھئی! میں نے تو جو محسوس کیا، وہی بتا رہی ہوں۔ تم چاہو تو اپنے بھائی سے پوچھ لو۔ عجیب اکھڑا اکھڑا انداز تھا ان لوگوں کا۔“  
 سیانے پہلے سے بدظن کرنے کی کوشش کی پھر بیٹرا ابدل گئی۔  
 ”ویسے لاکی اچھی ہے دیکھئے میں۔“  
 ”جی! صرف دیکھئے میں، بلکہ رہ بات میں اچھی ہے، مگر داری میں ماسٹر! دیکھئے گا، آتے ہی سارا گھر سنبھال لے گی۔“  
 وہ ٹانہ کی تعریف پر خوش ہو گیا تھا۔  
 ”اچھا! ویسے گھر داری کے ساتھ ساتھ سوسائٹی مودر کا بھی آنا چاہئے۔ خیر! وہ تو تم سکھا ہی دو۔ پھر میں بھی تو ہوں ناں! میں سب سکھا دوں گی ٹانہ کو۔“  
 سیانہ کو پتا بھرم بھی رکھنا تھا۔  
 ”ہاںکل! آپ کی شاگردی میں آ کر تو وہ اور بھی نکھر جائے گی۔“  
 ”اچھا! اب تم جلدی کھانا ختم کرو، اورہیلز! برتن بچن میں رکھ دینا، میں ذرا حنا کو دیکھ لوں۔“  
 وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”ارے! حنائیں ہیں ہے کیا؟“  
 اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

”ہاں.....! شام میں آئی تھی تو پھر میں نے روک لیا۔“

سیمانے بنور دانیال کا چہرہ دیکھا۔ وہ کھانے میں مصروف ہو گیا تو وہ وہاں سے نکل کر حنا کے پاس آگئی۔ حنا سی کے انتظار میں بیٹھی تھی، اسے دیکھتے ہی جلتے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

”کھلا آئیں دیور کو کھانا؟“

”ہاں.....!“

سیمانے ”ہاں“ کو کہا سمجھتے ہوئے حنا کے پاس بیٹھ گئی۔

”بس کریں آپ! اب اس کے چونچلے اٹھانے کا کیا فائدہ.....؟ اس دن تو خوشی خوشی اس کا رشتہ لے

کر چلی گئی تھیں.....؟“

حنانے شک کر جتا تو سیمانے کو بھی غصہ آ گیا۔

”اس میں تصور میرا نہیں، تمہارا ہے۔ تم اگر حسین ہونے کے ساتھ ساتھ قہوڑی عقل مند بھی ہو تیں تو اس

کی نوبت نہ آتی۔“

”کیا مطلب.....؟ آپ مجھے کیوں الزام دے رہی ہیں.....؟ لڑکی دانیال نے خود پسند کی ہے، میں نے نہیں پسند کروائی۔“

”اُف.....! ذرا عقل نہیں ہے تم میں۔“

سیمانے جھجھلا گئی۔

”میرا مطلب ہے، ٹانیہ جیسی سولی معمولی لڑکی نے دانیال کو پھانسا لیا، لیکن تم اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔“

”میں کیا کروں.....؟ دانیال مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا، اور میں ایسی گری پڑی بھی نہیں

ہوں جو اس کے آگے پیچھے بھرتی رہوں.....؟“

”ابھی یہ کہنا پڑے گا حنا.....!“

سیمانے زور سے کہی۔

”دانیال قابو میں آ جائے، پھر بے شک اسے جو تے کی نوک پر رکھنا۔“

”اُف.....! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ خود تو آپ نے دانیال سے کہہ دیا ہے کہ آپ کو

ٹانیہ پسند آتی ہے.....؟“

حنانے ہنسی۔

”وہ اس لئے میری بہن.....! کہ دیور کی نظروں میں میرا بیچ بنارہے۔“

”نہیں.....! آپ بتائی رہیں اپنا بیچ.....!“

حنانے کھرجلی گئی تو سیمانے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے.....؟

☆.....☆.....☆

راہبہ عجیب مشکل میں تھی۔ عبادتو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ اسد کے رشتے کی ہائی بھروا کر آئے، اور اس کی بیٹھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس منہ سے اسد کا نام لے.....؟ جس کے بارے میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ کتنا ہنس، بدعلاظ ہے۔ پھر نہ تعلیم نہ روزگار۔ وہ خود بھی اس کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن عبادتو اس کی ای کو جواب بھی دینا تھا۔ اس وقت وہ اسی سوچ میں بیٹھی تھی کہ خلیجہ صاحب اسے نکار کر کہنے لگے۔

”راہبہ بیٹا.....! تمہاری اماں نے تمہیں دانیال کے بارے میں بتایا ہے نا.....؟“

”جی ابا.....!“

منتشر ذہن کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔

”تو بیٹا.....! مجھے اور تمہاری اماں کو تو یہ رشتہ بہت مناسب لگ رہا ہے۔ تم کیا کہتی ہو.....؟“

خلیجہ صاحب نے اپنا خیال بتا کر اس سے پوچھا تو اس نے حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

”میں.....؟“

”ہاں بیٹی.....! تم بڑی بہن ہو جانے کی، تمہاری رائے بھی ضروری ہے۔“

خلیجہ صاحب نے کہا تو اس کا حلق خشک ہو گیا جبکہ سامعوں میں بول نیکی کی آواز گونجنے لگی تھی۔

”تم سن لو لڑکی.....! میرے بیٹوں کے لئے کی نہیں ہے۔ جاؤ بات کرو اپنے ماں باپ سے اسد کے لئے، ٹانیہ کا رشتہ دیتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ تمہیں بھی اپنے پاس رکھیں۔“

”کیا سوچے گئیں راہبہ.....؟“

اماں نے نو کا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر خود کو سنہا لے ہوئے کہنے لگی۔

”کچھ نہیں اماں.....! وہ..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو اور ابا کو دانیال پسند ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو

تا ہے.....؟ اچھا ہے، مختصر سی جھلی ہے، زیادہ جھنجھٹ نہیں ہے۔ آپ ہائی بھر لیں، بلکہ جلدی شادی بھی کر دیں، ٹانیہ کی۔“

”بہت جلدی تو ممکن نہیں ہے بیٹا.....! کچھ وقت تو گھلے گا۔ ہاں.....! البتہ بات کچی کی جاسکتی ہے۔“

خلیجہ صاحب نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”اور ہاں.....! تم ذرا ٹانیہ سے اس کی مرضی معلوم کر لو۔“

اماں نے ایک دم خیال آنے پر کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ٹانیہ کیوں منع کرے گی.....؟“

پھر اسے اپنی بات سنجاتی پڑی۔

”میرا مطلب ہے اماں! ثانیہ آپ کے اور بابا کے فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا! تمہاری طرح ثانیہ بھی فرما تیرا دارا و رسادات مندر ہے۔ پھر بھی اللہ رسول کا حکم

ہے، بیٹی سے ضرور پوچھ لینا چاہئے۔“

”جی! میں پوچھ لیتی ہوں۔“

وہ اسی وقت اٹھ کر ثانیہ کے کمرے میں آئی تو وہ شوہنی کو آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔

”سو کیا ہے؟“

اس نے کہا تو ثانیہ خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے دبی آواز میں بولی۔

”آہستہ بولو! بڑی مشکل سے دیا ہے۔“

”خیر! اب اتنی جلدی نہیں اٹھے گا۔“

وہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی اور ثانیہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

ثانیہ نے ٹوکا تو مسکرا کر بولی۔

”اچھی لگ رہی ہو اور خوش بھی۔“

”تمہاری محبت ہے!“

”میری یا۔“

اس کے معنی خیر انداز پر ثانیہ جھینپ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

”اماں ابانے کچھ کہا ہے تم سے؟“

”ہاں! لیکن تم تو اس روز کوئی اور نام بتا رہی تھیں، جبکہ اماں بابا۔“

”اماں ابانے کیا بتایا ہے؟“

ثانیہ نے پریشان ہو کر نوراپوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

”دانیال!“

”اُف! میری تو جان ہی لنگ گئی تھی۔ بہت بری ہوتی!“

ثانیہ اس کی شرارت پر وہ قہقہہ مچا رہی تھی۔

”ہاں بھئی! اب تو سب ہی برے ہیں۔ اچھا تو بس ایک وہی ہوگا۔“

راجندر نے معنوی ہنسی سے کہا تو ثانیہ ایک دم تنہید ہو گئی۔

”خیر! اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”اچھا! پھر کیسا ہے؟“

راجندر جانے کیا جانتا چاہ رہی تھی؟

”پھر ایسا ہے راجندر! کہ میرے نزدیک ہر شے کی اپنی جگہ اپنی اہمیت ہے اور انشا اللہ رہے گی۔“

”اور اگر خدا نہ کرے کہیں آزمائش آگئی تو کیا کرو گی؟“

راجندر کسی بھی طرح اپنا خدشہ چھپا نہیں سکی۔

”کیسی آزمائش؟“

ثانیہ جھٹکی تھی۔

”رشتوں میں آزمائش یعنی ماں، باپ، بہن اور محبت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑے تو کسے منتخب کرو گی؟“

”تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو راجندر؟ کیا اماں بابا، دانیال کے رشتے پر راضی نہیں ہیں؟“

ثانیہ بھی سہمی تھی۔

”ارے نہیں!“

راجندر ایک دم سنبھلی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اماں ابادل سے راضی ہیں اور پتا ہے، کبہ رہے تھے اس جمعہ کو دانیال کے گھر

والوں کو کھانے پر بلائیں گے اور تمہاری بات پکی کر دیں گے۔“

راجندر اسے خوشی اور ایمان دے کر خود اندر سے متوحش ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے سوچ لیا کہ اسے اپنی بہن

کی خوشیاں جھینپنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ایسی کوشش بھی نہیں کرے گی۔ اس لئے اس نے اسد کا کام بھی نہیں لیا تھا

اور گھر آ کر ساس سے بس اتنا کہا کہ ثانیہ کی بات پکی ہو گئی ہے جس پر وہ ایک دم چھٹے سے اکھڑ گئیں۔ عباد کوئی مطلب کر

کے بولیں۔

”دیکھ لیا عباد! اپنی بیوی اور اس کے سینے والوں کی مکاریاں؟ کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں

تھی۔ پھر یہ اچانک بات کیسے پکی ہو گئی؟ وہ بھی داماد سے مشورہ کئے بغیر؟ کانوں کان خبر نہیں ہونے دیں

جہیں۔“

”یہ جھوٹ بول رہی ہے امی!“

عباد کو جیسے اپنی عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔

”اس کے اماں اب اس اچنی جرأت نہیں ہے کہ کوئی کام میرے مشورے کے بغیر کر لیں۔ اس نے جان

بوجھ کر وہاں بات نہیں کی ہوگی، کیونکہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کی بہن یہاں آئے۔“

”کیوں نہ ہو۔“

بتول بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر بولی تھی۔

”تمہیں امی! میں جھوٹ نہیں بولی رہی ہوں، آپ میرا یقین کریں۔“

”تمہارا یقین کر لوں؟ او بیٹے کو جھٹلا دوں؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہی امی! آپ خود جا کر معلوم کر لیں۔ ثانیہ کے دوستین رشتے آئے ہوئے تھے، پھر

اماں! باکو جو مناسب لگا، انہوں نے وہیں بات چلی کر دی۔“

”بات چلی ہوئی ہے ناں؟ نکاح تو نہیں ہو گیا؟ اور اب تو نکاح ٹوٹنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔“

عباد نے کہا تو وہ سائلے میں آگئی۔

”عباد؟“

”ارے! ٹھیک کہہ رہا ہے عباد! تم اپنے نکاح کی سلامتی چاہتی ہو یا نہیں؟“

بتول بیگم نے سبک دلی کی انتہا کر دی۔

”خدا کے لئے امی! مجھ پر نہیں تو اپنے پوتے پر دم کریں۔ عباد! آپ سمجھائیں ناں امی کو۔“

”میں امی کو سمجھاؤں؟ تم اپنے ماں باپ کو نہیں سمجھاسکتیں؟ دم کی بیک مانگتی ہے تو ان سے

مانگو جا کر۔“

عباد نے یہ کہتے ہوئے اسے زور سے دھکا دیا تھا۔

”امی! خدا کے لئے میری مجبوری سمجھیں۔ مجھے ایک موقع اور دیں۔ میں پھر اماں! اب سے بات

کروں گی۔“

اس نے مدد کے لئے بتول بیگم کو پکارا، لیکن ان ہی کی شہ پر تو عباد نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکالا

تھا۔

”اب تم اس گھر میں ثانیہ کے ساتھ ہی آسکتی ہو۔“

عباد نے فیصلہ سنا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

”میرا بچہ!۔“

وہ پاگھوں کی طرح دروازہ پیٹ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بات نہ کر دے۔ اس وقت وہ خوبصورت صاحب سے اپنے اسی خدے کا اظہار کر رہی تھیں کہ ڈور بیل بڑی زور سے بجی تھی۔

”یہ کون آگیا؟“

اماں کو یہ بداعلت ناگوار گزری تھی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“

خوبصورت صاحب! آخر کچلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کی ہانہوں میں روٹی سسکتی راہبہ کو دیکھ کر اماں

دل کٹیں۔

”الہی خیر! کیا ہوا میری بچی کو؟ ثانیہ! ثانیہ! اپنی لاؤ جلدی سے۔“

”آرام سے بیگم۔“

خوبصورت صاحب خود پریشان تھے، بیگم کو دک کر راہبہ سے کہنے لگے۔

”ارے بیٹا! کچھ تناؤ تو کسی، کیا ہوا ہے؟ یوں روٹی رہو گی تو کیا پتا چلے گا؟“

جب ہی ثانیہ پانی لے کر آگئی اور ناچھگی کے عالم میں ایک ایک کو دیکھنے لگی۔

”لو پانی چیت۔“

اماں نے ثانیہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر راہبہ کے ہونٹوں سے لگا یا تو وہ ایک گھونٹ لے کر بولی۔

”اماں! یہ اچھے! انہوں نے شوٹی کو بھی اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“

”کیا مطلب؟ شوٹی کو رکھ لیا ہے؟“

خوبصورت صاحب نے الجھ کر پوچھا۔

”وہ! بابا!۔“

راہبہ رگ کر بولی۔

”وہ! اسد کے لئے ثانیہ کو مانگ رہے ہیں۔“

”میرے خدا!۔“

ثانیہ نے اختیار پیچھے ہٹتی۔ پھر ایک دم پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

”ارے! کوئی زبردستی ہے کیا؟ ایک بیٹی کو کون سا سکھ دیا ہے انہوں نے جو میں دوسری بھی

دے دوں؟“

اماں نے خنہ سے کہا تو خوبصورت صاحب نے معاملہ سمجھتے ہوئے بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر راہبہ

سے بولے۔

”بیٹا! تم رومت! مجھے بتاؤ! کیا کہا ہے تمہاری ساس نے؟“

جمعہ میں ابھی چار دن تھے، لیکن اماں ابھی سے ہی تیار یوں میں لگ گئی تھیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی، پھر

کھانے میں کیا کیا پکنا چاہئے؟

باقی سب تو ٹھیک تھا بس ایک عباد کی طرف سے تھوڑا خدشہ تھا کہ وہ مہمانوں کے سامنے کوئی اٹنی سیدھی

”ابا! انہوں نے یہ کہہ کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے کہ جب تک تاجہ کا رشتہ نہیں دیں گے، میں بھی وہاں نہیں رہ سکتی۔“

راجہ نے آنسو پونچھے ہوئے بتایا تو خلیفہ صاحب اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگے۔

”بیٹا! اگلے کیا انہوں نے اسی سلسلے میں تمہیں بھیجا تھا؟“

راجہ نے سر ہٹکا لیا تو خلیفہ صاحب انہوں سے بولے۔

”تو بیٹا! تمہیں بتانا چاہئے تھا۔“

”میں نہیں چاہتی ابا! اسد کو آپ جانتے ہیں، پھر بھی اگر میں بتا دیتی تو کیا آپ مان لیتے؟“

خلیفہ صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”نہیں ابا! اسد کسی بھی طرح تاجہ کے قابل نہیں ہے۔ بس! آپ مجھے میرا اچھا لادیں۔“

بہت چھوٹا ہے ابا! میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

راجہ پھر رونے لگی تو خلیفہ صاحب اس کا سر تھپک کر بولے۔

”ممبر سے بیٹا! ممبر سے، ممبر سے، ممبر سے، اپنے باپ دادی کے پاس ہے۔ اس کے لئے

پریشان مت ہو۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں؟“

”اسی لئے میں کہہ رہا تھا، تمہیں کل ہی بتانا چاہئے تھا۔“

”خوشی تمہارے ساتھ تھی، پھر میں خود تمہیں نہ جانے

دیتا۔ سخت حماقت کی ہے تم نے۔ اب رونا دھونا بند کرو۔ جاؤ آرام کرو جا کر۔ میں دیکھوں گا کیا کر سکتا ہوں؟“

خلیفہ صاحب کے منہ سے اماں بولھا گئیں۔

”ہائیں؟ اسے کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

”تم چپ رہو! جاؤ راجہ! کمرے میں جاؤ۔“

خلیفہ صاحب نے اماں کو نوک کر راجہ سے کہا تو وہ ایک دم اٹھ کر چلی گئی۔

”یا اللہ! تو رحم کر! جانے میری بیٹیوں کے نصیب میں کیا کھسا ہے؟“

اماں آہ بھر کر بولیں، پھر خلیفہ صاحب کو دیکھا۔ وہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئے تھے؟

”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

کتی دیر بعد آخراں کو کوٹنا پڑا۔

”کیا سوچ سکتا ہوں؟ میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا۔ مظلوم ہو گیا ہے بالکل۔“

خلیفہ صاحب اچانک بے بس نظر آنے لگے تھے۔

”ہاں! یہی تمہاری مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ اچھی زبردستی ہے۔ راجہ کی باری بھی اتنی جلدی چائی تھی

دل بیگم نے کہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔“

اماں نے یہ کہہ کر پھر آہ بھری تھی۔

”تو تاملی تو ہماری ہوئی تاں بیگم! کہ ہم نے ان کا اعتبار کر لیا تھا۔؟“

خلیفہ صاحب نے کہا تو وہ رونا توڑی تھیں۔

”اب دوبارہ نہ اعتبار کر لیجئے گا، اسد کی حرکتیں کوئی دھکی چھپی نہیں ہیں۔ زمانہ جانتا ہے، کیسا لوفر، آوارہ

ہے۔“

”اسد کو چھوڑ دو، راجہ کا سوچو۔“

خلیفہ صاحب جھلا کر بولے تھے۔

”راجہ کا کیا سوچوں مہاں! میں نے تو جب سے راجہ کی شادی ہوئی ہے کسی ایک دن بھی اسے

لوٹ نہیں دیکھا ہے۔ کسی ہنسی کھلکھلائی تھی، اب کسی سر جھما کر رہ گئی ہے میری بیٹی۔“

”ہاں! بہت صابر ہے میری بیٹی۔“

”آپ جا کر بات کریں اس کی ماں سے۔ شریف لوگوں کے یہ طریقے تو نہیں ہوتے کہ دھکے دے کر

ہا کو گھر سے نکال دیا۔؟ خدا نخواستہ راستے میں کچھ ہو جاتا تو۔؟“

”بس کرو بیگم! میں بیٹیوں کا باپ ہوں۔“

خلیفہ صاحب کمرہ پر گئے تھے۔

”ارے! بیٹیوں کا باپ ہونا بزم ہے کیا؟“

”شاید جرم ہی ہے، جس کی سزا بھی ختم نہیں ہوتی۔“

خلیفہ صاحب کی حد درجہ لڑائی محسوس کر کے اماں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس کی زندگی کو ایک نیا عنوان مل گیا تھا۔ کہ وہ خواہوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی، لیکن اب جبکہ

’قیامت میں رنگینیاں آن سانی تھیں تو خواب آپ ہی آپ بج گئے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے جہانزیب کے ساتھ

یاں بانہ جمتی رہی۔

وہ اکثر اس کے راستے میں آکھڑا ہوتا تو کبھی کسی کینے میں مل جاتا، جس کے خواب ناک ماحول میں

ایلی مہر گینز باتوں سے وہ اسے یوں گرفت میں لیتا کہ وہ اٹھنے کی دنوں تک اس صحرے نکل نہیں پاتی تھی، اور کبھی یوں

ان کا زلی کو بلی بی سرکوں پر دوڑا جاتا رہتا۔ اس کی نگاہ میں اگر کبھی دل نہ لگا تو یہ خیال زیادہ غالب نہ رہا کہ وہ

لڑکی غیر نہیں، اس کا منہ تیرے، اور آخراں کو اس کی ساتھ نہ صرف چلنا ہے بلکہ زندگی گزارنی ہے۔





وہ شش و پنج میں پڑ گئی، اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ منع کرتی، وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا اور چکر کاٹتے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور اترنے پر اصرار کرنے لگا۔ آخر میں خنگی کا اظہار کیا تو وہ مجبور ہو گئی۔ گوکہ گزشتہ کی طرح اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا حرج ہے، ویسے بھی اب زیادہ دن تو نہیں ہیں جب وہ اس کے ساتھ آزادانہ گھوم پھر سکے گی، پھر بھی پتا نہیں کیوں اندر ایک ڈر سا گھر کر گیا تھا۔ جبکہ واپسی میں وہ اس کا دھیان بٹانے کی خاطر بڑی لگاؤ کا مظاہرہ کرتا رہا، لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بے حد مضطرب تھا۔ تین دن ہو گئے تھے ثانیہ سے بات کئے ہوئے۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی؟ وہ جب بھی فون کرتا، بکھی خوبصورت صاحب کی آواز سنائی دیتی تو بکھی ان کی نیگم کی، اور وہ فوراً ہی لائن کاٹ دیتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کیسے ثانیہ سے رابطہ کرے؟ پہلے تو وہ خوبصورت صاحب سے طے کئے کہ یہاں ان کے گھر چلا جاتا تھا لیکن جب سے رشتے کی بات ڈالی تھی، تب سے وہ وہاں جانے سے ہی روک گیا تھا، کیونکہ خوبصورت صاحب کی طرف سے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا، اور کسی جو اس سے پہلے ان کے ہاں جانا کی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہ بہر حال اب پریشان ہو گیا تھا۔ رات بہت دیر تک وہ بار بار خوبصورت صاحب کے گھر کا نمبر دہراتا رہا تھا لیکن ثانیہ کی آواز سننے کو نہیں ملی تو وہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے بہت دیر میں سویا تھا۔ اس لئے صبح اٹھنے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کی نہیں پڑا یا تو سہا تہی ہوئی بیٹھی تھی۔

”آؤ شہزادے! تمہارے ہی انتظار میں بیٹھی ہوں۔“

”سوری بھائی! میں۔۔۔“

”بس بس۔۔۔ اب جلدی سے ناشتہ کرو، مجھے اور بھی کام ہیں۔“

”جی!“

وہ سعادت مندی سے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ تب اس کا چہرہ دیکھ کر سہا پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔؟“

”جج، جی بھائی! میں ٹھیک ہوں۔“

وہ چونک کر بولا تھا۔

”ٹھیک لگتو نہیں رہی ہے کوئی پریشانی کی بات ہے تو بتاؤ۔؟“

”ارے نہیں بھائی! کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

وہ زبردستی مسکرایا، لیکن سہا کہاں بخشتے والی تھی؟۔۔۔ ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”ہاں بھائی! اب مجھے کیوں بتانے لگے تم۔؟ اب تو ساری باتیں ثانیہ کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔“

”ارے!۔۔۔ آپ تو ناراض ہو گئیں۔؟“

اس نے ہونٹوں سے لگا جائے کا کپ واپس رکھ دیا۔

”ثانیہ میری زندگی میں ضرور آنے والی ہے بھائی! لیکن اس کی اہمیت آپ سے زیادہ نہیں ہو

”اے۔۔۔“

”بس بس۔۔۔ ارے نہ دو۔۔۔!“

سہا کی خنگی بنوڑ تھی۔

”میرا یقین کریں بھائی! میرے لئے آپ بہت محترم ہیں۔“

وہ صدق دل سے بولا تھا۔

”چھاپا بابا! اگر لیا تمہارا یقین۔۔۔ اب یہ بتاؤ! خوبصورت صاحب سوچنے میں اور کتنا وقت لگائیں

کے؟ دو دہشتے ہو گئے ہیں۔“

سہا صل بات کی طرف آ گئی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بھائی۔؟ آپ خود جا کر معلوم کریں۔“

اس نے کہا تو سہا حیرت سے بولی۔

”میں جاؤں۔؟ میرا مطلب ہے، اصولاً تو انہیں بلانا چاہئے۔“

”پتا نہیں!“

”کیوں؟ تمہاری ثانیہ سے بات نہیں ہوئی کیا؟ وہ کیا کہتی ہے۔؟“

سہا نے بظاہر سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں بھائی! میری ثانیہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ نزد ہو جاتی

”ہ۔۔۔“

وہ بات بناتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور سہا کو مزید کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر غلبت سے ”خدا حافظ“ کہہ کر

اٹھ آیا تھا۔ پھر آفس آ کر اپنی چیز پر بیٹھے ہی اس نے خواہ صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کر تو اسے اس کی آواز آئی

فنی۔ وہ فوراً سیوریئر رکھ کر بڑبڑایا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ثانیہ کو۔؟“

وہ سر جھکانے تیز تیز چل رہی تھی کہ اسد کے راستے روکنے پر انتہائی غصے اور ناگواری سے اسے دیکھا گئی۔ بولنے سے خود کو باز رکھنے کی خاطر اس کے ہونٹ سمجھتے سمجھتے تھے۔

”کتنی بار کہا ہے، دھوپ میں نہ لگا کر، دکانی ہو جاؤ گی۔“

اسد نے ترنگ میں کہا تو وہ دانت چیس کر بولی۔

”تم میرے راستے میں کیوں آتے ہو.....؟“

”میں.....؟“

اسد حیران ہونے کی ایک ٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں نہیں پتا میں تمہارے راستے میں کیوں آتا ہوں.....؟ تمہاری بہن نے نہیں بتایا تمہیں.....؟“

”بتایا ہے، سب بتایا ہے راجہ نے، یہ بھی کہ تم کتنے کتنے کینے اور فوہو ہو۔“

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”اپنا نشانک ہے۔“

اسد نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کئے تو وہ نگوشت سے سر جھٹک کر جانے لگی کہ وہ بھر سامنے آ گیا۔

”سنو.....! یہ رعب کسی اور پر جانا۔ میں اگر آرام سے بات کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گف

سر چڑھ جاؤ۔ یاد رکھو.....! میں اگر سر چڑھاتا ہوں تو مزاحیہ ٹھکانے لگانا بھی جانتا ہوں۔ کسی بھول میں مت رہنا۔“

”تم بھی کسی بھول میں مت رہنا اسد! تمہارے بیسوں کو میں جو تے کی لوک یہ کہتی ہوں۔ کبھی

تم.....؟ ہو میرے راستے سے، اور آئندہ اگر تم نے کبھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ حشر کروں گی کہ سارا

زندگی یاد رکھو گے۔“

وہ غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی اور پھر رکی نہیں تھی، اسے دھکیل کر تیز قدموں سے گھر آتے ہی

برآمدے میں رکھتے تختے پوٹ پر ڈھکی، اور اپنی سائیں ہموار کر رہی تھی کہ اندر سے آتی ہوئی راجہ کے رونے کا

آواز سن کر ایک دم اُٹھ کر اندر آئی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی اماں.....! مجھے بس میرا بچہ چاہئے۔“

وہ راجہ کی شدن کر دو روز سے ہی میں رک گئی۔

”آج بچے کا تمہارا بچہ.....! تم خود کو پکان مت کر دینا.....! ابھی تمہیں بہت حوصلے کی ضرورت ہے۔“

اماں نے راجہ کو پچاڑتے ہوئے کہا۔

”کہاں سے لاؤں حوصلہ اماں.....؟ ساری ساری رات میرے کانوں میں شوبی کے رونے کی آواز

کو سنتی ہے۔ پتا نہیں میرا بچہ.....“

”تمہارا بچہ کسی غیر کے پاس نہیں ہے راجہ.....!“

وہ ایک دم آگے آ کر بولی تھی۔

”اچھا ہے، ابھی اسے وہیں رہنے دو۔ چار دن سنبھالیں گے باپ اور دادی تو دن میں تارے نظر

اٹھائیں گے نہیں۔“

”میں یہ سب نہیں جانتی، مجھے بس میرا بچہ چاہئے۔“

راجہ کچھ کونٹا نہیں تھی۔ اماں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بولیں۔

”حوصلہ رکھو راجہ.....! روتی کیوں ہو.....؟ تمہارے ابا کہہ گئے ہیں، آج آفس سے سیدھا تمہاری

ماس کے پاس ہی جائیں گے۔“

تب ہی فون کی بیل براماں اس سے کینے لگیں۔

”دیکھو دانیہ.....! اُس کا فون ہے.....؟ کئی بار فون آیا ہے مگر ادھر سے کوئی بولنا ہی نہیں ہے۔“

”عباد ہوں گے اماں.....! یا میری ساس..... میں دیکھتی ہوں۔“

راجہ کہتے ہوئے اُٹھنے لگی کہ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں نہیں.....! تم یہیں بیٹھو.....! اجاؤ تم دیکھو دانیہ.....!“

”جی.....!“

وہ پلٹ کر لابی میں آگئی اور کیونکہ راجہ نے عباد اور اپنی ساس کا کہا تھا، تو اسے بھی یہی لگا، جب ہی

ریسیور اٹھا کر ناگواری سے بولی تھی۔

”ہیلو.....!“

”کہاں ہو دانیہ.....؟“

دانیال کی بے قراری انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔

”تین دن سے میں مسلسل فون کر رہا ہوں۔ کبھی تمہاری اماں اُٹھاتی ہیں کبھی ابا۔ تم خود کہاں ہو

.....؟“

اس نے گھر کر پیچھے دیکھا، پھر آواز دبا کر بولی تھی۔

”سو رہی دانیال.....! میں اس وقت بات نہیں کر سکتی۔“

”اس وقت بات نہیں کر سکتی یا مجھ سے بات کرنا ہی نہیں چاہتیں.....؟“

وہ یک دم شامی ہو گیا تھا۔

”یہ.....! آپ کیا کہہ رہے ہیں دانیال.....؟“

وہ پریشان ہو گئی۔

”تم بتاؤ.....! کیوں کتر اری ہو مجھ سے.....؟“

دانیال نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا تو وہ عاجزی سے بولی۔

”اسکی کوئی بات نہیں ہے دانیال.....! آپ پلیز..... غلط نہ سمجھیں۔“

”پھر کیا سمجھوں.....؟ جب تم میرا خون ریسو نہیں کرو گی تو میں یہی سمجھوں گا ناں کہ تم مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔“

”ایسا نہیں ہے دانیال.....! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں.....؟“

وہ شکل میں بڑکئی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے اہل سمجھتی ہو کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھ پاؤں گا.....؟“

وہ ناراض ہو کر اسے زچ کر رہا تھا۔

”آف.....! آپ تو..... اچھا..... میں پھر بات کروں گی۔“

اس نے ایک دم ریسو رکھ دیا اور یہ سمجھا ہی ہوا، کیونکہ اسی وقت خولید صاحب آگئے تھے۔ اس نے خود پرتاب پاتے ہوئے انہیں سلام کیا اور ان کے پیچھے کمرے میں آگئی جہاں اباں اور رابعہ بیٹھی تھیں۔

”ابا.....؟“

رابعہ انہیں دیکھ کر بے قراری سے اٹھی تھی۔

”کیا ہوا ابا.....؟ آپ مجھے نہیں میرے کمر.....؟ کیا کہا میری ساس نے.....؟ شوبی..... شوبی ٹھیک

ہے ناں.....؟“

”ہاں بیٹا.....! سب ٹھیک ہیں۔ شوبی بھی ٹھیک ہے۔“

خولید صاحب کی بوچھل آواز اس کے دل میں تراز ہو گئی، جبکہ رابعہ نے اپنے غم میں محسوس ہی نہیں کیا۔

”آپ شوبی کو لے آئے ناں ابا.....! وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”رابعہ بیٹا.....! اپنے ابا کو بیٹھئے تو وہ..... تم نے تو آتے ہی.....“

اباں نے رابعہ کو ٹوکا کہ جب احساس ہونے پر وہ نام ہو کر بولیں۔

”ہاں.....! ابا.....! آپ! بیٹھیں، میں پانی لاتی ہوں۔“

وہ بھاگ کر پانی لے آئی تو خولید صاحب پانی پی کر غائبانہ طور پر اس کے سوالوں سے بچنے کی خاطر

بولے تھے۔

”بیٹا.....! اگر چائے مل جاتی تو.....“

”میں ابھی نکالتی ہوں۔ اباں.....! آپ بھی بیٹھیں گی.....؟“

رابعہ نے بہت غلٹ میں پوچھا جیسے وہ آغا نا سب کاموں سے فارغ ہو جانا چاہتی ہو۔

”دے دینا.....!“

اباں کا جواب سن کر وہ تیر کی سی تیزی سے لگی تھی، تب ہی خولید صاحب کہنے لگے۔

”بہت خضدی عورت ہے بتول بیگم، اسی بات پر آڑی ہوئی ہے کہ ناخن کا رشتہ دو گے تو رابعہ اس گھر میں

آئے گی، ورنہ نہیں.....!“

وہ ابا کی بات سن کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔

”یا اللہ.....! رحم کر میری بچیوں پر۔ پھر آپ نے کیا کہا.....؟“

اباں پوچھ رہی تھیں۔

”کہنے کو تو بہت کچھ تھا بیگم.....! مہربانیوں کا معاملہ ہے، کسے بساؤں کسے آجاؤں.....؟ تم کر سکتی ہو

یہ فیصلہ.....؟“

ناخن اباں کا جواب سننے کوڑی نہیں، تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مرجھیں

بھر گئی تھیں۔ جانے یہ کون سا مونہ تھا.....؟ ابا بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ اس کا دل ابا کی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر

روئے کو چاہ رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنا خیال بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے.....؟

لیکن رات میں بچن کے آخری کام سمیٹتے ہوئے اسے اچانک دانیال کی باتیں یاد آنے لگیں کہ وہ اس

سے کیوں کتر اری ہے.....؟ تو وہ یہ جاننے کے لئے کہ اباں ابا کیا فیصلہ کرتے ہیں.....؟ بچن بند کر کے اباں کے

کمرے کی طرف آگئی۔ اندر شاید خولید صاحب ٹہل رہے تھے، جب ہی اباں کہہ دی تھیں۔

”بیٹھ جائیں میاں.....! اٹھک جائیں گے آپ.....! یوں پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“

”تو کیسے حل ہوتے ہیں.....؟ بتاؤ.....! تمہارے نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے.....؟ کسے قربان کر دو

گی.....؟ رابعہ کو کیا خانہ کو.....؟“

خولید صاحب جیسے ڈھسے گئے تھے۔

”بس کریں میاں.....! مجھ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔“

اباں کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس کر کے وہ تڑپ گئی۔

”تو میں کیا پتھر کا بنا ہوا ہوں.....؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے کیا.....؟ رابعہ کے آنسو پوچھتا ہوں تو

پھر ناخن ساری زندگی رونی ہوئی نظر آتی ہے، اور اگر ناخن کی خوشی دیکھوں تو..... تو.....“

خولید صاحب کی آواز بھی ٹوٹ گئی تھی۔

”کچھ نہ سوچیں آپ.....! اللہ پر چھوڑ دیں۔“

”اللہ بھی خالوں کے ساتھ ہے۔“

”تو بر کریں میاں.....! اب کچھ اُناسیدھا نہ بول دیجئے گا۔“

اماں نے دہل کر ٹوکا تھا۔

”کیوں.....؟ ایمان خطرے میں پڑ جائے گا، یہی ناں.....؟ کیا کروں.....؟ کچھ بھی سوچ لوں، وقت کی دو طرفہ مار پڑے گی ہی۔“

اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ وہ بے آواز مگر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تو رابعہ کو گھٹنوں میں منہ چھپائے سسکتے دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے گیا۔  
”خدا کے لئے رابعہ! بندہ کی رو داؤ دھنا..... کیوں اپنے ساتھ سب کو پریشان کرتی ہو.....؟ کم از کم اماں ابا کا ہی خیال کرو۔“

”ان کا خیال کر کے ہی تو گھٹ گھٹ کر روتی ہوں۔ ورنہ دل تو چیخنے کو چاہتا ہے، اتنا چیخوں کہ آسمان کا کیچہ ہلا دوں۔“

رابعہ نے کہا تو اس کے اندر ڈھیروں کڑواہٹ نکل گئی۔

”آسمان تو قریشی ہے، اور قریشیوں کے کیچے نہیں ہوتے۔ وہ تو چیخنے والوں پر ہنسنے ہیں۔“  
”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

رابعہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”تم بھی کیا سوچتی ہوگی.....؟ میری وجہ سے تمہارا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔“

”فصل باتیں مت کرو.....! میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔“

وہ نظریں پڑا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”پھر کیا سوچتی ہو.....؟“

رابعہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم بتاؤ.....! تم کیا چاہتی ہو.....؟“

اس نے آنا پوچھا تو رابعہ چند لمحے رک کر بولی۔

”میں جانتی ہوں، اللہ کیچہ کیا کر دے کہ میرا گھر بھی بچ جائے اور تم بھی اسد کا لقمہ نہ بنو۔“

”اللہ ایسا ہی کرے گا۔ بس.....! تم ہمت نہ ہارو.....! اور دیکھو.....! اماں ابا بہت پریشان ہیں۔ تم پلیز.....! ان کا خیال کرو۔“

اس نے آخر میں منت سے کہا تو رابعہ بے بسی سے بولی۔

”میں کیا کروں.....؟ میں شوبی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اس کی آواز سننے ہوئے،

اسے دیکھتے ہوئے۔“

پھر اسے دیکھ کر بے چارگی سے پوچھنے لگی۔

”سنو.....! میں فون کروں عباد کو۔؟“

”تم.....؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کر لیتی ہوں ناں.....! جاؤ ٹیلی فون سیٹ یہیں لے آؤ۔ اماں ابا کو پتا نہ چلے۔“

رابعہ نے اتنی عاجزی سے التجا کی کہ وہ منع نہیں کر سکی، اور چپکے سے ٹیلی فون سیٹ لا کر رابعہ کو چھو دیا۔

رابعہ فوراً ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پھر دوسری طرف تیل جانے لگی تو اس نے جانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عباد کی آواز سننے ہی بے اختیار بولی تھی۔

”عباد.....! شوبی کیسا ہے.....؟“

”اوہ.....! تو تمہیں خیال آئی گیا شوبی کا.....؟“

ادھر وہ طفر سے بولا تھا۔

”مجھے ہر مل شوبی کا خیال ہے عباد.....! خدا کے لئے آپ اس معصوم بچے پر ظلم نہ کریں۔ اسے میرے پاس لے آئیں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

رابعہ اس ڈر سے جلدی جلدی بول رہی تھی کہ کہیں عباد فون بند نہ کر دے۔

”اچھا.....! شوبی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، تم رہ سکتی ہو شوبی کے بغیر.....؟“

عباد کے لہجے میں حد درجہ چہرہ تھی۔

”نہیں.....! میں نہیں رہ سکتی۔“

رابعہ سسک پڑی۔

”نہیں رہ سکتی تو اپنے اماں باوا سے کہو، ان کے سامنے گڑ گڑاؤ، میرا دماغ خراب مت کرو۔“

عباد نے یہ کہہ کر فون شیخ دیا تھا۔

”عباد.....! میری بات سنیں.....! عباد.....! عباد.....!“

رابعہ کرٹیل پر ہاتھ مار مار کر پکارنے لگی تو اس نے گھبرا کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”بس رابعہ.....! تم بھی دل پر پتھر رکھ لو۔“

☆☆☆☆

وہ آج خود بخود صبح گھر جانے کا سوچ کر آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا، لیکن گھر آ کر پتا چلا کہ سیما وہیں گئی ہوئی ہے تو وہ اس کے انتظار میں بچوں کے کمرے میں آ بیٹھا۔ دونوں بچے فونی اور ردا کا ٹونہ دیکھ رہے

”چاچو! ماما کہاں گئی ہیں؟“

ردائے نے دیکھ کر پوچھا تو اس سے پہلے نوٹی بول پڑا۔

”ماما، چاچو کے لئے چاچی دیکھنے گئی ہیں۔“

وہ نوٹی کی بات پر بے ساختہ سرکھڑا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا؟“

ردائے نوٹی سے پوچھا۔

”مجھے ماما بتایا تھا۔“

”جیس چاچو۔؟“

ردائے نوٹی کا جواب سن کر اس سے تصدیق چاہی تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”چائیں بیٹا! مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔“

جب ہی سہا کے آنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ اکیلی گئی تھیں بھابی۔؟“

”نہیں! احسانا تھی۔ واپسی میں پہلے اسے گھر چھوڑا، اس لئے کچھ دیر ہو گئی۔“

سیما سے جواب دے کر بچوں سے مخاطب ہوئی۔

”چلو بچو! اشام کا وقت ہے، ذرا تازہ ہوا میں سانس لو، اور دیکھو! لڑائیں، چلو شہاش!۔“

”ماما! ہم چاچو کے ساتھ کس کس کھانے جائیں گے۔“

نوٹی نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”ہاں ہاں! اے چلوں گا، ابھی جاؤ درابا ہر کیلیو!۔“

”آپ بھی آئیں ناں چاچو۔!“

ردا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”میں آ رہا ہوں بیٹا! آپ چلو، میں آ رہا ہوں۔“

اسے خولہ صاحب کے ہاں کا احوال جاننے کی جلدی تھی۔ بڑی مشکل سے بچوں کو بھیج کر سیما کو دیکھا تو

وہ پوچھنے لگی۔

”تمہارے بھائی کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”اچھا! میں انہیں جانے دے آؤں۔“

سیما تصدق سے زچ کر رہی تھی۔

”پلیز بھابی!۔“

اس نے سیما کا راستہ روک لیا۔

”پہلے میرے حال پر دم کریں۔ مجھے بتائیں کیا کیا خولہ صاحب نے۔؟“

”خولہ صاحب تو ملے ہی نہیں، اور ان کی بیگم نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پوچھنے پر ٹال گئیں۔“

”پتا نہیں کیا سوچ رہے ہیں وہ لوگ۔؟“

سیما بے زاری سے بتاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ وہ نا سمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ تب سیما سے

بھینے کا اشارہ کر کے کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے دانیال! خولہ صاحب کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ آج ان کے گھر میں بڑی ٹینشن

محسوس ہو رہی تھی۔“

”کیسی ٹینشن۔؟“

وہ غصہ کا تھا۔

”اب یہ تو مجھے نہیں پتا، خبر! ہو گا کوئی گھریلو مسئلہ۔ لیکن۔۔“

وہ تصدق آمیز خاموش ہو گئی۔ مقصد دانیال کو شک میں مبتلا کرنا تھا۔

”لیکن کیا بھابی۔؟“

”لیکن یہ کہ انہیں مجھ سے تو ٹھیک طرح سے بات کرنی چاہئے تھی۔ یہی کہہ دیتیں بیگم خولہ کہ وہ

تمہارے رشتے پر غور کر رہے ہیں مگر کچھ بھی نہیں کہا انہوں نے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کا ذہن کام نہیں کر رہا اسی

سے میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔“

وہ سیما کی بات سن کر سوجھ میں پڑ گیا تھا۔

”کیا بات ہو سکتی ہے بھابی۔؟“

”ہوگی کوئی بات! لیکن تم دیکھو ناں دانیال! مسائل کہاں نہیں ہیں۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی

نٹلو ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس ایک مسئلے کو لے کر بیٹھے رہیں، باقی سارے کام چھوڑ

دیں۔؟ سب کا ساتھ ساتھ رہیں چلتے ہیں بھائی!۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی! میں پوچھوں گا ثانیہ سے۔“

دوسری بات وہ بے دھیانی میں کہہ گیا تھا۔

”جیس۔؟ ثانیہ سے کیا پوچھو گے۔؟“

سیما قدرے پکرا لئی تھی۔

”کچھ نہیں..... آپ نے ٹینشن لیں۔ جائیں بھائی کو چائے وغیرہ چلائیں۔ میں بھی بچوں کو پا کر لے کر جا رہا ہوں۔“

وہ اچانک کچھ سوچ کر ٹکلت میں کمرے سے نکلا اور نوٹی کو پا کر پکارتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا۔ پھر پہلے اس نے بچوں کو آٹس کریم دلائی، اس کے بعد گاڑی خولید صاحب کے گیٹ پر روک کر بچوں کو آرام سے آٹس کریم کھانے کی تاکید کرتے ہوئے گاڑی سے اتر آیا اور ڈور تیل پش کرتے ہوئے اسی بکے خیال تھا کہ دروازہ خولید صاحب ہی کھولیں گے۔ اس لئے وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے دوبارہ پش پراٹگی رکھی، دروازہ کھلنے کے ساتھ ایک پل کو ٹائیڈ کا چہرہ نمودار ہوا اور نوٹ دروازہ بند ہو گیا۔

غائبانہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جبکہ وہ نہ صرف حیران بلکہ انفس سے بند دروازے کو دیکھ گیا۔ پھر اچانک دوسری طرف ٹائیڈ کی موجودگی محسوس کر کے دروازے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

”میں جانتا ہوں ٹائیڈ..... تم یہاں موجود ہو۔ مجھے بتاؤ..... کیا تم نے گھر کی طرح اپنے دل کا دروازہ بھی مجھ پر بند کر دیا ہے۔؟“

”نہیں.....!“

ٹائیڈ نے تڑپ کر دروازہ کھولا تھا۔

”نہیں دانیال.....! میں..... بس ابھی آپ سے بات نہیں کر سکتی۔ آپ پلیز..... پلے جائیں یہاں سے۔“

”یوں نہیں جاؤں گا۔ جب تک تم کچھ بتاؤ گی نہیں۔“

وہ ٹپٹی میں سر ہلا کر بولا۔

”کیا بتاؤں.....؟ جب مجھے خوشنہیں پتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔؟“

ٹائیڈ کے بے بسی پر وہ مزید ٹھک گیا۔

”کیا ہونے والا ہے۔؟“

”میں نے کہا ناں.....! مجھے کچھ نہیں پتا۔ آپ پلیز.....! ابھی اس وقت پلے جائیں۔“

ٹائیڈ نے منت سے کہا، پھر گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا تو وہ اس کی مجبوری سمجھ کر بولا۔

”چلا جاؤں گا، لیکن پہلے پلے کا وعدہ کرو۔“

”نہیں دانیال.....! میں پلے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو ٹھیک ہے.....! میں اندر آتا جاؤں۔“

اس نے کہنے کے ساتھ قدم اگے بڑھا یا تھا کہ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”خدا کے لئے دانیال.....! آپ مجھے کیوں نہیں ہیں.....؟ آپ کا اس وقت آنا ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ ہونٹ بھیج کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ عاجزی سے بولی۔

”پلیز.....! مجھ سے منہ نہ موڑیں دانیال.....! میں آپ کی ناراضگی نہیں سہہ سکتی۔“

وہ پھر اسے دیکھنے لگا، بولا کچھ نہیں۔

”م..... میں آؤں گی، جہاں آپ کہیں گے، وہیں آؤں گی۔“

وہ بارگئی۔

”تو پھر کل وہیں ملتے ہیں، جہاں پہلے ملتے تھے۔“

وہ یہ کہہ کر کانٹا نہیں، تیزی سے پلٹ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر وہ ایک دم گھر کی ہو کر رہ گئی اور کیونکہ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، اس لئے امی نے بڑے بھیا اور بھائی کو بھی ادھر ہی بلا لیا تھا۔ وہ سارا دن بچوں کے ساتھ مصروف رہتی کیونکہ اور کوئی کام امی کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کا اور بھائی کا بھی کہنا تھا کہ اب اپنے گھر جا کر ہی ہانڈی چولہا کرنا۔ گھر میں ایک خوشگوار سی پچھلی جگہ تھی۔ بس کسی کسی وقت چھوٹے بھیا کوئی نیا شوشہ چھوڑ کر بدرمچی پیدا کر دیتے ورنہ سب ہی خوش اور مگن سے تھے۔ پھر یوں ہی تیاریوں میں دن گزرتے پتا نہیں نہیں چلا اور وہ جہانزیب کی ہمراہی میں باہل کی دہلیز پار کر آئی۔

جہانزیب کی بینٹیں اسے جلد عروسی تک لانی تھیں، پھر پہلے اسے نرسے سے سنوارا، پھر کچھ ریسیں اوٹیں۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سب کمرے سے نکل گئیں تو تباہی ملتے ہی اس نے ان کی ہونٹیں کرکریدھا کرنے کی غرض سے بیڑی پشت سے ٹیک لگائی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور جس زاویے سے روشنی تھی، اس کی بائیں طرف بڑی دیوار گیر الماری تھی اور اسی طرف دیواری کی آخری حد کے پاس غالباً آٹھ تھہ تھا اور ابھی اس کی نظریں سامنے ٹھک رہی تھیں کہ دروازے سے باہر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جلدی سے دیوڑھی ہونٹیں اور زارتار آجیل آگے تک بھیج کر سرخمی چھکا لیا، پھر قدموں کی آواز کے ساتھ ہی دھڑکنے، ہم آہنگ ہو گئیں۔

”السلام علیکم.....!“

جہانزیب نے پہلے سلام کیا پھر کچھ دیر رک کر قریب بیٹھے ہوئے اس کے چہرے سے آنکھیں سرکا دیا۔

اباشہ وہ حسین نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنے والدین کی پسند کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنے اندر ڈھیروں اطمینان بھی اترتا محسوس کیا، ورنہ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ خاصے مضطرب سے تھے۔

”چاہنیہ.....!“

ان کے پکارنے پر اس نے ذرا سی آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ان پر نظر پڑتے ہی آپ ہی آپ نہ صرف

آ نکھیں چیل گئیں بلکہ ہونٹ بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔

”ارے! آپ تو یوں حیران ہو رہی ہیں، جیسے پہلی بار مجھے دیکھا ہو۔“

وہ ڈرا سا ہنس کر بولے تو وہ باوجود کوشش کے نہ نکلیں جھکا سکی نہ سر۔ حیرت کا مقام تو تھا اور اسے اپنی بصارتوں پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ غلطی سے یہاں آ گئی ہے یا سامنے بیٹھا شخص۔

”جنگی نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ بہت خاموشی سے میرا دیدار کرتی تھیں۔“

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تو وہ چونکی، ساتھ ہی جنگی کی بات یاد آئی۔

”پتا نہیں کس کو دیکھ آئی ہو۔؟“

”نہیں! میں نے اس کا نام پوچھا تھا اور وہ جہاز زیب تھا۔“

اس نے یقین سے کہا تھا اور اب یہ سوچنے کو عمر پڑی تھی کہ اگر یہ جہاز زیب ہیں تو وہ کون تھا جسے اپنا کچھ کر اس نے دل میں جگہ دی تھی اور اب اس کی حالت اس مسافر کی تھی جو منزل پر آ کے بھٹکا ہو۔

ابھی کچھ دیر پہلے کی ساری کیفیات آن کی آن میں رخصت ہو گئی تھیں۔ نہ آنکھوں میں خوار ہ نہ دلیوں پر مسکان، دل جو دھڑلے پر دھڑک رہا تھا، وہ الگ ڈھانپا دینے لگا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان محبتوں کو کیسے محسوس کرے؟

”جب آپ وہاں تک آئی تھیں تو مجھ سے ملیں کیوں نہیں؟“

انہوں نے دھجے لگے میں بار بار اٹھو کیا تو اس نے محض اپنے چکراتے سر کو سہارا دینے کی خاطر حوضی گھٹنوں پر ٹکائی۔ اس کے بعد وہ پتا نہیں کیا کچھ کہتے رہے، وہ ڈھنگ سے کوئی بات نہیں سن سکی، کیونکہ اندر ایک محشر برپا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں آتے جاتے اماں بار بار راجہ کو دیکھ رہی تھیں جو پچھلے دو تین دن سے بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ گم سم بیٹھی تھی۔ اماں کو بول اٹھنے لگا۔ آخر اس کے پاس آ بیٹھیں اور نرمی سے گویا ہوئیں۔

”بیٹا! تم تو ہمیشہ سے بہت صابر ہو۔ کچھ دن اور صبر کر لو۔! اللہ کوئی راستہ نکال دے گا۔“

”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں اماں؟“

راجہ بے چارگی سے بولی تھی۔

”تمہاری چپ زیادہ تکلیف دے رہی ہے مجھے، کچھ بولو! خود کو کسی کام میں مصروف کرو۔ سارا وقت ایک ہی خیال میں رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”نہیں پڑتی بیمار، آپ فکر نہ کریں۔“

”ارے! کیسے فکر نہ کروں؟ میری جان کو تو سونگہیں لگی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟“

اور وہ انیال کے بھائی بھانج جواب مانگ رہے ہیں۔

اماں نے کہا تو راجہ چونک پڑی۔

”تو اماں! آپ نے انہیں کیوں لٹکا رکھا ہے؟ اگر آپ اور ابا مطمئن ہیں تو بات بچی کر دیں

ناں ڈائیگی۔“

”تمہارے ابا نہیں مان رہے۔ کہہ رہے تھے، پہلے تمہارا معاملہ ٹھیک ہو جائے، پھر مانیہ کا سوچیں گے۔“

اماں نے بتایا تو وہ پریشانی سے بولی۔

”کیوں اماں! اس طرح تو بات خراب ہو سکتی ہے۔“

”اللہ مانگ ہے۔ اس نے مانیہ کے نصیب میں جو لکھا ہوگا، اسے وہی ملے گا۔“

اماں نے گہری سانس کے ساتھ کہا تو وہ ڈکھ سے بولی۔

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اماں! جب یہ طے ہے کہ جو ہمارے نصیب میں لکھا ہوگا، وہی ہمیں

ملے گا تو پھر آپ روتی کیوں ہیں؟“

”ہم نصیب کے کٹھنے کو نہیں روتے بیٹا! ہمیں اولاد کی محبت ملاتی ہے۔“

اماں یہ کہہ کر خود ہی ہنستا میں، پھر کہنے لگیں۔

”مائن حق ہوتی تمہاری مانتا بھی اپنے بچے کے لئے تڑپتی ہے۔ تمہارے ابا کو بھی احساس ہے، جب

ہی تو۔۔۔۔۔“

”کیا جب ہی تو۔۔۔۔۔ تاں اماں!۔۔۔۔۔“

راجہ نے اماں کا خاموش ہو جانا محسوس کیا تھا۔

”کچھ نہیں بیٹا! میں تو۔۔۔۔۔“

اماں بات بتانے جاری تھیں کہ خواجہ صاحب کی آواز سن کر انہیں اٹھنے کا موقع مل گیا۔

”لو! تمہارے ابا آ گئے۔“

وہ راجہ کو سوالیہ نشان بنے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ خواجہ صاحب سر جھکا کر بیٹھے طحال نظر آ

رہے تھے۔

”کیا ہوا میاں!؟ خیریت تو ہے۔؟“

اماں نے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”ہاں!“



خوبصاحب ”ہاں“ کو لہجہ سچ کر بولے۔  
”میں عباد سے ملنے اس کے آفس گیا تھا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔“  
”پھر؟“

”میرا خیال تھا میں عباد کو سمجھا لوں گا، اسے اس کی بیوی اور بچے کا احساس دلاؤں گا، اور میں نے ایسی ہی ممکن کوشش کی، لیکن وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتا چاہتا۔“  
خوبصاحب مایوسی سے سر ہلانے لگے۔  
”کیا کہتا ہے؟“

اماں نے پیٹھ سے دل کے ساتھ پوچھا۔  
”وہی جو اس کی ماں کی ضد ہے۔ اُنکا مجھے سمجھانے بیٹھ گیا کہ میری دونوں بیٹیاں ایک ہی گھر میں رہیں گی، ایک دوسرے کا ڈھکھکھ تھیں گی۔“  
خوبصاحب نے بتایا تو اماں ناگواری سے بولیں۔  
”ڈھکھ ہی ڈھکھ! اسکے کہاں ہے اس گھر میں.....؟ می ہم ایک بیٹی کے لئے پریشان ہیں، پھر دونوں کے لئے ٹوہیں گے۔“

”شاید ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔“  
خوبصاحب نے کہا تو اماں ایک دم پریشان ہو گئیں۔  
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میاں.....؟ کہیں آپ ثانیہ کے لئے ہامی تو نہیں بھرتے.....؟“  
”نہیں.....! ہامی تو نہیں بھری، البتہ یہ کہہ آیا ہوں کہ پہلے اسد کی کام سے لگے، پھر میں سوچوں گا۔“  
خوبصاحب دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ پھر اماں کو دیکھ کر ان سے زیادہ شاید خود کو تلی دی تھی۔  
”ہو سکتا ہے بیگم.....! کام کاغ سے لگ کر لڑکا سدھر جائے.....؟ ہمیں رابعہ کو بھی تو دیکھنا ہے۔“  
”وہ تو ٹھیک ہے میاں.....! اور ادھر جو دانیال کا رشتہ آیا ہوا ہے، کیا انہیں منع کر دوں.....؟“

اماں نے پوچھا تو خوبصاحب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔  
”ایک بات کہوں میاں.....؟“  
”نہیں.....! ابھی کچھ مت کہو۔! میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ ثانیہ سے کہو ٹھنڈا پانی لے آئے“  
”گلو کو ملا کر۔“

”ثانیہ تو اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہے، میں خود ہی لاتی ہوں۔“  
اماں یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ گئی تھیں۔

وہ اماں سے سہیلی کے گھر کا بہانہ کر کے دانیال سے کیا ہوا وعدہ نبھانے آئی تھی، اور اصولاً تو دانیال کو پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا کہ اسے نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی۔ دل تو چاہا تو راپس چلی گئے۔ کیونکہ ریسٹورینٹ میں اکیلے بیٹھنا اسے مشتعل بناتا ہی رہا تھا، وہ خود بہت خائف ہو رہی تھی۔ پھر بھی خود پر جبر کر کے اس نے چند رومٹ انتظار کیا۔ پھر لوگوں کی گھورتی نظروں سے گھبرا کر وہاں سے نکل آئی۔  
اسے دانیال پر غصہ آ رہا تھا اور وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کہیں دانیال نے جان بوجھ کر تو اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا.....؟ کچھ بھی تھا، وہ گھر آئی تو اس کی رنگت اُڑی ہوئی تھی۔ جب ہی رابعہ نے تشویش سے پوچھا تھا۔  
”کیا ہوا ٹائی.....؟ کہاں سے آ رہی ہو.....؟“

”کہاں سے کیا مطلب.....؟“  
”وہ گھبراہٹ چھپانے کو تھی۔“  
”مطلب کہیں کئی تھیں کیا.....؟“  
”ہاں.....! اپنی پہلی فرزند کے گھر گئی تھی، وہیں سے آ رہی ہوں۔“  
اس نے بتایا تو رابعہ خاموش ہو گئی، لیکن اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکی۔  
”تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟ میں اماں سے پوچھ کر گئی تھی۔“  
یہ اس کے دل کا چور تھا۔

”ہاں.....! ظاہر ہے، پوچھ کر ہی گئی ہوگی، اور شاید اماں نے مجھے بتایا بھی تھا، میں ہی بھول گئی۔“  
رابعہ نے کہا تو وہ فوراً بولی۔  
”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے رابعہ.....! تم جن حالات سے گزر رہی ہو، اس میں ایتھے اچھوں کو اپنا آپ پائی نہیں رہتا۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“  
رابعہ آزر دگی میں گھر گئی۔

”مت اتنا سوچا کرو۔ جب عباد بھائی کو احساس نہیں ہے تو تم کیوں گلوحتی ہو.....؟“  
اس نے کہا، جب ہی اماں کے پکارنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی تو اماں تسلی سے آٹا نکالے کھڑی تھیں۔  
”آپ ہٹ جائیں اماں.....! میں کر لوں گی۔“

اس نے اماں کو زبردستی اندر بھیج دیا اور پھر رات کے کھانے تک وہ کچن میں مصروف رہی۔ اصل میں تو وہ تہا کی چاہ رہی تھی۔ گوکہ ذہن یکسو نہیں تھا، دل بھی خدشوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ہر سوچ کا اختتام اس بات پر ہوتا کہ

دانیال آیا کیوں نہیں؟

”اس کے ساتھ تو کوئی مجبوری نہیں ہو سکتی؟“

اور خود سے قیاس کرتے ہوئے یہ وہ حدشوں میں گھر گئی تھی۔ پھر وہ سونے کے لئے ہی کمرے میں آئی تھی۔ رابعہ شاید اماں کے کمرے میں تھی۔ اس نے شکر کیا اور لیتنے ہی شکے میں منہ چھپا کر سوئی بن گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رابعہ کمرے میں آئی اور اسے منہ چھپانے کے لئے دیکھ کر حیرت سے بولی تھی۔

”ہیں؟ تم آتی جلدی سو رہی ہو؟“

اس نے جواب نہیں دیا تو رابعہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”مجھے پتا ہے، تم جاگ رہی ہو۔“

وہ ہنسی بٹھا کر رابعہ کو دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ میرا مطلب ہے، کوئی بات ہوئی ہے تو بتاؤ۔“

رابعہ نے ٹوکا تو وہ نظریں چرا کر بولی۔

”نہیں! کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”کم از کم مجھ سے تو مت چھپاؤ۔“

”میں کچھ نہیں چھپا رہی۔“

اس نے پھر کلیہ منہ پر رکھنا چاہا کہ رابعہ نے نکتہ کیسی کھینچ کر چپک دیا۔

”دیکھو! اتنا تو میں جان چلی ہوں کہ تم پریشان ہو سنا۔ میں جب تم اپنی پہلی کے پاس سے آتی تھی تو

اس وقت تمہارا چہرہ اتر ہوا تھا۔ کیا وہاں کوئی بات ہوئی ہے؟“

”نہیں! میں پہلی کے کھر نہیں گئی تھی۔“

اس کے منہ سے بلا ارادہ سچ نکل گیا تھا، جس پر وہ گہرا ہی گئی۔

”پھر؟“

رابعہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ تیز بزم ہو کر بولی۔

”میں دانیال سے ملنے گئی تھی۔“

”دانیال سے؟ اس کے گھر گئی تھی کیا؟“

رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں! ہمیں کہیں اور ملنا تھا، لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

رابعہ نے فوراً ٹوکا۔

”بس! وہ دانیال نہیں آئے۔ میرا مطلب ہے، دانیال کے آنے سے پہلے ہی میں وہاں آ گئی۔ مجھے مجھے ڈر لگ رہا تھا، اس لئے میں نے ان کا انتظار نہیں کیا۔“

وہ دھڑک کر بول رہی تھی۔

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ اگر تم جانتے ہوئے مجھے بتا دیتی تو خود تمہارے اندر کوئی فزس آ جاتا۔“

رابعہ نے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں، آئندہ آزاد کیٹنا۔“

رابعہ نے مسکرا کر اس کی ٹھوڑی ہلانے کی تو اس نے بازو میں چہرہ چھپا لیا۔

☆☆☆☆

اسے آج پہلی بار سہا پر غصہ آ رہا تھا، جس نے تین اس وقت جب وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹائیپ سے ملنے جا رہا تھا، تو تیسرا نے بچوں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ دونوں بچے آنکھ پر جانے کے لئے چل گئے تھے۔ ردا تو باقاعدہ روئے گئی تھی۔ اس نے لاکھ کہا کہ وہ ایک ضروری میٹنگ میں جا رہا ہے، آدھے گھنٹے میں واپس آ کر بچوں کو لے جائے گا، لیکن سہا نے بھی اس کی ایک نہیں سنی۔ یوں سر پہلے کر پیٹھ گئی تھی جیسے بچوں نے اسے عاجز کر دیا ہو، اور اس سے یہ کہا کہ بچے گاڑی میں ہی بیٹھ رہیں گے تم انہیں لے جاؤ۔

اور پھر جاتے جاتے حنا بھی ساتھ چل پڑی تھی۔ جب ہی پھر وہ ٹائیپ کے پاس جانے کا سوچ بھی نہیں سکا، لیکن پریشان ضرور تھا۔ زیادہ پریشان ٹائیپ کی طرف سے تھی کہ اسے نہ پا کر وہ کتنی پریشان ہوگی؟ ایک تو اس لڑکی کو گھر کی طرف سے میل فون رکھنے کی اجازت نہیں تھی، جو وہ اس سے رابطہ کر کے معذرت کرتا، بلکہ اسے گھر سے نکلنے سے ہی روک دیتا، اور کسی اور دن پر رکھ لیتا۔

بہر حال وہ بری طرح پھنس گیا تھا، اور جب واپس آیا تو اس کا موزڈخت آف تھا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ پھر پیٹھ کے کانبر ڈاکل کیا اور کتنی بار رٹائی کرنے کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”آئی ایم سو ری ٹائیپ۔“

وہ چھوٹے ہی بولا تھا۔

”مجھے احساس ہے، ہم کتنی پریشان ہوئی ہوگی، لیکن میں کیا کرتا؟ یہاں بھابی کے ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔“

”اگر ایسا تھا تو آپ پہلے مجھے فون کر دیتے، میں گھر سے نکلتی ہی نہ۔“

”نہیں تو.....!“

”میرا مطلب ہے، میں یہاں خوش ہوں۔“

وہ جتانے والے انداز سے ہلکے کرکٹ بدل گئے اور وہ اپنی جگہ سے ہونگی، اور یہاں آئے کے بعد سے اس نے ایک بار بھی لمٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنی ساری کوششیں اس بات پر صرف کرتی رہی تھیں کہ کسی غیر نہ ہو کہ وہ انجانے میں سختی بڑی غلطی کرتی تھی۔ لیکن ابھی جائز یہ ہے جس طرح جتایا تھا، اس سے اسے اپنی کوششیں راہ لگائیں جانی لگیں، اور پہلی بار گزیرے حالات اس کی نگاہ میں ہوئے آئے۔

آخر میں کتنی دیر تک وہ اسی پنج پر سوچتی رہی، لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ یہ ضرور جان گئی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی شخصیت کے اسرار سمیت اب بھی اس کے اندر موجود ہے۔

وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔

”وہ یقیناً کوئی شاطر تھا، جس نے میری بے خبری سے فائدہ اٹھایا۔ محض وقت گزاری کے لئے اس خوب صورتی سے محبت کی آنکھ بھولی کھلتا رہا کہ مجھے کبھی شک نہیں ہوا کہ وہ جہاز زیب نہیں ہو سکتا۔“

اس کے پارے میں سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں نے بلا ارادہ اس نام کو چھوا تھا اور جہانزیب جیسے متحیرتے فلور آلیٹ کر دیکھنے لگے۔

ان کے لومحنے بروہ جونگی۔

اس کے ساتھ ہی اگر وہ بدلے کی بات چاہتا ہے تو اس کے لئے۔

رات کو کہ وہ تہیہ کر کے سوئی تھی کہ آئندہ جہانزیب کو شکایت کا موقع نہیں دیے گا، اس کو کوشش ہو، جو وہ دُوری طور پر اپنے انداز میں گھر کے افراد پر بھی بے تکلفی سے اپنایا تھا۔ بس اتنا ہوا کہ بچے نے ڈانٹنگ فیمل تک اس کی کئی چٹا لگا ڈالے۔ یہ ایک طرح سے آپ کے آپ کو مصروفِ ظاہر کرنے کی غیر شعوری کوشش تھی، جیسے اس کے اس بات کرنے کے لئے وقت نہ ہو۔ جہانزیب نے بہت خاموشی سے اس کا جائزہ لیا اور اس کے انداز

اس نے کہا، پھر ادھر اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھنے لگا۔

وہ ابھی بھی خاموش تھی۔

”معاف کرو یا ر.....! دیکھو.....! میں کان پکڑ رہا ہوں۔ آئندہ تم سرحد کو مزہ ہوگا۔“

”اے کام چھوڑ دوں گا۔“

وہا قاعدہ کان یکڑ کر ہوا تھا۔

“وعلى.....؟”

”کاوو و..... ال تو تاراض نہیں جانتا۔“

کے زعفرانی دھبے کہ کچھ اچھے نہیں تھے۔

میں پہلے بھی اسے افسوس نہ تھا کہ اسے کچھ نہ تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی باتوں سے متاثر ہو کر

مختار: کہ میں نے کبھی نہیں سنا ہے۔

ہفتے پر پہلے بھجوا دیا، پھر

پھر ابتدائی دنوں میں اس کی غیر معمولی خاموشی کو کسی نے یوں زیادہ محسوس نہیں کیا کہ سب اسے فطری شرم پر محمول کرتے رہے تھے، لیکن جب اس دورے سے نکل کر بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو اب سب کو حیرت ہوئی۔

سب سے پہلے جہانزیب نے محسوس کیا اور اس انداز میں ٹوکا۔

کیا تم گونگے بہروں کے اسکول میں پڑھاتی تھیں.....؟“

“ہیں.....!”

خیر ان ہوئی۔

۱۱ "میں نے یہ سب کچھ تم سے نہیں سیکھا تھا کہ ایک اچھے شخص کی طرح"

ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ ہم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔

تسہیلہ: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کئی کئی دلائل دیئے ہیں۔

"I have been thinking about you a lot lately."

”کہا ہے..... تم اتنا کھینچ کھینچ کر کاہتے رہو۔“

سے یہی سمجھے کہ وہ رات کی کسی بات سے خفا ہے اور اس وقت تو نہیں، البتہ شام میں جلانی کے طور پر اسے گھمانے لگے۔ اصل میں وہ خود خفا سے متعلق جو تھے، اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ان کے درمیان کوئی رنجش ہو جس کی خبر گھر والوں کو بھی ہو جائے۔

غالباً رات تم نے میرے رویے کو یہ صرف محسوس کیا بلکہ مائنڈ بھی کیا۔

راستے میں وہ اس سے کہنے لگے۔

”نہیں تو.....! آپ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جسے میں مائنڈ کرتی۔“

”پھر تم خفا کیوں ہو.....؟“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں خفا ہوں.....؟“

انہوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر اپنی کہنے لگے۔

”اجمل میں، میں نے بہت روکھی پھینکی زندگی گزاری ہے۔ زمانہ طالب علمی میں کالج تک میری صرف کتابوں سے دوستی رہی، البتہ یونیورسٹی میں زویب کے ساتھ تھوڑی بہت دوستی ہو گئی تھی، حالانکہ ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یعنی میں جتنا خشک، وہ اتنا ہی رنگین مزاج تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ دو سال تک ساتھ رہنے کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول نہیں کیا۔“

قدّر سے تو وقت کے بدلے کہنے لگے۔

”وہ اکثر مجھے سمجھانے اور پھر قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ میرے ضمیر سے ہوئے مزاج کے ساتھ کوئی لڑکی زیادہ عرصہ تک سمجھوتہ بھی نہیں کر سکتی۔ اس کا کہنا تھا کہ میری بیوی مجھ سے متنفر نہیں تو میرے ساتھ خوش بھی نہیں رہے گی۔“

وہ ایک دم سناٹوں میں گھر گئی، جبکہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ پتا نہیں اب آگے وہ کیا کہیں گے.....؟

”وہ نہیں جانتا جانیہ.....! کہ تم میرے ساتھ خوش ہو یا نہیں، کیونکہ اب تک تمہارے کسی انداز سے کوئی اظہار نہیں ہوا۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں خوشی کا حقدور اسارے شہر میں بیٹھتی چھروں.....؟“

وہ سنبھل کر بولی۔

”نہیں.....!“

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ کم از کم میرے سامنے اظہار کرو، ورنہ میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ جیسے زویب ٹھیک کہتا تھا۔

”گو کہ تمہارے انداز میں تنفر نہیں ہے، لیکن وہی بات کہ متنفر نہیں تو خوش بھی نہیں۔“

پھر اپنے آپ پر الزام رکھتے ہوئے بولے۔

”ویسے میں خود بھی بہت اناڑی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ بیوی کو خوش کیسے رکھا جا تا ہے۔“

”آپ نہ تو اناڑی ہیں اور نہ ہی نادان، اس کے برعکس بات صرف اتنی ہی ہے کہ زویب کی باتیں آپ

لہا ہن کے کسی گوشے میں جم کر رہ گئی ہیں، اور اب ان ہی کی روشنی میں آپ مجھے دیکھنے اور پرکھنے لگے ہیں۔“

اس نے بڑی خوب صورتی سے ان کا نفسیاتی تجربہ کیا اور وہ قائل ہو کر بولے۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”شاید نہیں، یقیناً.....!“

پھر اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”میں کچھ سیکڑیں لپٹا چاہتی ہوں۔“

”مردور.....!“

انہوں نے ایک بک اسٹال کے سامنے گاڑی روک دی، پھر اس سے پوچھنے لگے۔

”میں لے آؤں یا.....؟“

”آپ لے آئیں۔“

اس نے کہا تو وہ گاڑی بند کر کے اتر گئے۔

”میرے خدا.....!“

اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔

”ابھی تو اس زندگی کی ابتداء ہے اور ابھی سے جہاز زویب سے سوچنے لگے ہیں کہ میں ان کے ساتھ خوش

ہوں یا نہیں.....؟ آخر انہیں میری طرف سے یہ شب یا خدشہ کیوں ہے.....؟“

”جانیہ.....!“

اپنے نام پر اس نے چونک کر دیکھا اور بس دیکھنے کی حد تک ہی اس میں زندگی کی رقص رہ گئی تھی۔

”میری طرف اپنی گاڑی کے شیشے میں سے سر نکال کر اسے پکارنے والا وہی تھا جو پورے ایک سال تک جہاز زویب بن

اٹھ اس کے ساتھ محبت کی آنکھ پھولی کھلتا رہا تھا۔

”کبھی ہو جانیہ.....؟ اور تم کہاں چلی گئی ہو.....؟ میں اس روز سے مسلسل تمہیں رہ گ کر رہا ہوں، لیکن

تمہاری آواز سنائی نہیں دیتی۔ سنو.....! اگل میں تمہیں فون کروں گا۔ پلیز.....! میری بات سن لینا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی بڑھا لے گیا۔ اب سامنے فریک روڈ دوں تھی، لیکن اس کا ذہن اس حد

تک ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ پھر بھی اسی طرح بے حس بیٹھی رہی۔

”بس.....! یہی سیکڑیں ہیں۔“

جہانزیب آکر بیٹھے اور اس کی گود میں میگزین ڈال کر کہا تو وہ چمکی نہیں، بس ذرا سا نظروں کا زوایہ بدل کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کچھ اور لیتا ہے۔؟“

انہوں نے سرسری نظر اس پر ڈال کر پوچھا جب اس نے چونک کر پہلے اپنے اطراف نظر ڈالی پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں!“

”کمال ہے۔۔۔۔۔! میں نے تو سنا تھا، بیویاں شوہروں کی جیب خالی کرانے میں ماسٹر ہوتی ہیں۔“

”یہ بات آپ سے زوہیب نے کہی ہوگی۔۔۔۔۔؟“

وہ بے ساختہ زور سے ہنسنے لگا۔

”زوہیب نے بعد میں کہی تھی، پہلے میں نے کہیں پڑھی تھی۔“

پھر احتیاط سے گاڑی ریورس کرنے لگے۔ اس کے بعد شفاف سڑک پر آئے تو کہنے لگے۔

”بہت دلچسپ آڈی ہے زوہیب، میں تمہیں اس سے ملواناں گا، اور ہاں۔۔۔۔۔! اب گھر چلو گی۔۔۔۔۔!“

”گھر چلیں۔۔۔۔۔!“

”اگر اپنی امی کی طرف جانا چاہو تو۔۔۔۔۔“

”امی کی طرف۔۔۔۔۔؟“

اس کا ذہن بھٹک گیا۔

”میں کل تمہیں فون کروں گا، پلیز۔۔۔۔۔! میری بات سن لیتا۔“

”چلیں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔!“

وہ سنبھل کر بولی۔

”میرا مطلب ہے بھل چلیں گے۔ صبح آفس جاتے ہوئے آپ مجھے وہاں مجھے چھوڑ دیجئے گا اور پھر

واپسی میں، میں آپ کے ساتھ آجھی جاؤں گی۔“

”اچھی بات ہے۔“

انہوں نے گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راہد کو کوکہ اپنے بچے کے بغیر کسی بل چین نہیں تھا، لیکن اب اماں ابا کی پریشانی کا خیال کر کے وہ خود پر

جبر کرنے لگی تھی۔ گھر کے کام چارج میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس وقت اماں کو سبزی کانٹے دیکھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے بولی۔

”آپ رہنے دیں اماں۔۔۔۔۔! میں کرلوں گی۔“

”ارے بیٹا۔۔۔۔۔! فارغ نہیں بیٹھا جاتا مجھ سے۔ اللہ بخشے! تمہاری دادی کہتی تھیں، بہو۔۔۔۔۔! تم

ایک دن کے لئے میکے جاتی ہو تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔“

اماں شاید ابھی اس وقت کو سوچ رہی تھیں، ان کے چہرے پر گئے دنوں کا عکس جھلکارا ہوا تھا۔

”مجھے یاد ہیں دادی، بہت پیار کرتی تھیں ماں مجھ سے۔۔۔۔۔؟“

راہد کو دادی یاد آگئیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔! سارا پیارا انہوں نے تم پر ہی تولٹا یا، ہاں ذیوق۔۔۔۔۔“

ڈور تیل بجھنے سے اماں کی بات آدھوری رہ گئی۔

”میں دیکھتی ہوں اماں۔۔۔۔۔!“

راہد کو شے گئی کہ اماں نے روک دیا۔

”ارے نہیں۔۔۔۔۔! تم بیٹھی رہو۔ اس وقت پتا نہیں کون آیا ہے۔۔۔۔۔؟“

اماں کہتے ہوئے اٹھ گئیں اور دروازہ کھولا تو آگے راہد کی ساس بول بیگم کھڑی تھیں۔

”آئیے بہن۔۔۔۔۔! آپ تو ادھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔“

اماں بے مشکل اپنی ناگواری چھپا سکی تھیں۔

”ارے۔۔۔۔۔! میں تو کب سے آنا چاہ رہی تھی۔“

جول بیگم دھڑلے سے اندر آتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”راہد کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

”بیمیں ہے، آپ بیٹھیں۔۔۔۔۔! میں پانی لاتی ہوں۔“

اماں نے کہا تو وہ فوراً ان کا بازو دھام کر بولیں۔

”آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں۔۔۔۔۔؟ راہد کو بلائیں، وہ لے آئے گی پانی، آپ بیٹھیں میرے

پاس۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔!“

اماں ناچار بیٹھ گئیں تو جول بیگم چادر میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکال کر انہیں تھمتاے ہوئے بولیں۔

”یہ لیجئے۔۔۔۔۔! خوش خبری لائی ہوں آپ کے لئے۔“

”کیسی خوش خبری۔۔۔۔۔؟“

اماں ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”میرے اسد کی نوکری لگ گئی ہے۔ اسی خوشی میں مٹھائی لائی ہوں۔“  
بتول نیگم خوش ہو کر بولیں تو اماں کو یقین نہ آنے کے باوجود کہنا پڑا۔

”اچھا! مبارک ہو.....!“

تب ہی رابعہ دروازے میں آکر ڈک گئی۔ وہ ساس کو دیکھ کر کچھ خائف ہو گئی تھی۔

”ارے.....! تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آؤ.....! میں تمہیں ہی لینے آئی ہوں۔“

بتول نیگم اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”حالانکہ بیچ عباد آٹس جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ وہاں میں تمہیں لینا آئے گا، لیکن مجھ سے مہربانی

ہو۔“

رابعہ نے ان کی بات سن کر اماں کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں، کیونکہ انہوں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ خواجہ

صاحب اسد کے رشتے پر تقریباً باہمی بھرتے ہیں۔

”شوہن کیا ہے امی؟ آپ اسے کیوں نہیں لائیں؟“

اس نے اماں سے نظریں ہٹا کر بتول نیگم سے کہا۔

”شوہن سو رہا تھا بیٹا! پھر اتنی گرمی پڑ رہی ہے، پچہ پریشان ہو جاتا۔ چلو.....! تم چل رہی ہو

ناں؟“

بتول نیگم نے جواز کے ساتھ پوچھا تو وہ شوہن کے خیال سے ہی فوراً بولی تھی۔

”جی.....!“

”بیٹا.....! پہلے کچھ ٹھنڈا لیا جائے۔“

اماں نے کہنے کے ساتھ اسے اشارہ بھی کیا۔

”میں ابھی لاتی ہوں۔“

وہ کسی طرح غلت پر قاپو نہیں پاسکی، تیزی سے کمرے سے نکل کر آئی تو آگے ٹائیے سے ٹکرائی۔

”افوہ.....! کیا ہوا ہے؟ اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو.....؟“

ٹائیے نے خود کو گرنے سے بچا کر پوچھا۔

”میری ساس آئی ہیں مجھے لینے۔“

رابعہ نے خوشی سے بتایا تو ٹائیے نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

”ارے.....! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“

”ہاں.....! تم جلدی سے ان کے لئے جوس بنا دو۔ میں جب تک پہنچ کر لوں۔“

”کیا مطلب؟ ابھی جاؤ گی تم؟“

”ہاں ناں.....! بس.....! تم جلدی کرو۔!“

وہ ٹائیے کو چمکیل کر کمرے میں آگئی۔ اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا، اڈ کر شوہن کے پاس پہنچ جائے۔ دو منٹ میں کپڑے بدل کر تیار ہو گئی پھر جب تک بتول نیگم جوس پیتیں، اس نے پڑوس کے نوکے کو پہنچ کر رکشہ منگوا لیا تھا۔ اس کی غلت پر اماں اسے گھونڈی رہ گئیں، لیکن اسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بتول نیگم سے پہلے جا کر رکشہ میں بیٹھ گئی تھی۔

اور گھر آ کر تو اس نے بتول نیگم کا خیال نہیں کیا۔ سوئے ہوئے شوہن کو جھپٹنے کے انداز میں اٹھا کر سیدھی اپنے کمرے میں آگئی۔

”میرا بچہ.....! میرا شوہن.....!“

وہ دیوانہ وار شوہن کو چوم رہی تھی کہ اسد آ کر اونچی آواز میں بولا تھا۔

”اوہو.....! بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔؟“

رابعہ اس اچانک آواز پر نہ صرف اچھلی، اسے غصہ بھی آ گیا تھا۔

”کتنی بار کہا ہے اسد.....! ایسے منہ اٹھانے اندر مت چلے آیا کرو۔ دسک دینے میں تمہارے ہاتھ تھکتے

ہیں کیا.....؟“

”اپنوں کے دروازے پر کون دسک دیتا ہے بھابی.....؟“

اسد ڈھٹائی سے ہنسا تھا۔

”ہر شریف آدمی.....!“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”تو میں کیا بد معاش ہوں.....؟“

اسد نے کہا تو وہ غوت سے سر جھٹک کر شوہن میں لگ گئی۔

”او بھابی.....! یہ غصہ کسی اور کو دکھانا۔ میں رعب میں آنے والا نہیں ہوں۔“

اسد اپنی اصلیت دکھانے لگا تو وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”تم تپلیز.....! جاؤ میرے کمرے سے۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”بات نہیں کرنا چاہتی تھی مجھ سے تو رکتی اپنے ابا کو، نا منظور کرتے میرا رشتہ.....؟“

اسد نے اسے پکڑ دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”بڑی بھولی بن رہی ہو.....؟ تمہاری اس گھر میں وہاں ایسے ہی نہیں ہوگی.....؟ میرا رشتہ منظور کیا ہے

تمہارے بابے۔

”نہیں۔۔۔!“

اس نے ایک دم اسد کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو ناں تم۔۔۔؟“  
اسد اسے دیکھ کر ہنستا ہوا چلا گیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں نے رابعہ کی بیچ کے لئے بے قراری دیکھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی انہیں روکنا تو نہیں تھا، لیکن وہ چاہتی تھیں کہ جو بھی بات ہو، رابعہ صاحب کے سامنے ہو۔ لیکن بتول بیگم ایسے وقت آتی تھیں، پھر شوٹی کو بھی گھر چھوڑ آتی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکیں۔ لیکن رابعہ کے جانے کے بعد وہ کچھ پریشان ہو گئی تھیں کہ کہیں رابعہ صاحب ان پر انشائ نہ ہوں کہ ایسے کیوں بھیج دیا رابعہ کو۔۔۔؟

اور جب رابعہ صاحب آئے تو انہوں نے کچھ ڈرتے ڈرتے رابعہ کے جانے کا بتایا تو فوراً رابعہ صاحب کچھ نہیں بولے، جانے کس سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پھر کتنی دیر بعد جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔  
”تو رابعہ اپنے گھر چلی گئی۔۔۔؟“

”ہاں میاں! جب آپ نے انہیں آسرا دے دیا تو پھر بتول بیگم حصر لے لے آ گئیں، اور ہاں۔۔۔!“  
یہ خوش خبری بھی سنا گئی ہیں کہ اسد کی نوکری لگ گئی ہے۔

اماں کی دوسری بات پر رابعہ صاحب چونک کر بولے تھے۔

”اچھا۔۔۔؟“

”مجھے تو میاں! یقین نہیں آ رہا۔ اس موئے کو کون نوکری دے گا۔۔۔؟ الف، ب بھی نہیں جانتا۔“  
اماں ٹالاں لگ رہی تھیں۔

”ہاں۔۔۔! آج کل تو ایم اے پاس جوتیاں گھس رہے ہیں۔“

رابعہ صاحب کا انداز مایوسی لئے ہوئے تھا۔

”پھر۔۔۔؟“

”پھر کیا کر سکتا ہوں میں۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

اماں کو بول اُٹھنے لگے۔

”آپ کچھ نہیں کریں گے۔۔۔؟ بتول بیگم کے جھوٹ کا یقین کر کے بیاہ دیں گے تاہیہ کو اس نکلے کے

ساتھ۔۔۔؟“

”اوہو نیگم۔۔۔!“

خواجہ صاحب جھنجھلا گئے۔

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو کہ بتول بیگم جھوٹ کہہ گئی ہیں۔۔۔؟ ہو سکتا ہے اسد کی کام سے

واقعی لگ گیا ہو۔۔۔؟“

”یہ ہو سکتا ہے، وہ ہو سکتا ہے، میں نہیں مانتی میاں! آپ پوری چھان بین کریں، کسی دفتر میں کیا لگا

ہے۔۔۔؟“

اماں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں، کیا لگا ہوگا۔۔۔؟ تم جا کر ٹائیپ سے پوچھو، وہ رابعہ پر قربان ہونے کو تیار ہو جائے تو

ٹھیک، ورنہ پھر رابعہ کو واپس بلا لو۔“

خواجہ صاحب یہ بہرہ کر اٹھ کر چلے گئے۔ اماں سکتے کی حالت میں کتنی دیر ان کے پیچھے دیکھتی رہیں۔ ان

کے دل پر وزنی ہو جی آن اقسا۔

”ٹائیپ۔۔۔!“

انہوں نے گھبرا کر ٹائیپ کو پکارا، پھر خود ہی اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”رابعہ چلی گئی ہے اماں! تو کمرے کیسا خالی خالی لگ رہا ہے۔“

ٹائیپ اس وقت جو محسوس کر رہی تھی، وہی کہہ دیا، تو اماں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بیٹھتے ہوئے ”ہاں“

کو لباس پہنچ کر بولیں۔

”ہاں۔۔۔! پر بیٹا۔۔۔! لڑکیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”ہا آ گئے۔۔۔؟ کھانا کھا دوں۔۔۔؟“

ٹائیپ نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔! تمہارے لبا اچھی باہر نکلے ہیں۔ تم بیٹھو۔! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اماں اچانک کچھ سوچ کر بولیں تو ٹائیپ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”جی اماں! کہئے۔۔۔!“

”بیٹا۔۔۔! میری بات چل سنا، اور دیکھو۔! ماننے اور نہ ماننے کا تمہیں پورا اختیار ہے۔ دل

چاہے ماننا، ورنہ نہ صاف منع کر دیتا۔“

اماں کی تمہید پر وہ اُلجھ گئی۔

”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں اماں۔۔۔؟ پہلے بات تو بتائیں۔۔۔!“

”بات.....؟“

اماں نظر میں چرا کر بولیں۔

”بات وہی رابعہ کے دیوڑھی ہے۔ ہم اگر اس کے رشتے سے انکار کرتے ہیں تو.....“

”تو کیا.....؟ رابعہ وہ پھر گھر سے نکال دیں گے.....؟“

وہ چیخ کر بولی تھی۔ اماں کوشش سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھ سکیں۔

”تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا۔ تمہارے لئے دانیال کا رشتہ بھی موجود ہے، لیکن تم سوچ لو.....! تمہارے ابا نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔“

”مہم..... میں کیا فیصلہ کروں گی.....؟“

اس کے اندر کڑواہٹ گھل گئی۔

”نہیں اماں.....! مجھ پر اتنی بھاری ذمہ داری نہ ڈالیں۔ آپ کا اور ابا کا جودل چاہے کریں۔“

”ہم کیا کریں بیٹا.....؟ ہم رابعہ کی وجہ سے مجبور ہیں۔ چند دن یہاں رہی تو دیکھنا نہیں تھا کیسے بچے کے لئے تڑپتی تھی.....؟“

”پھر اماں.....! آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں.....؟ جب آپ رابعہ کو روٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں تو.....“

”میں سمجھتی نہیں روٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

اماں فوراً بولی تھیں۔ وہ ایک دم خاموش ہوئی، پھر کہنے لگی۔

”تو آپ ایسا کریں اماں.....! میرا گلگا ٹھونٹ دیں یا زبردے دیں مجھے۔ روز روز مرنے سے بہتر ہے، ایک ہی بار مر جاؤں گی۔“

”فانیہ.....؟“

اماں نے اسے کھینچ کر گلے لگا لیا۔

”میں کیا کروں بیٹا.....! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

اس کے آنسو بے اختیار چھٹک گئے تھے۔

پھر کتنے دن گزر گئے۔ اماں کی پریشانی کم نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ فانیہ نے بالکل چپ سا دل لیا تھا اور ادھر دانیال کی بھانجی دو تین پھر لگا چکی تھی۔ آخر اماں کو اسے بتانا پڑا کہ فانیہ کے لئے ان کی بڑی بیٹی رابعہ کے سرال سے بھی رشتہ آیا ہوا ہے، اور کیونکہ بیٹی کی سرال کا معاملہ ہے، اس لئے وہ طریقے سے ہی انہیں جواب دینے کے بعد دانیال کا سوچیں گے۔

یعنی اماں نے دانیال کے لئے منہ نہیں کیا تھا، کیونکہ ایک تو اسد کے لئے کسی طرح ان کا دل نہیں مان رہا

تھا، دوسرے شاید وہ کسی منجرے کے انتظار میں تھیں کہ یہ بلا خود ہی ٹل جائے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تو وہ پھر فانیہ سے پوچھنے لگیں۔

”بیٹا.....! پھر کیا سوچا تم نے.....؟ دانیال کی بھانجی بھی پھر لگا رہی ہیں۔ میں کب تک ان کے سامنے

ہاتھ بٹاتی رہوں گی.....؟ تم جواب دو تو میں.....“

”میرے پاس جواب نہیں ہے اماں.....! جب آپ اور ابا بے بس ہو گئے ہیں تو میں کیا کر سکتی ہوں.....؟“

فانیہ کے ناراض اور زوٹے انداز پر اماں اسے دیکھ گئیں۔

”آپ ایسا کریں اماں.....! صرف ایک بیٹی کو سوچیں، صرف رابعہ کو یا صرف مجھے۔ پھر شاید آپ کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔“

اماں ابھی بھی کچھ نہیں بولیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں.....! ایک بیٹی کی طرف سے تو آپ کو دل پر پھر رکھنا ہی ہوگا۔“

اس نے پھر زور دے کر کہا تو اماں نے تنک آ کر ٹوک دیا۔

”بس.....! چپ ہو جاؤ.....! میں نے تم سے جواب مانگا ہے، مشورے نہیں مانگے۔“

وہ صبر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی تو اماں نرم پڑ کر کہنے لگیں۔

”دیکھو بیٹا.....! ہم ماں باپ ہیں، ہمارے لئے دونوں بیٹیاں برابر ہیں۔ کسی ایک کی طرف سے دل پر پتھر نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے تمہارے ابا نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔ تم صرف اپنا سوچو، رابعہ کا مت سوچو۔“

اماں کی آخری بات پر وہ ایک دم انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے گا۔“

اماں نے نظریں چرا کر کہا کہ وہ دھکے سے بولی۔

”کوئی الزام دے یا نہ دے، خود اپنی نظروں میں تو مجرم ٹھہروں گی۔ نہیں اماں.....! مجھے معاف کر دیں۔ میں مجرمانہ احساس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ آپ اور ابا جو مناسب سمجھیں، کریں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی آپ کو، ابا کو الزام نہیں دوں گی۔“

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اماں سر پکڑ کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر آیا تو سیما اکیلی آداس گم مٹھی تھی۔ وہ قدرے شکاک، پھر ایک دم زوردار آواز میں سلام کیا تو سیما چونک کر اسے دیکھنے لگی۔



”کیا بات ہے بھابی.....؟ آپ یوں اکیلے اُداس بیٹھی ہیں، کوئی ٹریجڈی فلم دیکھ لی ہے کیا.....؟“  
اس نے فوراً ہلکے پھٹکے انداز میں پوچھا۔  
”نہیں.....!“

سیما کی زبان سے زیادہ سر ہلاتھا۔  
”پھر کیا بات ہے.....؟“  
وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں..... تم جاؤ بیچ کر دو.....! میں تمہارے لئے چائے باقی ہوں۔“

سیما یہ کہہ کر اٹھنے لگی کہ اس نے صوفے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر راستہ روک لیا۔  
”کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی، پہلے میری بات کا جواب دیں۔ بھیا نے کچھ کہا ہے کیا.....؟ چون  
نے تھک کیا ہے یا کوئی اور بات ہے.....؟“

سیما سے یوں دیکھنے لگی جیسے تائے پائیں.....؟

”اوہ بھابی.....! اب بتا بھی دیں۔“

اس نے نو کاہت بہ وہ زک کر بولی۔

”وہ.....! وانیال.....! خوجہ صاحب کی طرف سے انکار ہو گیا ہے۔“

”کیا.....؟“

اسے ایک دم چمکا لگا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی.....؟ کس..... کیوں انکار کیا ہے انہوں نے.....؟“

”وہ..... اصل میں تائی کے لئے اور بھی پر پزل آئے ہوئے تھے۔ پھر ظاہر ہے، خوجہ صاحب کو جہاں  
مناسب لگے گا، وہیں تائی کی شادی کریں گے۔“

سیما یوں بول رہی تھی جیسے اسے بہت زیادہ دکھ ہو۔

”آپ سے انہوں نے کیا کہا.....؟“

”میں بتائی ان کی بیگم نے کہ تائی کے لئے ان کی بڑی بیٹی کی سرال سے رشتہ آیا ہوا ہے۔“

سیما پہلے سے سب سوچ بیٹھ گئی۔

”لیکن بھابی.....! ابھی کل ہی تو میری تائی سے بات ہوئی تھی، اس نے تو کسی اور پر پزل کا نہیں  
بتایا.....؟“

وہ سیما کو جھٹکا نہیں رہا تھا، لیکن اسے یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے تائی سے علم میں نہ ہو۔“

سیما شپٹائی تھی، پھر فریادیں بدل گئی۔

”میں جانتی ہوں، تائی بہاری محبت ہے، اور محبت چھین جانے کا دکھ سہتا بہت مشکل ہے۔ لیکن  
.....! تم خدا کے لئے خود کو سننا لو۔ میں تمہیں ٹوٹنے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تو سیما دھاتی پریشان ہو گئی۔

”کہاں جا رہے ہو وانیال.....؟ میں پھر جاؤں گی، خوجہ صاحب کے ہاں، ان کی منتیں کرنی پڑیں تو وہ  
میں لروں گی۔“

”نہیں بھابی.....! آپ نہیں جائیں گی۔“

وہ سختی سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منزل  
نہیں آتے آتے اچانک زور کیسے ہو گئی تھی.....؟ تفتی دیوہ بس ہلکتا ہی رہا، کیونکہ ذہن بری طرح خنجر رہا تھا۔ پھر سیما  
اس کے لئے چائے لے کر آ گئی تو وہ زک کر بولا۔

”آپ نے کیوں رحمت کی بھابی.....؟ مجھے پکارا لیتیں۔“

”پکارا تھا، لیکن تم اپنے آپ میں بھی نہیں ہو۔“

سیما نے چائے کا کپ اسے تھمایا، پھر کہنے لگی۔

”مجھے تو پہلے دن ہی خوجہ صاحب اور ان کی بیگم کا روڈیہ ٹھکانا تھا، اور شاید میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔  
.....! ان کی مرضی.....! اب تم اپنے دل کو مت لگا لو۔“

وہ سیما کو دیکھ کر رہ گیا۔

”تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے وانیال.....! میں نے صبح تمہارے بھیا سے بات کی تھی۔ کل ہی  
ہاں گی عذرا کہ ہاں۔ اس کی بھانجیاں بڑی خوب صورت ہیں۔“

سیما نے اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے کہا، لیکن وہ سختی سے بولا تھا۔

”نہیں بھابی.....! ابھی آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“

”کیوں.....؟ ابھی سے جانا شروع کروں گی، تب ہی تو کہیں جا کر بات بنے گی۔“

سیما نے رعب سے کہا تو وہ عاجزی سے بولا۔

”بھابی.....! پلیز، اس ٹاپ کو بھول جائیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔“

”ارے.....! تو میں کون سا ابھی کے ابھی تمہاری شادی کر رہی ہوں.....؟ میں تو تمہارا دھیان بٹا رہی  
.....! میں نے تمہیں بچوں کی طرح پالا ہے وانیال.....! تم اگر پریشان، اُداس ہو گے تو میں کیا آرام سے  
.....! میں نے تمہیں بچوں کی طرح پالا ہے وانیال.....! تم اگر پریشان، اُداس ہو گے تو میں کیا آرام سے

بیٹھ سکوں گی؟ نہیں دانیال! تمہارا دکھ میرا دکھ ہے۔“

”میں جانتا ہوں بھائی! لیکن میں کیا کروں؟ میں نے ثانیہ کے علاوہ کبھی کسی کو نہیں سوچا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا، میرا جوں گا۔“

وہ جھنجھٹ رہا تھا۔

”اللہ نہ کرے! میں تمہارے دشمن! خردار جو پھر کبھی ایسی بات منہ سے نکالی تو۔“

سیانے بظاہر دہل کر اسے ٹوکا، تو وہ نام نہاد ہو کر بولا۔

”آئی! ہم سواری بھائی!“

”ہاں توں، جان ہی نکال دی تھی تم نے میری چلو! ایچہ چلو! ایکیہ بیٹھو گے تو ایسے فضول سوچتے رہو گے۔“

”نہیں سوچوں گا، بلکہ اب میں سوؤں گا۔“

اس نے کہا، لیکن سیانے بعد بھی کہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ بڑی مشکل سے وہ اسے بھیج کا۔ پھر کمرہ بند کر کے اس نے خولید صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور خلاف توقع ثانیہ کی آواز سن کر اس نے بہت جگت میں اس سے اگلے دن ملنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ کیونکہ وہ فون پر اس سے باز پرس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں درمیان میں ہی وہ کسی خوف سے فون رکھ دیتی، اور بات ادھوری رہ جاتی۔ اس لئے اس نے ملنے کا کہا تھا۔

اور اسے یقین تو نہیں تھا کہ وہ آئے گی، پھر بھی اگلے دن وہ مقررہ وقت سے بہت پہلے مکڈوئل پہنچ گیا تھا تو پھر وقت جیسے غمگین تھا۔ گھاس وال پر نظریں جمائے حقیقتاً کسی آنکھیں پھرا گئی تھیں، جب ہی وہ دروازے سے داخل ہوئی نظر بھی نہیں آئی۔

”السلام علیکم!“

ثنانیہ نے قریب آ کر سلام کیا تو وہ ایک دم سر اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیوں مشکل میں ڈالے ہیں مجھے؟“

وہ بیٹھنے ہی رونے لگی تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔

”یہ... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ رو کیوں رہی ہو؟ بتاؤ ثانیہ! کیا میری بھائی نے جو کہا ہے، وہ سچ ہے؟“

”نک! کیا کہا ہے آپ کی بھائی نے؟“

وہ روتا بھول گئی۔

”بہن! کہ تمہارے لئے تمہاری بڑی بہن کے سرال سے پر پوزل آیا ہے۔“

وہ تانے سے زیادہ پوچھ رہا تھا اور اس کے سر جھکانے پر بالکل ڈھس گیا۔ جب ثانیہ نے اس پر ساری

”وہ حال واضح کر دی، اور جب یہ بتایا کہ اس پر ماں باپ کی طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے تو اسے غصہ آ گیا۔“

”جب تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے تو پھر تم کیوں روری ہو؟ اور فیصلہ کرنے میں کیوں ہچکچا رہی؟ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟“

وہ خائف ہو کر اسے دیکھنے لگی تو غصہ دبا کر بولا۔

”دیکھو! جو تم سوچ رہی ہو، وہ کیا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری بہن کے سرال والے صرف دھمکیاں دے

لتے ہیں، اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”آپ نہیں جانتے دانیال! وہ پہلے بھی راجد کو گھر سے نکال چکے ہیں۔“

ثنانیہ نے بتایا تو وہ فوراً بولا۔

”اچھا! تو اس کی کیا کارنی ہے کہ وہ بعد میں اپنی ایسی اچھی حرکتوں سے باز آ جائیں گے؟“

”یہ تو ثانیہ! میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی بہن کا مت سوچو، لیکن اس طرح نہیں کہ خود کو قربان کر دو؟ اس سے کچھ

مائل نہیں ہوگا، بلکہ تمہاری بہن کے سرال والے اور شیر ہو جائیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”اب یہ بھی میں بتاؤں؟ بے وقوف لڑکی! منزل تمہارے سامنے موجود ہے اور تم ادھر ادھر

مائل رہی ہو؟ ابھی جا کر اپنی اماں سے کہو کہ تم شادی کرو گی تو صرف دانیال حسن کے ساتھ۔ بس! اتنی سی

بات ہے۔“

وہ شاید خود ریتیکس ہو گیا تھا، جب ہی اسنے آرام سے بولا تھا۔

”اتنی سی بات سے راجد کی زندگی میں جو طوفان آئے گا۔“

وہ مزید خائف ہو گئی تھی۔

”کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ میں کہہ رہا ہوں ناں! کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ اس کی ہمت بندھا دے ہوئے کہنے لگا۔

”کوئی شخص اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ اپنے نکلے، آوارہ بھائی کی خاطر اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دے۔“

تم اپنے دل سے یہ خوف نکال دو۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”بس!۔۔۔۔۔ اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ کرنی ہے تو کوئی اچھی بات کرو۔ پتا ہے، میں کل پوری

رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سو پایا۔

”تو میں کب سوئی ہوں؟“

اس کے رونے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اسے اس شخص کی بات نہیں سننی چاہئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور اسے ڈرانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ اس خیال نے بھی دامن پکڑا کہ اگر جہانزیب کو کسی بات کی خبر ہوگئی تو اس کی ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی جو انجانے میں اسے اپنا سب کچھ مان بیٹھا تھا، دوسرے وہ اسے یہ بھی پوچھنا چاہتی تھی کہ آخراں نے اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا.....؟ جب ہی دماغ کی مسلسل سرزنش کے باوجود وہ من مانی کر گئی۔

”جہانزیب کا فون ہوگا۔“

فون کی بجلی پری نہ تھی وہ یہ کہتی ہوئی لابی کی طرف بھاگی۔ پیچھے سے ہنگی نے پکار کر پچائیں کیا کہا، وہ سننے کے لئے زک نہیں جلدی سے آ کر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو۔“

”جانیہ۔“

اس کی آواز سننے کے بعد ہی اس نے پکارا۔

”ہاں.....! میں جانیہ ہوں ہم کون ہو؟“

”جہانزیب۔“

وہ اطمینان سے بولا۔

”نہیں! تم جہانزیب نہیں ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کون ہو تم؟“

”خفایت ہو جانیہ.....! ابھی سب بتانے کے لئے تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

وہ لمحہ بھر زک کر بولا۔

”سنو.....! کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟“

”نہیں۔“

اس کا لہجہ آپ ہی آپ سخت ہو گیا۔

”پلیز جانیہ.....! انکار مت کرو۔ بس ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تمہیں ہر بات صاف صاف بتانا چاہتا

ہوں۔“

وہ منت سے بولا۔

”یہ ممکن نہیں ہے تمہیں جو کہنا ہے، ابھی کہو۔“

”تم مجھے غلط تو نہیں سمجھو گی ناں.....؟“

”ان باتوں کو چھوڑ دو اور اصل بات کرو۔“

”اصل بات.....؟“

اس کا لہجہ سوجنا ہوا سا تھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

”یہ کہانی وہیں سے شروع ہوئی تھی جانیہ.....! جب تم نے مجھ سے جہانزیب کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے محض شرارت کا کہا تھا کہ میں ہی جہانزیب ہوں۔ میرا خیال تھا تم میری بات کا برائے ہوئے مجھے برا بھلا کہو گی، لیکن اس کے برعکس جب تم نے مجھے جہانزیب تسلیم کر لیا تو جہاں مجھے حیرت ہوئی، وہاں میں یہ بھی جان گیا کہ تم اس شخص سے صرف نام کی حد تک واقف ہو، پھر جس طرح تمہاری آنکھیں لمحہ بھر کو چمکیں اور تم گہرا کر پلٹ گئیں تو لہجہ کرو، اس وقت مجھے اپنے آپ پر افسوس ہوا کہ میں جہانزیب کیوں نہیں ہوں.....؟ اور وہ.....“

”میں یہ ساری باتیں نہیں سنا چاہتی۔“

وہ ٹوک کر بولی۔

”میرا مقصد ان باتوں کو ڈرانا نہیں ہے، بلکہ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اوّل روز ہی سے میرے دل میں گھر کر گئی تھیں اور اس کے بعد میں کوشش کے باوجود تمہارے خیال سے دامن نہیں بھڑکا۔ اس لئے جب تم دوبارہ مجھے ملیں تو میں نے قصد اپنے آپ کو تم سے چھپایا، کیونکہ مجھے یہ خدشہ تھا کہ جب تمہیں معلوم ہوگا کہ میں جہانزیب نہیں ہوں تو تم مجھ سے ڈور چلی جاؤ گی اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔“

”جانتے ہو جہانزیب کون ہے؟“

”ہاں.....! اس عرصے میں تمہاری باتوں سے میں بہت ساری باتیں از خود سمجھ گیا تھا۔ وہ تمہارا مگریتہ تھا اور غالباً اب شوہر ہے۔“

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

”مجھے غلط تم سمجھو جانیہ.....! میرا مقصد تمہیں دھوکہ دینا ہی نہیں تھا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور یہی محبت پر غرض سے مبرا ہے۔ اوّل روز.....! میں جان گیا تھا کہ تم میری نہیں ہو سکتیں، پھر مجھ میں تمہیں چاہتا رہا۔“

”اس سے ساتھ گزار رہی ہیں میرے لئے.....“

”بس کرو.....!“

اس کی آنکھیں بے اختیار چمک گئیں، اور جب بولی تو آنسوؤں کی نمی آواز اور لمحے میں اتر آئی تھی۔

”میں نے سوچا تھا، لیکن۔۔۔“

اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس کر کے اس نے گھبرا کر ریسور رکھ دیا اور جلدی جلدی چھٹیلویں آ نکھیں رگڑنے لگی۔

”کیا ہوا جانیہ۔۔۔؟“

چنگی اسے روتے دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگی۔

”جہاز زیب بھائی ٹھیک تو ہیں ناں۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔!“

”کیا مطلب، ہاں۔۔۔؟ نہیں۔۔۔؟“

”میرا مطلب ہے، جہاز زیب کا فون نہیں تھا۔“

وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”پھر۔۔۔؟“

”وہ۔۔۔ صائمہ تھی۔“

فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی نام آیا۔

”صائمہ۔۔۔؟ اچھا، ہاں، کیا ہوا ہے۔۔۔؟“

”بس۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“

وہ گڑبڑا گئی، مجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے؟

”اس بیماری کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔“

”یہ بتاؤ، ای کیا کر رہی ہیں۔۔۔؟“

”چکن میں ہیں۔“

”کتنی بری بات ہے کہ وہ بیماری اکیلی گئی ہوئی ہیں۔ چلو، وہیں چلتے ہیں۔“

اور محض اس خیال سے کہ چنگی، صائمہ کے بارے میں مزید سوال نہ کرنے لگے، وہ جلدی سے چکن کی طرف جانے لگی کہ سامنے سے چھوٹے بھیا آ گئے۔

”ارے جانیہ۔۔۔! میں آج بڑی شدت سے تمہیں یاد کر رہا تھا۔“

”اچھا۔۔۔!“

چھوٹے بھیا کے منہ سے ایسی بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔

”کس وقت سے آئی ہو۔۔۔؟“

”صبح آفس جاتے ہوئے جہاز زیب چھوڑ گئے تھے۔“

”اچھا اچھا، آؤ، میرے کمرے میں آؤ۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔؟“

وہ حیران ہو کر چنگی کی طرف دیکھنے لگی تو وہ جلدی سے بولی۔

”تم بھیا کے پاس بیٹھو، میں ای کے پاس جا رہی ہوں۔“

اس نے چنگی کو بھاگ کر جاتے دیکھا، پھر چھوٹے بھیا کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئی۔

”بیٹھو۔۔۔!“

انہوں نے کہا اور جیسے ہی وہ بیٹھی، بغیر کسی تہدید کے کہنے لگے۔

”جانیہ۔۔۔! تم ای ای کو سمجھاؤ۔ وہ شاید تمہاری بات مان جائیں۔“

”کیا بات۔۔۔؟“

وہ بالکل نہیں سمجھی اور سمجھنے کے لئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مجھے چاہا جانے کے لئے پیسہ چاہئے اور میں ابوجی سے کہہ رہا ہوں کہ یہ مکان بیچ دیں۔“

”کیا۔۔۔؟“

روکتے روکتے جیسے ہی اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی، جس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چھوٹے بھیا اپنی کہے۔

”ابو اور ای دونوں میں سے کوئی میری بات سننے تک کو تیار نہیں، جبکہ میں یہ یقین دلا رہا ہوں کہ ایک

مال میں ہی ایسے دو مکان خرید دوں گا۔“

”کیسے۔۔۔؟“

”میں وہاں سے کم کر بھیجوں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھیا۔ لیکن آپ وہاں جا کر کریں گے کیا۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، نہ تو آپ کے

اں اتنی تعلیم ہے اور نہ کوئی ہنر۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اگر وہاں کسی ٹیکسٹری میں مزدوری بھی کروں گا، تب بھی اتنے پیسے

میں گے جو یہاں ایک سال میں نہیں کما سکتا۔“

وہ اتنے جوش سے بولے کہ وہ بے شکل خود کو تاسف کا اظہار کرنے سے باز رکھ سکی۔

”ابوجی مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں یا تو پیسے اڑا دوں گا، یا یوں ہی دھکے کھا

ا، انہیں آ جاؤں گا۔ حالانکہ تو کڑی کی گائنی کے ساتھ ویزا مل رہا ہے اور تم کسی طرح ای ای کو یہ بات سمجھاؤ۔“

”میں کوشش کروں گی۔“

اسے کہنا پڑا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے برعکس اس نے کچھ کہا تو چھوٹے بھیا ابھی اس کے منہ پر

کہہ دیں گے کہ وہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کسی قابض ہوں۔

”تم آج ہی ابو سے بات کرنا۔ دیکھو، اگر یہ چانس مں ہو گیا تو.....“

وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی اور یوں ہی سر ہلاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اسی اور چکی بکن سے فارغ ہو کر کمرے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ چکی اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کیا کہہ رہے تھے چھوٹے بھیا.....؟“

”کوئی نئی بات نہیں تھی۔“

وہ گہری سانس لے کر امی کے پاس بیٹھی تو ان سے کہنے لگی۔

”آخر چھوٹے بھیا ایسے کیوں ہیں؟ انہیں ذرا بھی کسی بات کا احساس نہیں ہے۔ بس..... ایک

جاپان جانے کی دھن سوار ہے۔“

”مکان بیچنے کو کہہ رہے ہوں گے.....؟“

چکی نے توجہ دینے کی کوشش کی تو وہ درمیان کہا تو وہ قدر بیزاری سے بولی۔

”وہ ایسی ہی باتیں کر سکتے ہیں۔ خیر چھوڑو.....! اور اگر کھانا تیار ہو گیا ہے تو دسترخوان لگا دو، مجھے بھوک

لگی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔“

”کھانا ضرور کھاؤ، لیکن میں تمہیں سوئے نہیں دوں گی۔“

چکی اُٹھتے ہوئے بولی۔

”کیوں.....؟“

”میں بور ہوں گی۔“

”اچھا جاؤ، پہلے کھانا کھا لو.....!“

امی کے ٹوٹے پر چکی چلی گئی تو اس نے اٹھ کر الماری سے دسترخوان نکالا اور وہیں بچھا دیا۔ اس کے بعد

جا کر چھوٹے بھیا کو بلا لائی۔

پھر کھانا کھاتے ہی وہ لیٹ گئی۔ اسے دو پہر میں سونے کی عادت تھی اور اس وقت اس نے سوچا، جب تک امی نماز سے فارغ ہوں اور چکی برتن وغیرہ دھو کر آئے، تب تک وہ ایک نیند لے لے، لیکن جیسے ہی تنہا ملی، اس کا ذہن ہلکتے لگا۔ کچھ دیر پہلے ٹیلی فون پر ہونے والی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”تم آؤں روزی سے میرے دل میں گھر کر گئی تھی، اور پھر میں نے قصداً اپنے آپ کو تم سے چھپایا۔“

”جہانزیب.....!“

اس نے دل ہی دل میں اسے پکارا۔ پھر اٹھ کر بولی۔

”وہ جہانزیب نہیں ہے، بہر حال جو بھی ہے، اس نے اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ مجھے بتا دیتا تو شاید میں.....“

”میرا خیال تھا تم سوتلی ہو گی۔“

چکی اسے جانتے دیکھ کر بولی تو وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا تم میری وجہ سے جاگ رہی ہو.....؟“

”ہاں.....! میں نے سوچا، کہیں تم مجھے نیند میں سے نہ اٹھا دو، اس لئے میں سوئی ہی نہیں۔“

”نہیں خیر.....! میں ایسا تو نہ کرتی۔“

چکی ہنسی ہوئی اس کے برابر آ لی۔

☆.....☆.....☆

رابیہ اپنی ساس اور دو بیوی سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔ وہ باقاعدہ محاذ بن چکے تھے اور مہادیاس اس کی شنائی

میں چاہتا تھا۔ ماں کے کہنے میں اپنا کھرا جائزے پر ٹکا ہوا تھا۔ بچے کا بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

اس وقت بکن میں کھڑی بیاز کاتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ اس کی

ساس کا ذیہ کا خیال چھوڑ دیں۔ لیکن اسے کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”بھابی.....!“

اچانک اس کی آمد پر وہ جلدی سے آنسو پونچھ کر چھری تیز چلانے لگی۔

”اوہو.....! یہاں تو جل تھل کا سا ہے۔“

اسد نے اسے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”کیا کیا ہے تمہیں.....؟“

اس نے جتنے جیسے لمحے پر پوچھا، وہ اسی قدر لہک کر بولا۔

”تمہارا پیار.....! میرا مطلب ہے، کبھی تو پیار سے بات کر لیا کرو۔ ہر وقت انکار سے چپا نا اچھا نہیں

”دیکھو اسد.....! میرے پاس فالٹو باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو چاہئے، جلدی بناؤ.....!“

وہ چھری جھیک کر اسے دیکھنے لگی۔

”جتنی جلدی بتاؤں گا، اتنی جلدی دے دو گی.....؟“

اس کی ڈھٹائی کی حد نہیں تھی۔

”جاؤ.....! مجھے کام کرنے دو۔“

وہ پھر چھری اٹھانے لگی تھی کہ اسد نے اس سے پہلے ہی جھپٹ لی۔

”لاؤ.....! میں تمہاری مدد کروں۔ تم اپنی آنکھوں پر ظلم نہ کرو۔“

پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”اسی لئے کہتا ہوں، جلدی اپنی بہن کو لے آؤ یہاں، تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کھانا پکانا آتا ہے ناں جانیہ کو؟“

”سب آتا ہے۔“

وہ دانت بستی ہوئی چکن سے نکل آئی۔ پھر پہلے شوٹی کو کمرے میں دیکھا تو وہ سکون سے سو رہا تھا۔ اس کے بعد عباد کے پاس بیٹھی اور اس کے ہاتھ سے ٹی کی کاربوٹ لیتے ہوئے بولی۔

”عباد! میری بات سنیں!“

”سنناؤ۔۔۔!“

ہمیشہ کا اکثر عباد اس وقت جانے کس موڈ میں تھا کہ بڑے آرام سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ عباد۔۔۔!“

وہ اس کی شکایت کرنے بیٹھی تھی، لیکن اچانک ایک خیال کے تحت غصہ پا کر کہنے لگی۔

”وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں خود پہنی چاہتی ہوں کہ اس گھر میں کسی اور لڑکی کی بجائے میری اپنی بہن آجائے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ آپ اس کو بھی تو سمجھائیں ناں! میرا مطلب ہے، شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، اور اس کا اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔“

اس نے کہا تو عباد بے نیازی سے بولا تھا۔

”نہیں ہے احساس تو ہو جائے گا، جب سر پر پڑتی ہے تو خود ہی عقل ٹھکانے آ جاتی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے عباد۔۔۔!“

وہ جھنجھلا کر بولی۔

”آپ کو ابھی اس کو سمجھانا پڑے گا، بلکہ یہی وقت ہے۔ آپ اس سے کہیں، اگر شادی کرنا چاہتے ہو تو پہلے کچھ کمزور۔۔۔ ابھی وہ شادی کے شوق میں کچھ کمر بھی لے گا، بعد میں تو وہ آپ کی بات سننے کا بھی نہیں۔“

عباد کے چہرے کا تاؤ ڈھلا پڑ گیا تھا اور وہ اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

”دیکھیں! میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ اس کے بھٹلے ہی بات کر رہی ہوں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیں، ابھی سارے گھر کی ذمہ داری آپ پر ہے، اگر اس کو احساس نہ دلایا گیا تو اس کے بال بچوں کی ضرورتیں بھی آپ کو پوری کرنی پڑیں گی۔ کر سکیں گے آپ؟“

”میں کہاں سے کروں گا۔۔۔؟“

عباد فوراً بولا تھا۔

”سی لئے میں۔۔۔“

وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم نصف خاموش ہوئی، بلکہ خائف بھی ہو گئی تھی۔ پردے کے اس طرف بتول بیگم کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کی جھلک دیکھ کر ہی وہ خاموش ہوئی تھی، اور وہ کوئی غلط بات تو نہیں کر رہی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ بتول بیگم اس کی بات کو غلط رنگ ہی دیں گی، اور یہی ہوا۔ بتول بیگم نے اس پر کچھ جتا تو نہیں، لیکن جب وہ ان کے لئے کھانا لے کر گئی تو بڑے آرام سے بولی تھیں۔

”میں سوچ رہی ہوں، بہو! اکل تمہارے سینے کا چکر لگاؤں۔“

”جی۔۔۔؟“

اس کا ”جی“ بے معنی تھا۔

”تم بھی جلی چلنا، جانیہ کے جوڑے کا ناپ بھی لے لینا، جنہیں پتا ہے آج کل درزیوں کے کتنے غرے ہیں۔“

بتول بیگم بظاہر کھانے کی طرف متوجہ تھیں۔

”جی ای! لیکن ابھی سے۔۔۔؟“

وہ حقیقتاً چکر مار گئی تھی۔

”میرا مطلب ہے، پہلے شادی کے معاملات تو طے کر لیں۔ پتا نہیں ابا کا ارادہ کیا ہے۔؟“

”ارے! میں بیٹے کی ماں ہوں۔“

بتول بیگم ایک دم اوقات پر آ گئیں۔ سینے پر ہاتھ مار کر زور سے بولیں۔

”جو میں طے کر دوں گی، وہی ہوگا، اور مجھے اگلے مہینے اس کی شادی کرنی ہے، کبھی۔۔۔؟“

”جی۔۔۔!“

وہ اس قدر کہہ کر جانے لگی کہ بتول بیگم پکار کر بولیں۔

”اور سنو! سینے کا زور زیادہ ہو شادی دھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نوکری کا تم سے ضرور ہمیں گے تمہارے اماں ابا۔ کیا کہو گی؟“

”وہی جو آپ نے کہا ہے۔“

وہ ضبط سے بولی تھی۔

”ہاں! اور یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔؟ دیور کی شادی کی خوشی نہیں ہے کیا تمہیں۔۔۔؟“

ارے! بھاد جوں کو تو بڑا امان ہوتا ہے، دیوروں کی شادی کا، اور تمہارا تو ایک اگلوٹا دیور ہے۔ اس کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی تم سے۔۔۔؟“



اماں حیران ہوئیں اور تابیہ قابو ہوتے دل سے گھبرا کر کہیں سے واپس پلٹ گئی تھی۔  
”تم کھڑی رہو، میں خودی۔“

خوبصاحب شاید خود مخالف تھے کہ کہیں مجبوری آؤے نہ آجائے۔ اس لئے خودی بڑھ کر فون اٹھالیا تھا۔ اتفاق سے دوسری طرف دانیال کے بڑے بھائی کمال حسن نے ان کا فون رسیو کیا تھا۔ خوبصاحب نے دانیال کے رشتے کی ہائی بھر کر انہیں اسی وقت آکر شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہا تو وہ خوشی سے تیار ہو گئے، جس سے خوبصاحب اچانک ہلکے ہلکے ہو گئے تھے۔ پھر حیران کھڑی بیگم کو دیکھ کر بولے۔

”تم ابھی تک سہیل کھڑی ہو؟“ جاؤ چائے پانی کا انتظام کرو۔ وہ لوگ آرہے ہیں۔“  
”لیکن میاں! ایوں آنا کافی۔“

”اللہ کی قسم منظور ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔ میں مضانی وغیرہ لے کر آتا ہوں۔“  
خوبصاحب اماں کو اسی طرح حیران چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

اور تقریباً گھنٹے بھر بعد ہی کمال حسن، سہما کے ساتھ موجود تھے۔ سہما اندر سے کتنی ہی حیران پریشان تھی، لیکن خود کو خوش ظاہر کر رہی تھی۔ اماں نے مضانی کی پلٹ اس کے سامنے کی تو وہ گلاب جامن اٹھا کر بولی۔

”بھئی! بہت مبارک ہو آپ کو۔! اس دن تو میں بالکل مایوس ہو گئی تھی۔“  
”بس! خوبصاحب کے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

اماں نے کہا تو کمال حسن، خوبصاحب سے کہنے لگے۔  
”آپ کے اچانک فیصلے نے ہمیں خوش کر دیا اور ایک بڑی فینشن سے بچالیا۔“  
”فینشن سے؟“

خوبصاحب ناگھٹے کے انداز میں دیکھنے لگے۔

”جی۔! ہماری بیگم نے باقاعدہ بستر سنبھال لیا تھا۔ اصل میں یہ جب مایوس ہوتی ہیں تو پھر بہت دنوں تک ہمیں ان کی سیوا کرنی پڑتی ہے۔“

کمال حسن نے وضاحت کی۔ وہ معنوی گفتگی سے بولی۔

”بس یہی کریں، آپ کو تو موقع چاہئے۔“

”تو ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے؟“

کمال حسن حقیقتاً بہت خوش تھے۔

”ارے ہاں! آپ کی بڑی بیٹی نہیں آ رہی؟“

سہما کو اچانک رابعہ کی فرموجوئی کھل گئی تھی۔ اماں اندر سے پریشان ہو گئیں۔

”ہاں! اوہ۔! اصل میں اس کے بچہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے انہیں سکی۔“

”اچھا!۔! اوہیے یہ خوشی کا موقع بار بار تو نہیں آئے گا۔ ایک ہی بہن ہے اس کی۔“

سہما جاننے سے باز نہیں آئی۔ اماں بیکھلا کر خوبصاحب کو دیکھنے لگیں تو کمال حسن پتویشن نہ سمجھ کر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا خوبصاحب!۔! اجازت دیجئے!۔! اب تو انشاء اللہ آنا چاہتا رہے گا۔“

”جی ہاں! ایکو نہیں؟“ آپ کا پنا گھر ہے، جب چاہے آئیں۔“

خوبصاحب خوش دلی سے بولے۔ پھر انہیں زرخشت کر کے اپنے کمرے میں آئے تو بیگم کو گھر گندی سے سوچنے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

”اب کیا ہوا ہے؟“

”اب مجھے رابعہ کی گھر ساری ہے میاں۔!“

اماں نے کہا تو وہ قدر سے جھلا کر بولے۔

”خواہ خواہ جی مت جلاؤ بیگم!۔! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے جو کچھ برا ہو۔“

اماں فوراً بولی تھیں۔

”ہاں!۔! بس یہی دعا کرو۔!“

”رابعہ آئی ابھی تو نہیں، جو چاہا اس کی ساس کیا سوچے بیٹھی ہیں۔؟“

اماں کسی طرح خود کو رابعہ کی فکر سے آزاد نہیں کر پا رہی تھیں۔

”اب وہ جو بھی سوچیں۔“

خوبصاحب کے اطمینان پر اماں انہیں دیکھنے لگیں۔

”میاں! آپ نے تو لگتا ہے خود کو ہر بات کے لئے تیار کر لیا ہے۔؟“

”کیا جانتی ہو تم۔؟“

خواہصاحب ہلکے ہوئے۔

”دو گھنٹہ کچھ کا سانس بھی نہ لوں!۔! ابھی سے کل کی فکر میں کیوں گھل رہی ہو۔؟ جو گھڑی کھکی

میرا آئی ہے، اسے غنیمت جانو۔! خود بھی سوار مجھے بھی سونے دو۔“

اماں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ اندر سے بہت ڈنڈب تھی، پھر بھی بظاہر اپنے آپ کو بہت



سنہالے رکھتی تھی۔ زیادہ تر مصروف رہنے کی کوشش کرتی۔ صبح لگا اور جہانزیب آفس چلے جاتے، پھر اس کا دیور جہانگیر اگر اسے کہیں انٹرویو کے لئے جانا ہوتا تو کچھ دیر بعد وہ بھی چلا جاتا اور تار سارا دن گھر میں رہ کر شام میں ٹیوشن وغیرہ کے لئے نکلتا تھا۔ ویسے اس کا ہونا نہ ہونا براہ راست تھا۔ کیونکہ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہتا تھا۔

البتہ اماں جن کے ساتھ اس کا سارا وقت گزارتا تھا، ان کا الگ مزاج و انداز تھا۔ کسی دن بہت مہربان اور کسی دن اچانک یوں اس کے خلاف ہو جاتیں جیسے رات میں تہیہ کر کے سوئی ہوں کہ آج اسے صرف تنگ کرنا ہے۔ ابتداء کیونکہ شائے کی ٹیبل پر ہی ہو جاتی تھی، اس لئے جہانزیب آفس جانے سے پہلے اسے سجدہ دیتے کہ آج اماں کا موڈ ٹھیک نہیں ہے، تم خیال مت کرنا، وہ جو بھی کہیں چپ چاپ سن لیتا۔

اور وہ ایسا ہی کرتی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ شام تک وہ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتیں۔ ایک طرح سے اس گھر میں اسے کسی خاص مسئلے کا سامنا نہیں تھا۔ وہ بڑے آرام و سکون سے رہ سکتی تھی اور رہنا چاہتی تھی، لیکن دل میں جو ایک غلطی تھی، وہ ہمہ وقت بے چین رکھتی۔ اکثر اپنے آپ سے اچھے اور بڑے لگتی کہ اس نے کیوں جہانزیب کو کیسے کی غلطی کی تھی؟ اور پھر دھوکہ کھایا، اور کمال تو اس شخص کا تھا جو اسے تو اسے خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتا رہا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کسی اور کی امانت ہے، اس سے محبت کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سیما کی ساری بلائیں تکمیل ہو گئی تھی۔ وہ بے حد تملاتی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا کیے پلٹ گئی۔؟ دانیال کے سامنے تو وہ خوشی کا اظہار کرنے پر مجبور تھی، لیکن حنا کے سامنے محذور۔ کیونکہ حنا کو ہی اس کا سہارا تھا، جب سیما دانیال کی بات کہتی ہوئی کہ کس کو دھتھے سے اکڑا کر لیتی تھی۔

”میں یہ سب نہیں جانتی آپا.....! آخر یہ سب کیسے ہوا.....؟ کیوں ہوا.....؟ مجھے بتائیں.....! میں اب کیا کروں.....؟ میرے سینے میں آگ لگی ہے اور یہ جی ہی بجھ گئی، جب دانیال میرا ہوگا۔“

”اس کے لئے تو تمہیں بہت انتظار کرنا پڑے گا۔“

سیما جانے کیا سوچ کر بولی تھی۔

”کروں گی، قیامت تک انتظار کر سکتی ہوں۔“

حنا نے کہا تو سیما ہنسا گئی۔

”پاک گلست بنو حنا.....! دانیال میں کوئی سرخاب کے نہیں لگے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا.....؟ آپ نے ہی تو مجھے دانیال کے خواب دکھائے، اور جب میری آنکھیں ان خوابوں کی عادی ہو گئیں تو آپ جانتی ہیں میں اپنی آنکھیں چھوڑاؤں.....؟ نہیں.....! یہ کسی صورت ممکن نہیں ہو سکتا۔“

حنا کی ضد پر سیما پریشان ہو گئی۔

”پھر اب میں کیا کروں.....؟ یہاں تو آنا فانا سارے معاملات طے ہو گئے ہیں، شادی.....؟“

”اور طلاق.....!“

حنا فوراً بولی تھی۔

”طلاق.....؟“

ایک لکھ کو سیما کا دل کا ناپا تھا۔ پھر حنا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اور اس رات سیما پر یک ای کچھ سوچتے ہوئے سوئی تھی۔ پھر صبح کمال میں کو چائے کے درہو سیدھی دانیال کے کمرے میں آئی اور اسے اٹھانے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”ارے.....! آج تو شہر میں جلدی اٹھ گئے.....؟“

پھر کھڑکی کے پردے کھینچتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ابھی اٹھے ہو یا خوشی کے مارے رات بھر سوئے ہی نہیں.....؟“

”آپ کو تو موقع چاہئے.....!“

دانیال بھینچ کر بولا تھا۔

”ہاں.....! تو ایسے موٹے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ پھر اب یہ چند دن تو ہیں، شادی کے بعد تو تم نظیر بھی نہیں آؤ گے۔“

”کیوں.....؟ میں کہیں جا رہا ہوں کیا.....؟“

دانیال نے قصداً حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا جاتا، چلے ہی جاؤ۔“

سیما اسے آزار ہی تھی۔

”آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں مہربانی.....؟“

وہ ایک دم بخود ہو گیا اور کچھ ناراض بھی ہو کر سنا اندر سے مطمئن ہو کر ٹوٹے ہوئے کہنے لگی۔

”بس.....! اب اموشل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وقت کم ہے اور میں اس وقت تمہیں یہ

فائدے آئی ہوں کہ میں آج سے شاپنگ شروع کر رہی ہوں۔ تم ساتھ چلو گے یا میں اپنی پینڈ سے لے لوں سب ملو.....؟ میرا مطلب ہے، کہیں بعد میں تمہیں اعتراض نہ ہو کہ میں کیسے کھرا غلامی ہوں.....؟“

”ارے نہیں مہربانی.....! مجھے تو آپ کو معاف ہی رکھیں۔ ہاں.....! اگر ممکن ہو تو چاہیے کہ ساتھ لے

ہائیں۔“

اس نے کہا تو یہ سنا فوراً بولی۔

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ ٹانیہ کے والدین نے اجازت دی تو اسے بھی ساتھ لے جاؤں گی۔“

”مجھے بتا دیجئے گا، کہاں جائیں گی؟“

اس نے کہا تو یہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی۔

”خبردار جو ہمارے پیچھے آئے تو۔۔۔!“

اس کے بے ساختہ قہقہے پر یہ اسے محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں، ٹانیہ کو یہ سنا اور حنا کے ساتھ بھیج کر خود رابعہ کے ہاں آ گئیں۔ کیونکہ انہیں رات سے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ٹانیہ کی شادی طے ہو جائے گا سن کر جانے رابعہ کی ساس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس نے اپنے طور پر وہ ان کے سامنے صفائیاں پیش کرنے اور خطرات کرنے آئی تھیں۔ لیکن آگے اتفاق سے بتول بیگم گھر پر موجود نہیں تھیں۔ رابعہ ان سے مل کر بتانے لگی۔

”بھئی ساس اپنے بھائی کے ہاں گئی ہوئی ہیں اور میں شام ہمارا آپ کے ہاں آنے کا پروگرام تھا۔“

”اچھا! ختم فون کر دیجی تو میں نہ آتی۔“

اماں نے کہا تو رابعہ فوراً بولی۔

”ارے نہیں اماں! اچھا کیا آپ آ گئیں۔ ٹانیہ کیسی ہے۔؟“

”ٹھیک ہے۔ اب تو چند دن کی مہمان ہے۔“

اماں کہتے ہوئے نظریں چرا گئیں۔

”چند دن کی مہمان؟“

رابعہ سمجھی نہیں۔

”ہاں بیٹا! میں تمہیں یہی بتانے آئی ہوں۔ رات تمہارے ابا نے دانیال کے گھر والوں کو بلا کر ٹانیہ کی شادی طے کر دی ہے۔“

اماں نے بتایا تو رابعہ پریشان ہو گئی۔

”شادی طے کر دی؟ اور اماں! اسد۔۔۔“

”اسد کے کروت و کچھ کر ہی تو انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ کل انہوں نے سچ مرک پر اسد کو غنہ گردی کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد تم ہی بتاؤ۔! کیسے جانتے ہو جیسے ہوئے ہم ٹانیہ کی قسمت پھوڑ دیں۔؟“

اماں نے بتایا تو رابعہ سناٹے میں آ کر کہیں دیکھنے لگی۔

”میں خود تمہاری ساس سے بات کروں گی۔ اسی لئے آئی ہوں میں۔“

”نہیں اماں!۔۔۔!“

رابعہ ایک دم بول پڑی۔

”آپ نے اور ادا بنے جو کیا، اچھا کیا۔ لیکن یہاں کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ میری ساس کو بھٹک تک نہیں پڑنی چاہئے۔“

”نو! یہ کوئی چھپنے والی بات ہے۔؟ ہم ٹانیہ کی شادی کر رہے ہیں، کوئی گناہ تو نہیں کر رہے۔؟“

رابعہ ایک دم شادی کا بلا دانہ نہیں دیں گے تمہاری ساس کو۔۔۔؟“

اماں کو رابعہ کی بات سمجھنے آئی تھی۔

”نہیں! میری ساس تو کیا، میں بھی نہیں آؤں گی۔“

رابعہ جانے کیا سوچ کر بولی تھی! اماں ناراض ہو گئیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ بہن کی شادی میں۔۔۔“

”اماں!۔۔۔!“

رابعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔

”اماں! مجھے اپنا گھر بھی تو دیکھنا ہے۔ میں یہاں یہی کہوں گی کہ آپ نے مجھے بھی ٹانیہ کی شادی میں نہیں بلایا اور آپ سے ناراض ہو کر بیٹھ جاؤں گی۔ پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن بیٹا۔۔۔!“

بٹی کی مجبوری سمجھتے ہوئے اماں کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں! آپ اس بات کو دل پر نہ لیں کہ میں ٹانیہ کی شادی میں شریک نہیں ہو سکوں گی۔ اللہ اور موقع دے گا، پھر ہم بیٹیں مل کر خوشیاں منائیں گے۔“

رابعہ، اماں کو بہلانے لگی تھی، لیکن وہ دل پر حذر ہو بوجھ لئے گھر آئی تھیں، اور ابھی وہ پانی پی کر بیٹھی تھیں

کہ ٹانیہ آگئی۔ جتنی جتنی، انتہائی بے زار، اور اسی انداز میں سلام کیا، لیکن اپنی پریشانی میں اماں کو اس کی بے زاری محسوس ہی نہیں ہوئی۔

”وعلیکم السلام! ہو گئی خریداری۔؟“

”جی! ہو گئی، آئندہ تو میں نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ۔“

ٹانیہ نے کہا جب اماں جو تک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں؟ کیا ہوا۔۔۔؟“

”کچھ نہیں! آپ بتائیں، رابعہ کے گھر گئی تھیں۔؟“

ٹانیہ نے ہال کر پوچھا۔

”ہاں! تمہارے جانے کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ میں بھی ابھی آ رہی ہوں۔“

اماں نے بتایا تو وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”اچھا! کیسی ہے رابعہ؟“ آپ اسے اپنے ساتھ ہی لے آئیں ناں۔“

”ہاں! گئی تو میں بھی اسی ارادے سے تھی کہ رابعہ کو ساتھ لے آؤں گی، لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟ اس کی ساس نے نہیں آنے دیا ہوگا۔“

ٹانیہ نے بے صبری سے اماں کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ساس سے تو ملاقات بھی نہیں ہوئی کہیں گئی ہوئی تھیں۔“

اماں اس کے سوالوں سے تنگ پڑنے لگیں۔

”پھر آپ نے رابعہ سے کب آنے کو کہا ہے۔“

”آج آئے گی، جب اس کامیاب اور ساس اجازت دیں گی تو آج آجائے گی۔“

اماں نے جھنجھلا کر کہا تو وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی، پھر پکار کر پوچھنے لگی۔

”اماں! رابعہ اب کسے ٹھیک سے خوش تھی۔“

”ہاں! وہ تو خوش تھی، لیکن اس کے سرال والے جب سنیں گے تو شاید وہ خوش نہیں ہوں گے۔“

”ان کے خوش نہ ہونے سے ہمیں کیا۔۔۔؟“

وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی، اور اماں بچ منہ جارہیں اس کفری ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ سیما اور حنا کے ساتھ جا کر بہت بچھتاں تھی۔ کیونکہ آگے سیمانے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی اور ہر چیز حنا کی پسند سے خریدتے ہوئے اس پر جتنی رسی تھی کہ دانیال اور حنا کی پسند ایک ہے۔ جانے اس کا کیا مقصد تھا۔۔۔؟ وہ بہر حال برٹ ہوئی تھی، اور اس رات دانیال کا فون آیا تو اس کا دل چاہا اس سے حنا کے بارے میں پوچھے، لیکن پھر یہ سوچ کر کراہ بکھی ہی دنوں کی بات ہے، اس نے دل کو بھالایا اور اس سے بولی تھی۔

”اب آپ کو فون نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیوں؟“ اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔۔۔؟“

دانیال نے خوشی سے پوچھا تو وہ زور سے ہو گئی۔

”مجھے نہیں پتا۔۔۔!“

”کیا کروں؟“ مجھے یہ چند روز گزرا بہت مشکل لگ رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے، آنکھیں بند کروں،

پھر کھولوں تو تم سامنے ہو۔“

دانیال نے اپنی کیفیت بتائی تو وہ ڈرامائی انداز میں اس کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”اچھا! اور کیا دل چاہتا ہے۔۔۔؟“

”بتا دوں۔۔۔؟ فون بند تو نہیں کرو گی۔“

اس نے کہا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”میں ابھی بند کر رہی ہوں۔“

یہ بے ایمانی ہے، جب باہر دل سننا نہیں تھا تو پوچھا کیوں تھا۔۔۔؟“

”عطش ہو گئی۔“

”عطش کی کیا سزا ملے گی۔“

دانیال اس کی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے محفوظ طور پر ہاتھ دیا۔

”کیا سزا دیں گے۔۔۔؟“

”آنکھیں بند کرو۔!“

اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔

”اب تم آنکھیں کھولو گی تو مجھے اپنے سامنے دیکھو گی، بالکل پاس۔!“

اس کے لہجے کی گھبراہٹ سے گھبرا کر اس نے فوراً آنکھیں کھولیں اور پھر ایک دم فون رکھ دیا تھا۔ اس کا

دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اور پھر یہ چند دن بڑا لگا کر اڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے رابعہ کی مجبوری سمجھتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کر لیا اور بیٹی داماد کو بھی بلا نہیں دیا، اور ٹانیہ کو زخمت نہ کر دیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ چاند چڑھتا ہے، تو دنیا دیکھتی ہے، تو یہاں آوارہ گرد ساند نے اپنے چاند کو زخمت دے کر سکون کا سانس لے رہے تھے، رابعہ شوبی کو بیٹنے سے لگائے سامنے آن لڑی ہوئی تھی۔ اس کا آجروپ دیکھ کر اماں تو دل قحطام کر رہ گئیں، لیکن خواجہ صاحب جیسے خود کو ہر بات کے لئے تیار کر چکے تھے، جب ہی بہت ضبط سے پوچھنے لگے۔

”انہوں نے دانیال کی رات چھوڑا ہے کہ نہیں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔!“

رابعہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ اسے چپ کراتے کراتے اماں بھی رونے لگی تھیں۔ خواجہ صاحب سر ہکا کر بیٹھ گئے تھے۔ کتنی دیر بعد ان کے کانوں میں اماں کی آواز آئی تھی جو رابعہ کے آنسو پوچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”مت خود کو ہلکان کر دینا.....! یہ رونا تو اب عمر بھر کا ہے۔“  
”نہیں.....!“

خوبصاحب ایک دم سر اوٹھا کر کے غصے سے بولے تھے۔

”یہ عمر بھر کا رونا نہیں ہے بیگم.....! بلکہ عمر بھر رونے سے نجات مل گئی ہے اسے۔“  
”ابا؟“

راجہ ابا کے سینے سے لگ گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا.....! یوں سمجھو تمہاری سزا ختم ہو گئی۔ اب یہ رونے کا نہیں، شکر کا مقام ہے۔  
روئیں گے وہ جنہوں نے تمہاری قدر نہیں کی۔“

”ارے.....! انہیں تو اللہ ایسی سزا دے گا کہ وہ عاشرت پکڑے گی۔“

اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالیں؟

”بس بیٹا.....! تم صبر کرو۔ تمہارے لئے زندگی ختم نہیں ہو گئی۔ ہمت سے کام لو۔ تمہارے بچے کو  
تمہاری ضرورت ہے۔“

خوبصاحب راجہ کا سر تھپکتے ہوئے بولے تھے۔

”ابا.....! میں نے بہت کوشش کی، شوہر اور ماس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

راجہ کی ہلکی ہلکی گتھی تھی۔

”میں جانتا ہوں بیٹا.....! اور تمہیں میں الزام تو نہیں دے رہا۔ الزام تو میں قسمت کو بھی نہیں دے سکتا۔

کیونکہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی۔“

خوبصاحب کی آواز بھرانے لگی تھی جب اماں سے بولے۔

”جاؤ.....! اجی کو کھانا دانا کھلاؤ۔“

اماں.....! اٹھو راجہ.....! منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

اماں زبردستی راجہ کو اٹھا کر لے گئیں۔ خوبصاحب کی نظریں شوہری پر جا ٹھہری تھیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”سارا وقت اماں کے ساتھ رہ کر تم بالکل ان ہی کی طرح ہوتی جا رہی ہو۔“

اس روز جہانزیب ہلکے ہلکے انداز میں اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔

”کیسے؟“

”وہ پوچھنے لگی۔“

”مہربان ہو تو بہت مہربان، پھر چاٹک ابھی سی بن جاتی ہو، جیسے اماں کرتی ہیں۔“  
”وہ ہنس پڑی۔“

”ظاہر ہے، جس کے ساتھ زیادہ رہوں گی، اسی کا زیادہ اثر قبول کروں گی ناں.....!“

”تو ایسا کرو، اماں کا مہربانی والا اثر ضرور قبول کرو، لیکن.....“

”میرا خیال ہے، کبھی کبھی ابھی سی بن جانا چاہئے۔“

”کیوں.....؟“

”انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور وہ جانے کہاں کو گئی، پھر اسی طرح کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اچھا لگتا ہے، ایک ہی انداز سے گزرتی زندگی میں پہلی سی بچ جاتی ہے، کچھ داہے، کچھ خدے

اچانک دل کی طرف ایک کردار کو تو اب کیا ہوگا.....؟“ کاراگ لاپنے پر مجبور کرنے لگتے ہیں۔“

”ہاں.....!“

”وہ اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔“

”لیکن میں بھر کے لئے بھی کسی داہے میں نہیں گھرنا چاہتا۔“

”اچھا.....!“

اس نے یوں ہی پلٹیں جھینک کر تصور ٹوٹ گیا۔ گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھا اور پریشان ہو گئی کہ پتا

نہیں اٹھانے میں کیا کہہ گئی ہے.....؟

”کیا بات ہے.....؟“

”وہ کیونکہ اسی پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، اس لئے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت نظر انداز نہیں کر سکے۔“

”سک..... کچھ نہیں.....!“

”تم پریشان کیوں ہو گئیں.....؟“

”شاید اماں نے آواز دی ہے۔“

”وہ بات بدلتے ہوئے بولی اور پھر سننے کی کوشش کرنے لگی۔“

”اماں نے تو آواز نہیں دی، البتہ ٹیلی فون کی ٹھٹھکی بج رہی ہے۔ جاؤ دیکھو کون ہے.....؟ اور اگر میرا فون

ہو تو منع کر دینا۔“

”وہ جلدی سے اٹھ کر آگئی اور یہی سوراخانے سے لگاتے ہی جواز واز ساتوں سے ٹکرائی، اس سے وہ پکرا کر

روٹی۔ بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور آواز دبا کر بولی۔“

”جہیں یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا.....؟“

”ارے.....! جانیو۔“

وہ پہلے حیران ہوا، پھر فوراً کہنے لگا۔

”خبر معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے؟“

”لیکن تمہیں یہاں فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں چاہیے! لیکن میں کیا کروں؟ دل کی بے قراری جین نہیں لینے دیتی۔ تم پلیز! ایک بار مجھ سے ملو۔“

”نہیں! یہ ممکن نہیں ہے، اور سنو۔! آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔“

”اتنی سنگ دل مت بنو۔ میں تمہارے بغیر۔“

اس نے کرڈیل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا، پھر پہلے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کیا، اس کے بعد ریسیور رکھ کر بکھن میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

جلد عروسی میں سر جھکائے جھکائے اس کی گردن میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے سیما اسے یہاں بٹھا کر یہ کہتے ہوئے گئی تھی کہ وہ دانیال کو کبھی نہیں آئے گا۔ اور وہ اب بھی نہیں آتا تھا۔ جھکی نظروں سے ہی وہ کتنی بار سارے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی اور اب تو اسے ہر شے یاد ہو چکی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھی، کیا چیز کہاں رکھی ہے؟

”زندگی کا پہلا سبق!۔“

وہ سوچتے ہوئے بے ساختہ ہنسی تھی، جب ہی دروازے پر آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے فوراً اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھی۔ پھر آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

”اب تم آنکھیں کھولو کی تو مجھے اسے سامنے دیکھو گی، بالکل پاس!۔“

دانیال نے اس کے کان کے قریب سر گوشی میں اپنی بات دہرائی تو وہ حیرت سے مٹ گئی۔

”جھینک پوچھنا!۔“

دانیال اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”تم نے میری بات مان لی!۔“

”کون سی بات؟“

وہ بے ساختہ پوچھ گئی۔

”ارے! اتنی جلدی بھول گئیں؟ کیا تم میری بات مان کر یہاں تک نہیں پہنچیں؟“

دانیال نے ذرا سانس کر کہا، لیکن وہ ابھی بھی نہیں سمجھی۔

”اوہو بھئی! میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ گھر جا کر کہہ دو کہ تم شادی کر دو گی تو صرف دانیال حسن

ہے۔“

دانیال نے خول ہی یاد دلایا تو اس کے ہونٹ خود بخود مسکراہٹ کے انداز میں سکڑ گئے۔

”مجھے اچھا لگا، تم نے میرے لئے اسٹیڈ کیا۔“

دانیال نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہا تھا تو اسے یہی سمجھنا چاہئے۔

اور یہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ ابانے اچانک اس کے حق میں کیسے فیصلہ سنا دیا تھا۔؟

”خیر!۔! اب تم میری ہو۔ میری زندگی کی ساتھی!۔!“

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”اور میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماں باپ کے بعد میرے لئے سب سے محترم میرے بھائی

اور بھائی ہیں۔ میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں اور تم سے بھی میں یہی چاہوں گا۔“

”میری طرف سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

اس نے کہا تو وہ اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بولا تھا۔

”مگر!۔!“

پھر صبح اس سے پہلے کہ سیما اس کے کمرے میں آتی، وہ دانیال کے کہنے پر ہی اس کے ساتھ ڈانگنگ روم

میں آگئی۔ سیما ناشیدہ لگا رہی تھی۔ ان دونوں نے سلام کیا تو پہلے حیرت سے دیکھا، پھر ایک دم تسخیر کر مسکراتے

ہوئے بولی تھی۔

”خوش رہو!۔! آ جا رہو!۔! میں ابھی تم دونوں کو بلانے کے لئے آ رہی تھی۔“

”بس!۔! اب آپ کی پریکٹس ہوئی کبھی!۔!“

دانیال نے یہ کہتے ہوئے حانیہ کے لئے جیبر کھینچی، جب ہی کمال حسن آگئے اور ان دونوں کو دیکھ کر

ہلے۔

”ماشا اللہ۔!“

”السلام علیکم!۔!“

حانیہ نے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!۔! بیٹھو بیٹا!۔!“

وہ کہتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔

”ارے بھائی!۔! یہ سب آپ نے بنایا ہے۔؟“

دانیال ناشتے کے لوازمات دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

”کیا بات کرتے ہو دانی.....؟ اپنی پوری زندگی میں کبھی تمہیں ناشتے میں پراٹھا ملا ہے.....؟“  
کمال حسن نے کہا تو سیماء ندی اندر تھلا کر بولی۔  
”نہیں دانیال.....! یہ سب تمہارے سرال سے آیا ہے۔ خوبصورت صاحب دے گئے ہیں۔“  
”ارے.....! تو آپ نے خوبصورت صاحب کو روکا نہیں کیا.....؟“  
وہ ایک نظر ٹائیپ پر ڈال کر بولا تھا۔

”بہت روکا تھا بھی.....! یہ بھی کہا کہ ہمارے ساتھ ناشتہ کر لیں، لیکن انہیں جانے کس بات کی جلدی تھی.....؟ خیر.....! تم لوگ ناشتے کے بعد جا کر مل آنا ان سے۔ لوٹنا ٹائیپ.....! انہیں تو ہوتی رہیں گی، تم ناشتہ شروع کرو۔“

سیماء نے کہتے ہوئے ڈش اٹھا کر ٹائیپ کے سامنے رکھی پھر جیسے اچانک یاد آنے پر پوچھنے لگی۔  
”ہاں ٹائیپ.....! رات شادی میں تمہاری بہن نظریں آئی.....؟“  
وہ ہرگز کبھی اس بات کے لئے تیار نہیں تھی، جب ہی پریشان ہو گئی۔  
”ارے بھابی.....! آپ نے نہیں دیکھا رابعہ کو.....؟“  
دانیال نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ موجود تو تھی۔

”اچھا.....! آئی تھی کیا.....؟“  
سیماء مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔  
”لیجئے.....! اس کے بغیر شادی ہو سکتی تھی بھلا.....؟“  
دانیال نے اسے مشکل سے نکال لیا تھا۔ وہ مومنیت کے احساس میں گھر کر بجلی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد ہی دانیال اسے اس کے سینکے لے آیا تو گوکہ اماں ابان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے، پھر بھی ان کے چہروں پر غم مند ہی وہ محسوس کر رہی تھی۔ دانیال، ابائے کے ساتھ پائیں کرنے لگا اور وہ اشارے سے اماں سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا ہوا ہے.....؟ سب ہی انداز سے شوٹی کے رونے کی آواز سن کر وہ چونک کر بولی۔  
”اماں.....! رابعہ.....؟“

”ہاں.....! رابعہ اندر ہے، جاؤ مل لو.....!“  
اماں نے کن اکلیوں سے دانیال کو دیکھ کر کہا تو فوراً اٹھ کر اندر آ گئی۔

”رابعہ.....!“  
اس کے انداز میں پتہ چلا کہ وہ اندر آئی تھی۔  
”ارے ٹائیپ.....!“

رابعہ نے اسے گھٹے لگا لیا، پھر اس کا چہرہ دیکھ کر بولی۔  
”ماشا اللہ.....! بہت پیاری لگ رہی ہو۔“  
”تم.....؟ اس وقت.....؟“

اس نے رابعہ کی بات جیسے ہی سنی نہیں۔  
”میرا مطلب ہے، شادی میں تو تم نہیں آئیں.....؟“  
”ہاں.....! بس تم بغیر مہمان.....! دانیال بھی آیا ہے.....؟“  
رابعہ اسے دیکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
”ہاں.....! وہ ادا کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”چلو.....! پھر تم بھی اور ہی جاؤ.....! دانیال کی نظریں تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔“  
رابعہ نے لمبے لمبے منٹوں میں سوئے ہوئے کہا تو وہ ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔  
”رابعہ.....! سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“  
”ہاں.....! سب ٹھیک ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو.....؟“  
رابعہ کی زبانی مسکراہٹ نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

”کیونکہ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ تاؤ رابعہ.....! تمہیں میری قسم.....! بتاؤ.....! کیا ہوا ہے.....؟“  
رابعہ کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کچھ بول نہیں پائی تو کارز خیمل کی دروازے سے ایک ہیچ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔ اس نے ناگہی کے عالم میں پیچہ کو، پھر رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ آنسو پونچھتے ہوئے زرخ موڑ گئی تو اس نے جلدی سے ہیچ کھول کر دیکھا تو جیسے آسمان سر پر آن کر اٹھا۔  
”طلاق.....؟“

”ہاں.....! شاید ہمارے ماں باپ کی قسمت میں ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ آباد دیکھیں۔“  
رابعہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ رہی تھی، اور وہ سناٹے میں کھڑی تھی۔  
☆.....☆.....☆

دانیال محسوس کر رہا تھا کہ مینکے سے آکر وہ چپ چاپ ہے۔ صبح الہوی خوشی سے اس کے چہرے کو جو تانہا کی بخشی تھی، اس کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ آنکھوں سے نظر آ میرا داسی چمک رہی تھی۔ کتنی دیر وہ انتظار کرتا رہا کہ کوئی بات ہوگی تو وہ خود ہی بتاے گی، لیکن وہ اس کی باتوں کا جواب بھی ”ہاں،“ میں دے رہی تھی۔ آخر اسے خود ہی پوچھنا پڑا۔ محبت سے اس کے کندھے تھام کر بولا تھا۔

”کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟ خوشی کے ان لمحات میں تمہاری آنکھوں کی قدیمیں مانند کیوں پڑ گئی ہیں؟ کوئی ساتھ ہوا ہے یا ایک ہی رات میں، میں تم سے بہت دور ہو گیا ہوں؟“

”نہیں دانیال!۔۔۔“

وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چمپا کر دو پڑی۔

”ٹانیہ!۔۔۔ ٹانیہ!۔۔۔ پلیز!“

وہ پریشان ہو گیا۔

”ٹانیہ!۔۔۔ میں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔ پلیز!۔۔۔ اس طرح مت رو۔“

”مم!۔۔۔ مجھے معاف کر دیں دانیال!۔۔۔ میں نے آپ کو پریشان کیا۔“

وہ تھیلیوں سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”کیا میں تم سے رونے کا سبب بن چکا ہوں؟“

اس نے کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔ پھر رکتے ہوئے بولی تھی۔

”راجہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہے۔“

”واٹ؟“

دانیال واقعی شاکمزد ہوا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں!۔۔۔ اوہ لوگ بہت ظالم ہیں۔“

اس کے آنسو پھر چھٹک گئے۔

”پھر میں تم پر روری ہو؟۔۔۔ یعنی راجہ ساری زندگی ان کے ظلم سہی رہتی، جب ٹھیک تھا؟ نہیں

ٹانیہ!۔۔۔ ایسا اچھا ہوا ہے کہ جلدی اس کی جان چھوٹ گئی۔“

وہ خود پر قابو پا کر اسے سمجھانے لگا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم خود سوچو۔ راجہ کی طرف سے تمہارے ماں باپ ہر وقت غمر مند

رہتے تھے یا نہیں؟“

”لیکن دانیال!۔۔۔ لوگ جو باتیں بنائیں گے، اس سے ماں باپ کو تکلیف نہیں ہوگی کیا۔۔۔“

”یہ اس تکلیف سے کم ہوگی جو راجہ کو سسرال کے مظالم سے دیکھ کر انہیں ہو رہی تھی۔ پھر یہ چند دن کی

تکلیف ہے۔ بہت جلد لوگوں کو اور موضوع مل جائے گا، سمجھی؟“

اس نے ٹانیہ کی شوڑی پکڑ کر ہلائی، پھر اس کے زخار پر شہر آنسو اپنی آنکھ کی پور پر رکھ کر اسے

دکھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اس کی قیمت جانتی ہو؟“

وہ ایک نظر اس کی آنکھ پر چپکتے قطرے پر ڈال کر پھرا سے دیکھنے لگی۔

”میری جان سے بڑھ کر ہے۔“

اس نے مسکرا کر اس کا آنسو اپنے ہونٹوں سے چھوا، پھر اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا۔

”بہت بری ہوتی!۔۔۔ سارا دن ایسے ہی پریشان ہوتی رہیں؟“

”آئی ایم سوری!“

وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”چلو!۔۔۔ اب سو جاؤ!۔۔۔! تم کو تمہارے مجھے ہوئے دماغ کو آرام ملے۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے ٹیکہ سیدھا کیا تو وہ بے بسی سے بولی۔

”مجھے خیر نہیں آئے گی دانیال!۔۔۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”وہ تو ہو گا ہی، میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لاتا ہوں۔“

وہ زبردستی اسے لٹا کر کمرے سے نکل آیا۔ آگے سیما بچن سے نکل کر آ رہی تھی، اسے دیکھ کر تعجب سے

پوچھنے لگی۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں؟ بارہ بج رہے ہیں۔“

”جی۔۔۔ وہ بس۔۔۔“

وہ کبھی کہہ نہ سکا۔

”کیا بس؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ سچ بتاؤ! تمہارے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔“

سیما ایک کانیاں تھی، اور وہ اسے اپنا سب سے بڑا راز اور داور خیر خواہ سمجھتا تھا۔

”اصل میں بھائی!۔۔۔ ٹانیہ مصلحتی بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں اس کے

لئے چائے بنانے آیا تھا۔“

”ارے! تو مجھ سے کہو! میں بنا دیتی ہوں چائے، لیکن ٹانیہ!۔۔۔ میرا مطلب ہے، وہ کیوں

ڈسٹرب ہے؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟“

سیما نے گلاٹ کا اظہار کر کے پوچھا۔

”وہی بتائے آیا ہوں آپ کو!۔۔۔!“

اس نے کہا تو سیما فوراً بولی۔

”ہاں ہاں!۔۔۔ یولو!“

”وہ بھائی!۔۔۔ آپ نے بتایا تھا ناں کہ ٹانیہ کے لئے راجہ کی سسرال سے پر پوزل آیا تھا۔؟“

”ہاں ہاں!۔۔۔ پھر؟“

سیا کی ہے صبری وہ محسوس ہی نہیں کر سکا۔

”پھر بس.....! وہ لوگ دھاندلی کر رہے تھے کہ اگر ان کے بیٹے کا پوزل ریجنکٹ ہوا تو وہ رابعہ کو طلاق دے دیں گے، اور انہوں نے طلاق دے دی ہے۔“

وہ بے حد نفوس سے بتا رہا تھا۔

”ارے.....! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا جیج جی؟“

سیا نے پریشانی ظاہر کی۔

”جی.....! اسی لئے تائید و ضرب ہے۔ آپ پلیز.....! اس کا خیال رکھیں۔ میرا مطلب ہے، اس کی خاموشی اور اداسی کو اس پر جتنے کا جتن لگائیں، وہ بہت پریشان ہے۔“

”ارے نہیں.....! اچھا ہوا تو نے مجھے بتایا۔ میں خیال رکھوں گی۔ اب تم جاؤ اس کے پاس.....! اکیلا مت چھوڑو اسے، میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔“

سیا کہتے ہوئے تیزی سے بچن کی طرف بڑھ گئی تو وہ وہاں اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆☆☆

خوئیہ صاحب کو ایک تو پہلے ہی گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی، اوپر سے ان کے روٹ کی دین آ کے نہیں دے رہی تھی۔ وہ انتہائی کوفت کا شکار تھے۔ مزید اسد و لڑکوں کے ساتھ ان کے سامنے ان کھڑا ہوا اور ڈھٹائی کے ساتھ فاحشہ انداز میں بولا تھا۔

”السلام علیکم اکل!“

خوئیہ صاحب نے آواز پر ہی اسے دیکھا اور فوراً منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

”نامراض گلے ہیں بڑے صاحب؟“

ایک لڑکے نے کہا تو دوسرا بھی فوراً بول پڑا۔

”سلام کا جواب بھی نہیں دیا؟“

”شاید انہیں بتائیں ہے کہ سلام کا جواب دینا فرض ہے؟“

پہلے لڑکے نے پھر کہا تو اسد اسے دیکھ کر بولا۔

”اب نہیں.....! سب پتا ہے انہیں، کچے مسلمان ہیں، پانچوں وقت مسجد جاتے ہیں۔“

”اچھا.....! پھر بے چارے کو تنگے بہرے ہوں گے؟“

”گو تنگے نہیں، گنگ.....! اچانک صدمے نے ہی تم کو دی ہے بڑے صاحب کی۔“

اسد نے مسخر آڑ لیا۔ خوئیہ صاحب اس کے منہ نہیں گلتا چاہتے تھے۔ فصر ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی

اور.....! کہتے کبھی ادھر۔

”جیج جی.....! ایسا کون سا پانچو ٹا جو بے چارے کو اپنے پرانے کی پہچان ہی نہیں رہی؟“

لڑکے نے اسد سے پوچھا تو وہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”اب.....! اچھے نہیں پتا؟“

پھر دوسرے لڑکے سے۔

”ابے.....! اے نہیں پتا چلا، تو بتا اسے، پوری داستان سنا۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ داستان سنا شروع کرتا، خوئیہ صاحب نہ آنے والی دین پر لعنت بھیج کر تیز قدموں سے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ پیچھے وہ تینوں بلند آواز میں غصہ رہے تھے۔ ان کی مکروہ نفسی گھر تک لوہہ صاحب کا تعاقب کرتی آئی تھی۔

”کم بخت.....! بد ذات.....! انا بخار.....!“

خوئیہ صاحب گھر میں داخل ہوئے تو ان کے منہ سے ایسے ہی الفاظ نکل رہے تھے۔

”ہائیں.....؟ کیسے گالیاں دے رہے ہیں؟“

اماں ان کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ کر خائف ہو کر بولیں۔

”کسے دوں گا؟ سارے شہر میں ایک ہی تو بد ذات ہے۔ کم بخت نے راستہ چلنا مشکل کر دیا ہے۔

اٹتے جاتے آواز کی کتا ہے۔“

خوئیہ صاحب پھٹ پڑے تھے۔

”کون؟.....! اسد؟“

اماں کا دھیان اسی کی طرف گیا تھا۔

”میری بیٹی کو طلاق دلو اگر بھی جین نہیں ملا اسے؟ اور اب آپ کیوں اس کی بدتمیزیوں برداشت

رہتے ہیں؟ پہلے تو رابعہ کی وجہ سے مجبور تھے، اب کیا مجبوری ہے؟“

”سب سے بڑی مجبوری اپنی رہی تھی عزت بچانا ہے۔ کیا کروں؟ وہ بھی خاک میں ملا دوں

لیا؟ وہ تو بچ ہے، جو منہ مٹا اسے کچے چلا جاتا ہے۔ پانچویں رابعہ نے کیسے تین سال اس گھر میں گزارے

ہیں؟ اسے تو بہت پہلے خود ہی چھوڑ کر آ جانا چاہئے تھا۔“

”بس.....! اب آگئی ہے ناں.....! اچھ ہو جائیں۔“

اماں نے رابعہ کو اتے دیکھ کر کہا۔

”ہاں بس.....! اب یہی سزا ہے ہماری۔ چپ چاپ، گونگے بہرے بن جائیں، اچھی سزا ہے۔“

”اما.....!“



راہب بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

”ابا! میں نے جتنا چاہا کہ میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، انتہائی میں آپ کے لئے دکھ تکلیف کا باعث بن گئی ہوں۔“

”ارے نہیں بیٹا!۔“

خواجہ صاحب ایک دم نرم پڑے گئے۔

”ہم اپنی قسمت کے دکھ تحمل رہے ہیں تمہارا کوئی قصور نہیں!۔“

”میرا قصور نہیں، میرے بچے کا قصور نہیں، پھر ہمیں اتنی بڑی سزا کیوں ملی؟۔“

وہ رونے لگی۔

”سزا مت کہو بیٹا! آزماتش ہوتی ہے۔ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

خواجہ صاحب کی آواز بھر اگلی تھی۔

”پیارے بندوں کو ناں! اگر میں تو بہت بری ہوں ابا!۔“

”کون کہتا ہے تم بری ہو؟ تمہارے جیسی نبی فیصلہ والوں کو ہی ملتی ہے۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں بیٹا! مجھے فخر ہے تم پر۔ تمہاری ذات سے مجھے اور تمہاری اماں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، البتہ تمہارا روننا ہمیں تڑپاتا ہے۔“

خواجہ صاحب نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

”میں اب نہیں روؤں گی، کبھی نہیں روؤں گی۔“

”شباباش! تم میری بہادر بیٹی ہو۔ تمہیں بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ کرو گی ناں!۔“

خواجہ صاحب اس کا چہرہ دیکھنے لگے تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بزدلی سے سرکائی، پھر پوچھنے لگی۔

”ابھی اسد نے آپ سے کیا کہا ہے؟۔“

”کچھ نہیں! تم جاؤ، اپنے بچے کو دیکھو!۔“

خواجہ صاحب، راہب کو نال کر تیکم سے مخاطب ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ایک تو اس کے لیے میں آ زرد گی، دوسرے یہ خوف کہ اگر اس گھر میں کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو اس کی لعنت رہ جائے گی؟۔ مختلف کیفیات کی بدولت اس کا ذہن بری طرح متاثر تھا۔ کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ جیسا کرتا کچھ چاہتی اور کچھ جانی تھی۔

اس وقت بھی جمنا زیب کو کہیں جانا تھا اور وہ بڑی جلالت میں اسے اپنے کپڑے استری کرنے کا کہہ کر نہانے چلے گئے اور جب وہ نہا کر نکلے تو وہ بڑے اٹھناک سے ان کے جوتے پالش کر رہی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ وہ کپڑے پر پس کرنے کے بعد یہ کام کر رہی ہے۔ جیسا اصرار اصرار نظر ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں؟۔“

”کپڑے؟۔“

وہ جوتے رکھ کر کھڑی ہو گئی، پھر الماری کھول کر ان سے پوچھنے لگی۔

”کون سے کپڑے نکالوں؟۔“

”کیا مطلب؟ ابھی تک تم نے کپڑے نہیں نکالے۔“

وہ پہلے حیران ہوئے، پھر سمجھا کر آگے بڑھے اور کپڑے نکال کر خود ہی پر پس کرنے لگے۔

”لائیے!۔ میں کر دیتی ہوں۔“

”نہیں! ارے نہ دو۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئی اور ابھی ان کے رڈیے پر غور کر رہی تھی کہ وہ کپڑے لے کر کاتھ روم میں چلے گئے۔ کچھ پر بعد نکلے تو بڑی جلالت میں جوتے پہنے، بالوں میں بڑش کیا اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

”جمنا زیب!۔“

وہ چونک کر ان کے پیچھے لپکی، لیکن وہ باہر نکل چکے تھے۔ اس کے دل کو گھسی سی گئی اور بہت سوچنے پر بھی

سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر غما ہو کر نکلے ہیں؟۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راہب کو اب اپنے آجڑے کا غم نہیں تھا۔ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کی فکر تھی، اور ان کی خاطر ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ رون، گونہنا چھوڑ کر ایک دن کے عزم سے اپنا اور اپنے بچے کا سوچنے لگی تھی۔ اس وقت وہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے ”ضرورت ہے“ کا کالم دیکھ رہی تھی کہ اماں اسے پکار کر بولیں۔

”راہب بیٹا!۔ تمہارا سبابا بڑے گئے ہیں۔ شوبی کے دودھ وغیرہ لے لئے رکھ لو۔“

”کیا؟۔“

عجیب مشکل میں پڑ گئی تھی وہ کہ اب جبکہ وہ خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکی تھی تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ یعنی ہر دوسرے دن اس کا فون آ جاتا۔ پہلے اپنی بے قراری کی داستان سناتے کی کوشش کرتا اور پھر ملنے پر اصرار، جبکہ وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی اپنی غلطی پر اندام تھی اور اب دوسری غلطی کا تو وہ قصور نہیں بھی کر سکتی تھی۔ اسے صاف لفظوں میں منع تو کر دیتی، لیکن پھر اس کا اپنا طمیان بھی رخصت ہو جاتا تھا۔

اس نے اماں کے ہاتھ میں پیسے دیکھے، پھر شرمندگی میں گھر کر پئی۔  
 ”نہیں اماں! آپ ہی رہیں، مجھے الگ سے شوبی کے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ جو گھر میں ہوگا، شوبی بھی وہی کھائی لے گا۔“

”ارے! اتنا سا بچہ کیا کھائی سکتا ہے دودھ، بسکٹ کے علاوہ...؟ یہ تو رکھ لو...!“  
 ”اماں! نہ مجبور کریں مجھے۔ پہلے ہی مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔“  
 اس نے کہا تو اماں ناراضگی سے بولیں۔  
 ”ایسا مت کہو! بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں۔“

”جیسا بیٹیاں اُچڑ کر داکھ سینے آ جائیں تو بوجھ ہی ہوتی ہیں اماں! اماں باپ اپنے منہ سے بے شک نہ کہیں، لیکن سچ یہی ہوتا ہے، اور میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ میں جاب کروں گی۔ اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پال سکتی ہوں میں۔“  
 اس کی بات سن کر اماں پریشان ہو گئیں۔

”میں جانتی ہوں، لیکن بیٹا! تم ابھی سے جاب کرنے کا مت سوچو۔“  
 ”کیوں؟“

اسے اماں کی پریشانی سمجھ نہیں آئی۔  
 ”کیونکہ ہم لوگوں کی زبانیں نہیں بکڑ سکتے۔ ابھی اتنی باتیں بتا رہے ہیں لوگ، تمہارے جاب کرنے پر تو انہیں اور موقع مل جائے گا کہ چاروں ہم جتنی بوجھ کرئیں کھلا سکے۔“  
 ”ہاں! انہیں کھلا سکے۔“

وہ ترخ کر پئی تھی۔  
 ”کہہ دیں آپ لوگوں سے کہ میرا اور میرے بچے کا بوجھ آپ نہیں اٹھا سکتے، پھر کیا کریں گے لوگ؟ نہیں گے۔؟ جنس میں جتنا نہیں سکتے ہیں۔“

”بس! چپ ہو جاؤ! تمہیں جو کرنا ہو، پہلے اپنے ابا سے پوچھو۔“  
 اماں نے اسے چپ کر دیا تو وہ قدرے ڈک کر پوچھنے لگی۔  
 ”ابا منع کریں گے کیا؟“  
 ”مجھے نہیں پتا۔!“

اماں اتنا کہہ کر چلی گئیں تو وہ بے دلی سے اخبار سیننے لگی۔ لیکن اس نے غمان لیا تھا کہ وہ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر بیٹھ نہیں رہے گی۔ جب ہی رات میں وہ خواجہ صاحب کے پاس آ بیٹھی۔  
 ”ابا! ایک بات کہنی تھی۔“

”ہاں! کہو بیٹا! انگلی پائی کیوں ہو؟؟ جو کہنا ہو، بلا جھجک کہہ دیا کرو۔“  
 خواجہ صاحب نے بڑے پیار سے اس کی ہمت بندھائی تو اس نے ایک نظر اماں کو دیکھا، پھر بھی رک کر بولی تھی۔

”وہ... ابا! اگر آپ اجازت دیں تو میں جاب کر لوں۔؟“  
 ”جواب؟“

خواجہ صاحب چند لمحوں کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگے۔  
 ”بیٹا! مجھے اعتراض تو نہیں ہے، لیکن تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو...؟ میرا مطلب ہے، اگر تم یہ بھیتی ہو کہ تم پر بوجھ بن گئی ہو تو یہ بے کار سوچ اپنے ذہن سے نکال دو۔ میری بوڑھی بیٹیوں میں ابھی اتنا دشمن نہ رہا ہے کہ تمہاری اور شوبی کی ضرورتیں پوری کر سکیں۔“  
 ”بات صرف ضرورتوں کی نہیں ہے ابا! احساس کی بھی ہے۔ میں اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہوں گی تو پھر شاید میرے ہر ذمہ دار کی احساس مت جائے گا۔ مجھے اپنی ذمہ داری خود اٹھانے دیں۔“

اس بات پر خواجہ صاحب خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگے۔  
 ”ابا! اگر آپ نہیں چاہتے تو۔“  
 ”نہیں نہیں بیٹا!۔“

خواجہ صاحب فوراً بولے تھے۔  
 ”میں نہیں کہیں چاہوں گا؟؟ تم اگر ایسا سوچتی ہو، اپنے احساس کو زندہ رکھنا چاہتی ہو تو اچھی بات

نہ۔۔۔“  
 ”ایسا ہی ہے ابا! اماں! آپ کو تو اعتراض نہیں ہے ناں۔؟“  
 اس نے ایک دم اماں سے بھی پوچھ لیا۔  
 ”اب میں کیا کہوں؟؟ تمہاری اگر یہی مرضی ہے تو میں کیا اعتراض کر سکتی ہوں۔؟ میں شوبی کا

دفعہ رہی ہوں۔ سارا دن رہ لے گا تمہارے بغیر۔؟“  
 اماں نے اس طرف اس کی توجہ دلائی، لیکن وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔  
 ”کچھ دن تنگ کرے گا آپ کو، پھر عادی ہو جائے گا۔“  
 خواجہ صاحب اس کی بات پر ہنسنے لگے تھے۔

اور پھر اگلے دن ہی وہ جاب کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ اخبار سے دو تین ایڈریس اس نے نوٹ کر لئے تھے اور ابھی وہ ایک جگہ سے ہی انٹرویو دے کر نکلی تھی کہ اسد اس کے سامنے آکر اہوا اور تسخیرانہ انداز میں بولا تھا۔  
 ”کیا اباں نے بھی نکال دیا۔؟“

”تم؟“

اس کے اندر ڈھیروں ترس بھر گیا تھا۔

”خاکسار کو اسد کہتے ہیں۔“

اسد ڈھٹائی سے سرخ کر کے کہنے لگا۔

”کبھی آپ کا چیتا دیور ہونے کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔“

”دیکھو۔!“

وہ انتہائی غصے سے انگلی اٹھا کر بولی۔

”اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ وہ حشر کروں گی تمہارا کہ۔۔۔۔۔“

”اوہو۔۔۔۔۔! بڑا بولنا آ گیا ہے؟“

وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

”یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔“

”کیسے دھمکی نہیں ہے اسد۔۔۔۔۔! سوچ لو، میں اب تمہارا قطعاً لٹی نظ نہیں کروں گی۔ کیونکہ اب تم میرے

چہیتے دیور نہیں رہے۔“

”دیور نہیں رہا تو کیا ہوا۔۔۔۔۔! کچھ اور تو بن سکتا ہوں۔“

اسد کی مزید ڈھٹائی پر وہ بھی بالکل آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ راستے کا خیال کئے بغیر اس کے منہ پر

زور دیا منہ مار کر غرائی تھی۔

”اپنی اوقات میں رہنا غلط ہے، موالی۔۔۔۔۔! آئندہ میرے سامنے آئے تو متو توڑ دوں گی تمہارا۔“

”کیا ہوا۔۔۔۔۔! کیا ہوا۔۔۔۔۔!“

ادھر ادھر سے لوگ جمع ہونے لگے تو اسد دم دبا کر بھاگ گیا اور وہ اب کہیں اور جانے کے قابل نہیں

رہی تھی۔ گھر جانے والی روٹ کی دین دیکھ کر اس میں بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

دانیال صبح آنس جاتے ہوئے اس سے کہہ کر گیا تھا کہ وہ جلدی آجائے گا، تو اسے اماں کے گھر لے

جائے گا۔ پھر ابھی اس کا فون آ گیا کہ وہ بس آفس سے نکلنے والا ہے۔ تب وہ فوراً اٹھ گئی اور جلدی جلدی اپنا سوٹ

پس کر رہی تھی کہ عیسا اس کے لئے چائے لے کر آئی۔

”ارے بھائی۔۔۔۔۔! آپ نے کیوں زحمت کی؟“

وہ بچ بچ شرمندہ ہو گئی۔

”بس۔۔۔۔۔! اب ان تکلفات میں مت پڑو۔ میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے

۱۱ سال ہیں کریں گے تو کون کرے گا۔۔۔۔۔“

یسانے کہا تو وہ منونیت سے مسکرائی۔

”آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔“

”بس۔۔۔۔۔! اب مجھے چڑھاؤ مت، چائے پیو۔۔۔۔۔!“

پھر اسے استری کا پلک آف کرتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کہیں جارہی ہو کیا۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔! وہ دانیال آنے والے ہیں۔ اماں کے گھر جاؤں گی۔“

اس نے بتایا۔

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔! ارے ہاں۔۔۔۔۔!“

یساجیسے اچانک خیال آنے پر کہنے لگے۔

”مجھے دانیال نے بتایا تھا۔ تمہاری بہن راجہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔! بس۔۔۔۔۔!“

وہ خود افسردہ ہو گئی۔

”توبہ۔۔۔۔۔! کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔۔۔۔۔! ذرا فراموشی بات کو آنا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ بے چاری

راجہ کا کیا قصور جو اس کے ہاتھ میں طلاقی تصادمی۔۔۔۔۔! بچے کا بھی خیال نہیں کیا خالوں نے۔۔۔۔۔! ہا ہائے۔۔۔۔۔!“

یسابظاہر افسوس کر رہی تھی۔

”تمہارے اماں اب تو بہت پریشان ہوں گے۔۔۔۔۔!“

”جی ہاں۔۔۔۔۔!“

”بڑا غم ہے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ۔ اللہ کسی کو ایسے دکھ نہ دکھائے۔ بے چاروں کی کڑوتائی۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔!“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے تیار ہونے کا کہتے ہوئے وہ چلی گئی۔ لیکن اسے متصل کر گئی تھی۔

۱۱ سال آیا تو وہ تیار تو تھی، لیکن سست لگ رہی تھی۔ کہیں جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ دانیال سے

لپکتی۔۔۔۔۔! ناچار اس کے ساتھ چل پڑی۔

آگے اماں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں تو اس کے دل سے بوجھ سڑکنے لگا۔

”بیٹھو بیٹا۔۔۔۔۔! کھڑے کیوں ہو۔۔۔۔۔! چائے۔۔۔۔۔! دانیال کے لئے کرسی ادھر لے آؤ۔۔۔۔۔!“

اماں، دانیال سے کہتے ہوئے چائے سے مخاطب ہو گئیں۔

گلی۔

”بس آئی.....! میں ابھی ایک کام سے جا رہا ہوں۔ پھر آؤں گا تو بیٹھوں گا۔“

دانیال نے خوبصورت صاحب کو جو نہ پا کر بیٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس سے بھی ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا گیا جب اماں اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”تم سناؤ.....! ٹھیک تو ہو ناں.....؟ گھر میں سب کیسے ہیں۔؟“

”اجھے ہیں اماں.....! سب اچھے ہیں۔“

”اللہ کرے اچھے ہی رہیں۔ راہد کی طرف سے دھچکا لگا ہے تو اب دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔“

اماں نے کہا تو وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”ارے اماں.....! سب ایک جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ میری طرف سے تو آپ اطمینان ہی رکھیں۔“

جب ہی راہد کمرے سے نکل کر آئی اور اسے دیکھ کر خوشی اور جیت سے بولی۔

”ارے.....! تم کب آئی ہو.....؟ دانیال نہیں آیا کیا.....؟“

”دانیال ہی چھوڑ گئے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کر راہد کے گلے لگ گئی۔

”کیسی ہو.....؟“

”اچھی ہوں.....! آج ایک جگہ جاب کے لئے گئی تھی۔“

راہد نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بتایا تو وہ بولی۔

”تو تم جاب کر دی.....؟“

”ہاں ٹھیک۔ اڈا کر کوئی اچھی جگہ جاب مل جائے۔“

”مل جائے گی۔ اگر تم کہو تو میں دانیال سے بات کروں.....؟ وہ جہیں اچھی جاب دلوادیں گے۔“

اس نے کہا تو راہد فوراً بولی تھی۔

”نہیں ٹھیک۔! میں سداش سے نہیں جانا جانتی۔ میں اب ہر مشکل سامنا خود کروں گی، اگر ابتداء ہی

میں کسی کا سہارا لے لیا تو پھر مجھ میں کافور نہیں آئے گا۔ تم میری بات کا برا مت ماننا۔“

”ارے نہیں.....! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے.....؟ بلکہ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے ہمت

باندھ لی۔“

وہ واقعی خوش ہوئی تھی۔

”روئے گوشتے کا کوئی خاکہ وہ بھی نہیں ہے۔ خیر چھوڑو مجھے اب اپنی سناؤ، تم نے تو میدان مار لیا۔ کیا لگ

رہا ہے۔؟“

راہد نے اچانک شوخ ہو کر اس کے پہلو میں چٹکی کاٹی تو وہ اماں کی طرف اشارہ کر کے راہد کو گھورنے

”اچھا.....! یہ دانیال کیوں چلا گیا۔؟“

راہد نے پوچھا۔

”اصل میں اب انہیں ہیں ناں.....! اور وہ ہم عورتوں میں بیٹھ کر کیا کرتے.....؟“

اس نے کہا تو اماں توجہ سے بولیں۔

”ہائیں.....؟ دانیال اس لئے چلا گیا کیا.....؟“

وہ اور راہد بے ساختہ ہنسی چھٹی۔

☆☆☆

عباد نے ماں بھائی کے آکسانے پر راہد کو طلاق تو دے دی تھی، لیکن پھر چند دنوں میں ہی اسے حقیقتاً ان میں تار سے نظر آگئے تھے۔ نہ وقت پر کھانا ملتا، نہ کپڑے۔ اس وقت وہ آفس سے آیا تھا۔ راستے کی جام ٹریفک نے ایسے ہی دماغ خراب کیا ہوا تھا۔ سڑک پر جہن میں کھانے کو کچھ نہیں ملا، سامان کی پتیلی خالی پڑی تھی، ہاٹ پاٹ میں روٹی نہ تھی۔ وہ غصے میں ہاٹ پاٹ شیخ کر رہیں سے چلتے ہوئے بتول بیگم کے پاس آکر پوچھنے لگا۔

”امی.....! امی.....! آج کھانا نہیں پکا کیا.....؟“

”پکا تھا، سب پکا تھا۔“

بتول بیگم اس کے تہور دیکھ کر خود بھی اٹھ کر بولی۔

”پھر.....؟ کہاں گیا.....؟ سامان کی پتیلی خالی پڑی ہے اور روٹی بھی نہیں ہے۔“

”کہاں سے ہوگی روٹی.....؟ چار چار سٹنڈرے آگئے تھے کھانے کو، تیرے بھائی نے اٹھا کر کھلا دیا سب

میں۔“

بتول بیگم نے بتایا تو وہ مزید تھمکا گیا۔

”کیوں.....؟ حرام کماتا ہوں میں جو ایسے لٹار رہا ہے.....؟ خود کمائے تو پتا چلے.....؟ اور آپ کو بھی

اساس نہیں ہے.....؟ آفس سے تھکا مارا آ رہا ہوں میں، اب تائیں.....! کیا کھاؤں گا میں.....؟“

”آئے تو شوہر کیوں چارے ہو.....؟ آرام سے کبو بھوک گئی ہے۔ روٹی ڈال دیتی ہوں۔“

”خالی روٹی کا کیا کروں گا.....؟ سامان بھی چاہئے، اور سمجھا دیں اپنے جیتے کو، میں نے اسے اور اس

کے آوارہ دوستوں کو پالنے کا ٹھیک نہیں لے رکھا ہے کسی کام دینے سے لگے، نہیں تو نکل جائے اس گھر سے۔“

اس کی آخری بات پر بتول بیگم کو پٹنگ لگ گئے۔

”ایں.....؟ کیوں نکل جائے.....؟ یہ گھر اکیلے تمہارے باؤ کا نہیں ہے، وہ بھی برابر کا حصہ دار ہے۔“

پھر ابھی تو میں زندہ کھڑی ہوں۔ تم کون ہو تے ہو اسے کالنے والے؟“

بتول بیگم کی اسد کی ناجائز طرف داری پر وہ حیرت اور ڈھکی تھوہری بن گیا۔

”میں کون ہوتا ہوں؟ میں کون ہوتا ہوں؟“ ٹھیک ہے! میں کچھ نہیں ہوں، تو میں ہی چلا جاتا ہوں۔“

اس کے دل پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ پھر بتول بیگم روکتی رہ گئیں، لیکن وہ گھر سے نکل آیا تھا۔ پھر پہلے قریبی ریسٹورینٹ میں کھانا کھایا، اس کے بعد چائے پیتے ہوئے اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ ماں بھائی کی ناجائز باتیں مانتے ہوئے وہ اپنا ایسا نقصان کر گیا ہے جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ اسے شدت سے راجہ اور اپنا بچہ یاد آنے لگے۔ اس کے بارہا سلوک کے باوجود وہ لڑکی اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔

”راجہ!“

اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ چائے کے ساتھ سرگٹ پر سرگٹ چلاتے ہوئے وہ رات گئے تک وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ریسٹورینٹ بند ہونے لگا، تب نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھر آ گیا۔ لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلدی اپنا الگ انتظام کر لے گا۔

”عباد!“

بتول بیگم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اس کے چپچپے کرے میں جلی آئیں۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا؟“

”کھانا نہیں اپنے لا ڈالے کے ساتھ! میرے انتظار میں کیوں بیٹھی ہیں؟“

وہ غصے سے پن میں بولا تھا۔

”ارے! وہ لا ڈالے تو تو کون ہے؟ تو بھی میرے پیٹ کی اولاد ہے۔ تیرے لئے بھی جان ماری ہے میں نے، اس سے کے لئے نہیں ماری۔ جیسی تو آوارہ پھرتا ہے وہ۔ تجھے بھی چھوڑ دیتی تیرے حال پر تو، تو بھی اسی جیسا ہو جاتا۔ آج کسی قابل ہے تو میرا احسان مان!“

بتول بیگم بولے چلی گئیں۔

”احسان مان کر ہی تو آپ کے اشاروں پر چلا رہا ہوں۔ لیکن آپ کو میری بالکل پرواہ نہیں ہے۔ چھوٹے کے سامنے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی ہیں مجھے، اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔“

”ایسا تم کو بیٹا! چھوٹے کی بدتمیزیاں میں بھی تو برداشت کر رہی ہوں۔ کیا کروں؟ کچھ کہتی ہوں تو انا کچھ بھڑاتا ہے۔ مجھے بھی کہاں کچھ بھڑکتا ہے؟“

بتول بیگم رونے لگیں۔

”سوچا تھا شادی کروں گی اس کی، تو جان چھوٹے گی میری۔ لیکن میری قسمت ہی خراب ہے۔ کوئی

لمبیں کھانا نصب میں۔ اب تو بھی چھوڑ کر جا رہا ہے مجھے۔“

”او ڈھکی!“

وہ جھنجھلا گیا۔

”کہیں نہیں جا رہا ہوں میں، آپ جائیں کھانا کھا کر سوئیں۔“

”اور تو؟ تو نہیں کھانے گیا کیا؟“

بتول بیگم اس کے نہ جانے کا سن کر مطمئن ہو گئیں۔

”میں کھا آیا ہوں، آپ جائیں، میں اب سوؤں گا۔“

وہ زبردستی انہیں بھیج کر چلک پڑے گیا تھا۔

☆☆☆

ان کی واہی رات بہت دیر سے ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ کڑی کا بارن سن کر گیت اسی نے کھولا اور ان کے چپچپے چلتی ہوئی اندر آئی تو یوں ہی پوچھنے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”کیوں؟“

وہ ناگوار سی بولی تو وہ شیشا گئی۔ پھر قدرے تاخیر سے بولی۔

”کھانا لاؤں؟“

”نہیں! کھانا میں کھا چکا ہوں۔ البتہ چائے۔“

انہوں نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”سنو!“

انہوں نے پکارا اور اس کے پلٹ کر دیکھنے پر بولے۔

”ذرا دھیان رکھنا، میں نے چائے کے لئے کہا ہے، دودھ مت لے آنا۔“

”جی!“

وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔ ان کی وجہ سے اس نے کھانا نہیں کھایا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے چائے کا پانی رکھ کر چوہا دھیمہ کر دیا اور وہیں کھڑی ہو کر جلدی جلدی کھانا کھانے لگی۔ ساتھ ساتھ ان کی فنگل جب بھی سوجنی جا رہی تھی۔

”تم نے کھانا نہیں کھایا تھا؟“

”تم محسوس مت کرنا۔ اصل میں آج زد وہیب نے عجیب سی بات کہی ہے۔ کہنے لگا، جو بیہیاں اپنے شوہروں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہیں، وہ درحقیقت اپنا خیال رکھ رہی ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

وہ اچانک سناٹوں میں گھر گئی۔

”یعنی اس کا مطلب تھا، اپنی اغرضوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسا کرتی ہیں۔“

”میرے خدا!۔۔۔!“

وہ اپنے آپ کو انتہائی کمزور اور بے بس محسوس کرنے لگی اور کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں بول سکی۔

”تمہیں شاید میری بات بری لگی۔“

وہ اس کو ہونٹ کاٹنے دیکھ کر بولے تو اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا، پھر کہنے لگی۔

”آپ کی نہیں، زد وہیب کی بات بری لگی ہے، اور جیسا کہ آپ نے اس کے بارے میں بتایا تھا تو اس

جیسا بندہ ایسی ہی باتیں کر سکتا ہے۔“

”ہاں!۔۔۔! یہ تم تھک رہی ہو۔“

انہوں نے تائیدی کی تو اس کا دل چاہا کہ آئندہ زد وہیب سے مت ملے گا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر

خاموش ہو رہی اور تین دن کا بہانہ کر کے کروٹ بدل گئی۔

پھر ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھی، دوسرے اب زد وہیب کی بات نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ غالباً

یہ ضد تھا کہ جہاز زیب اس کی باتوں کو بخیرگی سے سوچتے ہوئے کہیں اس کے ہامی کو نہ کریدے نکلیں۔ وہ بالکل نہیں

سمجھ پا رہی تھی کہ وہ اپنے ان مسائل کو کس کے ساتھ شیئر کرے؟

خود ہی سوچتی اور ابھتی تھی۔ جیسی دل کا بوجھ بڑھتا چلا گیا۔ پھر ان ہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے

لگی۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ مسلسل سوچتے رہنے کی وجہ سے سر پکڑانے لگتا ہے اور دل مبتلا یا مبتلا یا سار بہتا ہے، لیکن اس

روز جب وہ ناشتے کی میٹبل سے اٹھ کر بھاگی تو اس وقت شہر ہو گیا اور اس روز وہ اسے اکثر کے پاس لے گئیں

جہاں اماں کے شہ کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اس پر یوں مہربان ہوئیں کہ اسے کسی کام کو اٹھنے نہیں لگانے دیتی

تھیں جبکہ وہ اس صورت حال سے پریشان ہو گئی، کیونکہ ایک مصروفیت ہی تو تھی جو اسے پریشان سوچوں سے دور

رکھتی تھی اور اب بالکل غائب ہو کر تو وہ بوکھلا گئی تھی۔

”جہاز زیب!“

میں کچھ دنوں کے لئے اکی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

اسے فرار کا یہی راستہ نظر آیا۔

”کچھ دنوں کے لئے؟“

وہ مز سوچ انداز میں بولے۔

”ہاں!۔۔۔! اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔؟“

”میں منع نہیں کر رہا۔“

وہ فوراً بولے تو وہ اسی وقت بیک کھل کر اس میں اپنے کپڑے رکھنے لگی۔

☆☆☆

سیما زبردستی دانیال پر یہ جتنی تھی کہ ٹائیڈ اُٹا ہے، ڈسٹر ہے۔ اس نے راجہ کی طلاق کا گہرا اثر لیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ابھی بھی اس نے ایسی ہی باتیں کر کے ٹائیڈ کو آؤٹنگ پر لے جانے کو کہا تا کہ وہ بھل جائے اور پھر اپنے بچوں کو بھی ان دونوں کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر منا کو نوں کرنے لگی تھی کہ کمال حسن آگئے۔

”آج آپ نے بہت دیر کر دی؟“

سیما نے کھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بس!۔۔۔! آؤٹ چل رہا ہے، اس لئے دیر ہو گئی۔“

کمال حسن جیسے تھکے انداز میں بیٹھ گئے تو وہ آؤٹ کھڑی ہوئی۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔“

”ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ شام میں جائے کے ساتھ سینڈوچ لئے تھے۔“

انہوں نے کہا تو وہ بارہ بیٹھے ہوئے بولی۔

”چلیں پھر پیچ آ جائیں تو ساتھ ہی کھالیں گے۔“

”پیچ؟ پیچ کہاں گئے ہیں؟“

”وہ۔۔۔ دانیال اور ٹائیڈ جا رہے تھے تو ان کے ساتھ۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کمال حسن نے ٹوک دیا۔

”کیوں جانے دیا تم نے بچوں کو۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، ڈلہا ڈلہن کے گھومنے پھرنے کے دن ہیں،

بچہ چنگ کریں گے انہیں۔“

”بھئی!۔۔۔! میں نے تو بہت روکنے کی کوشش کی، لیکن رد چل گئی۔ پھر دانیال کا آپ کو پتا ہے، بچوں کا

رونا برداشت نہیں کرتا۔ میرے منع کرنے کے باوجود لے گیا دونوں کو۔“

”اچھا!۔۔۔! میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اگر جو ساؤں تو کھانے پر مت اٹھانا۔“

کمال حسن یہ کہتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تب اس نے ریسور اٹھا کر حنا کا نمبر ڈائل

”باقی تھیں، مگر کینسل ہو گئی ہیں۔ چلیں اب آپ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کریں، میں ناشتہ بناتی ہوں۔“

اس نے سہما کے ہاتھ سے بڑک پکٹ لے لیا۔

”نہیں بھئی! تم ابھی سے چوہا ہانڈی کے چکر میں مت پڑو۔ ابھی تمہارے گھونٹے پھرنے کے،

آرام کرنے کے دن ہیں۔“

سیمانے اوپر سے دل سے کہا ورنہ تو وہ خوش ہو گئی تھی۔

”بس! بہت آرام کر لیا بھالی!..... آج پوچھیں تو میں بور ہو گئی ہوں۔“

اس نے کہا تو سیمانے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”ہیں؟ ابھی سے!.....“

”میرا مطلب ہے، فارغ بیٹھ بیٹھ کر۔“

”اچھا!..... میں بھی دانیاں سے۔“

سیمانے بھی ہنسی۔

”چلو پھر ترانہ فرمائی کر کے چائے دم کرو، میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔“

”جی.....!“

وہ سیمانے جاتے ہی انڈے فرائی کرنے لگی۔ ساتھ ہی چائے کا پانی بھی رکھ دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ پہلے دن دانیاں ناشتے میں پراخے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا، تو وہ جلدی جلدی اس کے لئے پراٹھا بنانے لگی۔ تب ہی دانیاں تیار ہو کر بچن کے دروازے تک آ کر رک گیا اور دیکھی سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ٹائیہ کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو اسے دیکھ کر بولی۔

”بس!..... ناشتہ تیار ہے۔ آپ جائیں، میں لے کر آتی ہوں۔“

”میں کہاں جاؤں؟ زندگی تو یہاں ہے۔“

وہ قریب آ گیا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”کیا کر رہے ہیں؟ ابھی بھالی آ جائیں گی۔“

”آنے دو!..... میں کوئی چوری تو نہیں کر رہا ہوں۔“

دانیاں نے عقب سے اس کے کندھے پر اپنی شوڑی لٹکائی تھی کہ سیمانے کی آواز سن کر خودی گھبرا کر بھاگ گئی۔ وہ بمشکل ہنسی روک کر چائے دم کرنے لگی۔

آج وہ جاب کے لئے بے حد خوار ہوئی تھی۔ دو تین جگہ انٹرویو دے کر گھر لوٹی تو تھکن سے زیادہ مایوسی لے لے اسے نہ حال کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا، یہ سیدھی کرے میں جا کر لمبی ٹان کر سو جائے۔ لیکن اماں سامنے برآمدے میں ہی بیٹھی تھیں۔

”کیا کر رہی ہیں اماں.....؟ شوٹی کہاں ہے.....؟“

اس نے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”شوٹی ابھی سویا ہے۔“

اماں نے بتایا۔

”آپ کو کب تو نہیں کیا شوٹی نے.....؟“

وہ پیروں سے سینڈل اتارتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ارے نہیں بیٹا!..... اب تو مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ کیلتا رہتا ہے۔ مجھے بھی بہلاتے رکھتا

ہے۔“

اماں کے لہجے میں شوٹی کے لئے محبت اُندر ہی تھی۔

”اچھا!.....!“

”چلو!.....! تم نے ہاتھ دھو، میں تمہارے لئے کھانا گرم کرتی ہوں۔“

اماں کہتے ہوئے اٹھنے لگیں کہ وہ روک کر بولی۔

”آپ بیٹھی رہیں اماں!..... میں لے لوں گی کھانا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اماں اچانک یاد آنے پر بولیں۔

”ارے ہاں!.....! رابعد!.....! تمہارا نام خط آیا ہے۔“

”کیسا خط؟.....؟“

وہ کھلی تھی۔ اماں نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا تو اس نے جھپٹ کر

لفافہ کھولا اور اس میں سے پیپر نکال کر دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔

”اماں!.....! مجھے جاب مل گئی۔ یہ میرا پائلمنٹ لیٹر ہے۔“

”شکر ہے!.....!“

اماں نے کہا۔

وہ پھر بیٹھ گئی۔

”اچھی جگہ سے پائلمنٹ آیا ہے، ورنہ آج تو میں مایوس ہی ہو گئی تھی۔“

”بیٹا!.....! تمہیں ہی شوق ہے، ورنہ ایسی کوئی مجبوری تو نہیں تھی تمہاری دو وقت کی روٹی ہم پر بھاری تو

آیا تو؟“

”اتنی بہت نہیں کر سکتا اماں.....! وہ۔“

وہ تھلا کر بولی تھی۔

”دروازے پر تو چیخ چلا سکتا ہے، سارا محلہ سنے گا اس کی بکواس۔“

اماں نے کہا تھا کہ اس وقت ڈور بتل بجتے تھے۔

”وہی نامراد ہوگا۔ کیا کروں.....؟ تمہارے باپ کو فون کروں.....؟“

اماں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ڈھے جائیں گی جب وہ جتنی سے بولی۔

”نہیں.....! باپ کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جائیں، اسے اندر بٹھائیں۔ میں آتی ہوں۔“

”ہیں.....؟“

اماں اسے یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ کیا کہہ رہی ہے.....؟

”جائیں اماں.....! کچھ نہیں ہوگا۔ میں منٹ لوں گی اس سے۔“

وہ زبردستی اماں کو بھیج کر کھلنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب اماں واپس آئیں تو وہ ان سے کچھ کہے بغیر تیزی سے

ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

”آداب عرض.....!“

اسد نے اسے دیکھتے ہی فرضی سلام کہا تو وہ بہت ضبط سے بولی۔

”کیوں آئے ہو یہاں.....؟“

”بھینچے کی محبت سمجھ لانی ہے۔“

وہ ڈھٹائی سے سرکار ہاتھا۔

”اچھا.....؟“

اس کے لہجے میں بلا کر طنز تھا۔

”جب تمہیجا تمہارے گھر میں تھا، تب تو کبھی تمہیں اس پر پیار نہیں آیا تھا.....؟ اب کیسے محبت جاگ

گئی.....؟“

”خون کبھی بھی جوش مار سکتا ہے۔ لے کر تو آؤ، کہاں سے میرا بھتیجا.....؟“

پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”دل تڑپ رہا ہے، اسے سینے سے لگاؤں گا تو جین آئے گا۔“

”بند کر دانی یہ بکواس.....!“

اس نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا۔

”میں تمہاری چال بازیاں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ باپ کا دل تو تڑپا نہیں بیٹے کے لئے تمہارا دل

ہاں رہا ہے.....؟ تم باپ سے بڑھ کر ہو کیا.....؟“

”نہیں.....! میں باپ سے بڑھ کر کیسے ہو سکتا ہوں.....؟ بس.....! اپنا اپنا دل ہے، امیر امیر اول تو جب

ہی بھینچے کی محبت میں تڑپے گا، میں اس سے ملے آؤں گا کہ تم مجھے نہیں روک سکتی۔“

”روکوں گی تو جب تمہیں دواہ آئے کے قابل چھوڑ دوں گی۔“

وہ انتہائی غصے میں بلکہ خوشوار ہو کر اس پر بھٹ پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے امی کے گھر آئے ہوئے چوتھا دن تھا، جب اس کا فون آیا اور اس بار تو اس نے حد کر دی تھی، یعنی

مہلی نے فون ریسیور کیا اور اس نے امی سے کہہ دیا کہ جانیہ سے بات کرنی ہے اور جب جگنی نے اسے بتایا کہ تمہارا

فون ہے تو اس نے اٹھتے ہوئے ہی یوں پوچھ لیا۔

”کون ہے.....؟“

”چائیں.....! شاید تمہارا دیوار.....؟“

جگنی لا پرواہی سے کتنی ہوئی جگنی۔

”جہانگیر کا فون ہے.....؟“

اسے الجھ رہا تھا۔ جلدی سے آکر ریسیور کان سے لگاتے ہی بولی۔

”کون.....؟ جہانگیر.....؟“

”نہیں.....! یہ میں ہوں۔“

دوسری طرف وہ اطمینان سے بولا تو اس کی اتنی جرأت پر وہ دنگ رہ گئی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں.....؟“

وہ اسی طرح حیرت میں گھر کر بولی۔

”تمہارے گھر فون کیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا۔“

”کیا.....؟“

وہ بے اختیار دھچکی۔

”کم آن جانیہ.....! اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ بس یوں سمجھو، مجھے خود ہی آگاہی ہو جاتی

ہے۔“

اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔



”کچھ اچھائی نہیں لگتا۔“

”بس! میرے ساتھ اب گھر چلو۔ میں اس حالت میں جہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”خاک ٹھیک ہو۔۔۔؟ آئینہ دیکھو، برسوں کی سریش نظر آ رہی ہو، اور اماں دیکھیں گی تو مجھ پر خفا ہوں

گی۔“

”ایک دو دن بعد چلوں گی۔“

”نہیں! آج ہی۔“

وہ جتنی انداز میں بولے تو وہ خاموش ہو رہی۔

پھر شام تک اس نے کافی حد تک خود کو سنہال لیا، کیونکہ جانتی تھی کہ جہانزیب اسے ساتھ لے کر ہی

جائیں گے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اماں اسے بیمار حالت میں دیکھیں۔ جس وقت وہ اپنا بیک ٹھیک کر رہی تھی، بنگی

چائے لے کر آ گئی۔

”جہانزیب کہاں ہیں؟“

وہ اس سے پوچھنے لگی۔

”وہ برآمدے میں چھوٹے بھیا کے ساتھ بیٹھے ہیں۔“

”چلو! میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔“

اس نے بیک بند کیا اور بنگی کے ساتھ برآمدے میں آ گئی۔ جہانزیب چھوٹے بھیا کو سمجھاتے ہوئے

کہہ رہے تھے۔

”اس طرح کہیں بھی جانے میں صرف غواہی ہے، آپ کچھ نہ کریں، بس سال ڈیڑھ سال کا کپیوٹر کا

کورس کر لیں۔ اس کے بعد سبیں آپ کو بہت اچھی جا بل جائے گی۔“

وہ اور بنگی حیران ہو کر چھوٹے بھیا کو دیکھنے لگیں جو کسی چھوٹے بچے کی طرح بڑی سعادت مندی سے سر

بلارہے تھے۔

”سال دو سال گزرتے چائیں چلتا۔ بجائے اس کے کہ آپ مزید دو سال یہ سوچنے میں گزار دیں کہ

جاپان کیسے جاؤں۔۔۔؟ اتنے عرصے میں آپ یہ کورس مکمل کر لیں گے، پھر آپ کو تو اس گھر سے دور جانے کا سوچنا

بھی نہیں چاہیے، کیونکہ آپ کے بڑے بھائی پیلے ہی الگ ہو چکے ہیں، چاہیے اپنے گھر کی ہے، پھر بنگی کی شادی کے

بعد ای ابو کے ساتھ آپ ہی کورہنا ہے۔ اگر آپ بھی کہیں باہر نکل گئے تو ای ابو۔۔۔“

جہانزیب دانستہ خاموش ہو گئے، تب چھوٹے بھیا کہنے لگے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس بیچ پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

”بس! اب سوچنے کی بجائے کل ہی کسی اچھے اسٹیوٹ میں داخلہ لے لیں، بلکہ آپ ایسا کریں،

کل میرے پاس آ جائیں، میں آپ کو لے چلوں گا۔“

”جی ضرور! میں آ جاؤں گا۔“

چھوٹے بھیا نے ہائی بھری تو اس نے مسکرا کر بنگی کو دیکھا، پھر جہانزیب سے کہنے لگی۔

”چلیں۔۔۔؟“

”ہاں چلو! پہلے ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“

وہ اُٹھتے ہوئے بولے۔

”لیکن اب تو میں ٹھیک ہوں۔“

”بھری چیک آپ کرانے میں کیا حرج ہے۔۔۔؟“

ای نے بھی ان کی تائید کی تو وہ خاموش ہو رہی۔ پھر اندر سے اپنا بیک اٹھا لائی اور سب سے مل کر ان

کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔“

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی جہانزیب سے کہنے لگی۔

”کس بات کا؟“

وہ ہانکل نہیں سمجھتے۔

”یعنی چھوٹے بھیا کو قائل کر لیا، ورنہ ہم سب تو نہیں سمجھا سمجھا کر تھک کر ہار چکے تھے۔“

”اچھا۔۔۔!“

وہ احتیاط سے مونڈ کاٹنے ہوئے بولے۔

”سمجھانے اور الزام دینے میں بہت فرق ہے چانیہ! اور اکثر لوگ اس فرق کو محسوس نہیں کرتے۔

اب جبکہ تم ماں بننے والی ہو تو اس بات کو ابھی طرح سمجھ لو۔ میرا خیال ہے، اب تک تم لوگ چھوٹے بھیا سے یہ کہتے

رہے ہو کہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے اور یہ بات ایک توہنہ کے اندر ضد پیدا کرتی ہے، دوسرے وہ سب کچھ کیا

ساتھ حاصل کر لینا چاہتا ہے، تاکہ لوگوں کو بتا سکے کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔۔۔؟ اور ظاہر ہے، سب کچھ ایک ساتھ تو

حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر چھوٹے بھیا کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ بھیا کے زیادہ پڑھ نہیں سکے۔ اگر اسی وقت جب

انہوں نے تعلیم چھوڑی تھی، انہیں کسی ٹیکنیکل لائن میں ڈال دیا جاتا تو وہ اب تک یوں بیکار نہ پھر رہے ہوتے۔

بہر حال، اب انشاء اللہ وہ جلد ہی کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“

انہوں نے ٹیکنیک کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔ پھر انہوں

نے خود ڈاکٹر کو اس کی تمام کیفیات کے بارے میں بتایا اور خاص طور سے پوچھا کہ وہ اتنی کمزور کیوں ہوئی جارہی

ہے۔۔۔۔۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ابتدائی دنوں میں ایسا ہو جاتا ہے۔“  
ڈاکٹر نے انہیں مطمئن دلا، پھر کہنے لگیں۔

”میں ٹانگہ وغیرہ لکھ کر دے رہی ہوں۔ یہ باقاعدگی سے استعمال کروائیں اور فی الحال ان کے لئے ریست بہت ضروری ہے۔“  
”جی۔۔۔۔۔“

انہوں نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور شکر ہے کہہ کر اسے ساتھ لے کر باہر نکلے تو کہنے لگے۔

”اب تم اپنی طرف سے لا پرواہی نہیں کرو گی۔“

”میں لا پرواہ نہیں ہوں۔“

”کچھ کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔؟“

اسی وقت کسی نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو جہاں وہ پلٹے وہاں اس نے بھی دیکھا تو جیسے روح فنا ہو گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر جہانزیب کے بازو پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ اتنی جلدی وہ اپنی بات کو جگ ثابت کرنے چلا آیا تھا۔

”کیا ہوا جانیہ۔۔۔۔۔؟“

اپنے بازو میں جھپٹن محسوس کر کے جہانزیب نے اسے دیکھا۔ پل میں وہ زرد پڑ گئی تھی۔ جیسی تشریش سے پوچھنے لگے۔

”تم ٹھیک تو ہو۔۔۔۔۔؟“

اس نے کچھ کہنے کے لئے ابھی صرف ہونٹ کھولے تھے کہ وہ کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے، یہ کچھ دیکھ کر ڈر گئی ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

جہانزیب نے اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”میری شکل ہی اتنی خوفناک ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! میں نے بھی غور نہیں کیا۔“

جہانزیب نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا، پھر اس سے کہنے لگے۔

”جانیہ۔۔۔۔۔! یہ زوہیب ہے، جس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔“

”زوہیب۔۔۔۔۔؟“

اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنش کی اور وہ بے حد تاہف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اور یہ غالباً تمہاری سسر ہیں۔۔۔۔۔! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

وہ اس کی بڑے سٹ نظروں کے باوجود دھٹائی سے ہنس کر بولا تو اس کے اندر کالا ڈوبنے لگا۔ دل چاہا ابھی بڑھ کر اس کا منہ توج لے۔ بمشکل تمام خود پر قابو پا کر جہانزیب سے کہنے لگی۔

”چلیں جہانزیب۔۔۔۔۔؟“

اور جہانزیب سے پہلے وہ بول پڑا۔

”میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔! میں تم دونوں کو کسی اچھی جگہ ڈنر کراؤں گا۔“

”نہیں جہانزیب۔۔۔۔۔! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ گھر چلیں۔“

وہ سرکشی میں بولی تو جہانزیب اس کا خیال کر کے زوہیب سے کہنے لگے۔

”ابھی نہیں زوہیب۔۔۔۔۔! ہم پھر کسی دن تمہارے گھر آ جائیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔۔۔!“

پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”بھولے گا نہیں۔۔۔۔۔!“

”فکرت کرو۔ یہ بھول بھی گئیں تو مجھے یاد رہے گا۔“

جہانزیب نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

”تم میرے ساتھ ساتھ اپنے دوست کو بھی دھوکہ دیتے رہے ہو۔ نف ہے تم پر۔۔۔۔۔!“

وہ زبردستی سے کہہ کر جہانزیب کے پیچھے چلی گئی۔

اس رات وہ ایک بل کے لئے نہیں سو سکی تھی۔ زوہیب جس طرح بے نقاب ہوا تھا، اس سے اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر انجانے میں وہ اس کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہا ہوتا، جب تو جہانزیب کا سامنا ہونے پر اسے شرمندہ ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ انجان نہیں تھا، بلکہ شروع دن سے جانتا تھا کہ وہ جہانزیب کی گھٹیرے پر اور جب اس نے اپنے دوست کا خیال نہیں کیا تو اس کا کیا خیال کرے گا۔۔۔۔۔؟

اور وہ دوست نہیں تھا، اسے دوست کہنا دوستی کی تو جین تھی۔ ایسے شخص کے سامنے مت ساجت کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، نہ ہی اس سے کوئی اچھی توقع رکھی جاسکتی تھی۔

”چنانچہ اس کا مقصد کیا تھا۔۔۔۔۔؟“

بہت سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، وہ بری طرح پھنس چکی تھی۔

ہاں کہ اب اپنے دفاع کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“

اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں چمک پڑیں۔ کتنی دیر تک وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہی۔ قریب

ہی جہانزیب بے خبر سو رہے تھے اور کسی قسم ظریعی بھی کہ وہ جو زندگی کا سچی تھا، وہ اس سے اپنا احوال نہیں کہہ سکتی تھی، بلکہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ اگر انہیں خبر ہوگئی تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ صبح اس کی آنکھیں رت جگے اور شدت گریہ کے باعث سرخ اور سوسنی ہوئی تھیں، جنہیں دیکھ کر جہانزیب تشویش سے کہنے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تمہاری آنکھیں بھی اتنی لال ہو رہی ہیں۔“

”رات میں ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی۔“

وہ یہی کہہ سکی۔

”تو مجھے اٹھا دیا ہوتا۔“

”آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔“

”اب تو جیسے میں پریشان نہیں ہو رہا۔؟“

وہ جگڑنے لگے۔

”آخر تم کیوں مجھے پریشان کرتی ہو۔؟“

”میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔“

وہ رونے لگی تو وہ نرم پڑتے ہوئے بولے۔

”عجب بے وقوف لڑکی ہو تم! مجھے بتاؤ، تم کیا محسوس کرتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”چاہئیں۔۔۔۔۔؟“

وہ جھٹکیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”چلو اٹھو۔۔۔۔۔! ناشتہ کرو، پھر سو جانا۔“

وہ اسے اٹھا کر ڈانٹنگ روم میں لے آئے۔ وہ بہت خاموشی سے سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگی۔

”مجھے جانے ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

اماں اسے بغور دیکھ کر بولیں تو جہانزیب کہنے لگے۔

”ہاں۔۔۔۔۔! طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ کل ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا، اس نے دوا دی ہے اور آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔“

”میں خود اسے آرام کرنے کا کہتی ہوں۔“

”بس۔۔۔۔۔! اب آپ ہی اس کا خیال رکھیں، یہ خود تو۔۔۔۔۔؟“

وہ یوں ہی بات اور دوسری چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بھی جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے ان کے پیچھے

چلی آئی۔

”میں آفس جا رہا ہوں۔ اگر کوئی پرالیم ہو تو مجھے فون کر لیتا۔“

”جی۔۔۔۔۔!“

”چلو۔۔۔۔۔! اب آرام سے سو جاؤ۔“

”جی۔۔۔۔۔!“

”کیا میا؟ چلو فوراً لیٹو۔۔۔۔۔!“

انہوں نے رعب سے کہا تو وہ جلدی سے بیڈ پر آگئی اور کچھ بھی کبھی نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ بے

سادہ نس پڑے۔

”اگر ایسی نظروں سے دیکھو گی تو میں آفس نہیں جاؤں گا۔“

اس نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

”اوکے۔۔۔۔۔! میں چلوں۔“

انہوں نے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”اللہ حافظ۔۔۔۔۔!“

پھر انہیں جاتے ہوئے محسوس کیا، اس کے بعد پکلیں موند لیں۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، اس لئے پلے

میں بے خبر ہو گئی۔

اماں کو غالباً جہانزیب منع کر گئے تھے، اس لئے انہوں نے اسے اٹھایا نہیں۔ البتہ وہ پہرے کھانے کے

لئے اٹھانے کے لئے آئیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسے زیادہ دیر تک بھوکا نہیں رہنا چاہئے تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو

کر کمرے سے نکلی تو فون کی بیل سن کر لابی کی طرف آگئی۔ دوسری طرف زہیب تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ کہنے

لگا۔

”سنو۔۔۔۔۔! اپنی امانت لینے کب آ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

اس کا اشارہ غالباً تصویر کی طرف تھا اور وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔!“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔! تو میں جہانزیب کو بے دجا جاتا۔“

وہ اطمینان سے بولا۔

”نہیں۔۔۔۔۔! اتم ایسا نہیں کرو گے۔“

”کون روک سکتا ہے مجھے۔۔۔۔۔؟“

”میں جانتی ہوں، جنہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن۔۔۔۔۔“

وہ قصداً خاموش ہو گئی، پھر اماں کے پکارنے پر جلدی سے ریسورر کھر کر آمدے میں آگئی جہاں تخت

پر دست خوان بچھا کر انہوں نے کھانا رکھ دیا تھا۔

”جہانگیر کہاں ہے.....؟“

وہ بیٹھے ہوئے پوچھ گئی۔

”جہانگیر کو خیر سے نوکری مل گئی ہے۔“

”اچھا!“

اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

”جہانزیب نے مجھے نہیں بتایا۔“

”بھول گیا ہوگا۔“

”ہاں!“

اس کے سینے سے یوں ہی گہری سانس خارج ہوئی۔ پھر وہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

”یہ چٹنی لو..... تمہارے لئے بنائی ہے۔“

اماں نے پلٹ اس کے آگے رکھی تو وہ تادم ہی ہو کر بولی۔

”اماں! آپ مجھے اُٹھا دیتیں، اکیلے ہی سب کام کرتی رہیں۔“

”تمہارے آنے سے پہلے بھی تو کیا کرتی تھی اور میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو بہوؤں کے

آتے ہی چنگ سنبھال لیتی ہیں۔ مجھ سے تو فارغ بیٹھائی نہیں جاتا اور پھر گھر کا کام ہی کتنا ہوتا ہے.....؟“

”پھر بھی۔“

”بس! تمہیں ابھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر سے فارغ ہو جاؤ، پھر سب تمہیں ہی کرنا

ہے۔“

پھر گئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بولیں۔

”اللہ بخشے میری ساس کو، بہت نیک خاتون تھیں۔ جہاں بہوئیں اُمید سے ہوئیں، وہ ناز و خیرے اُٹھاتیں

کہ کیا بتاؤں.....؟“

”اماں! آپ بھی تو میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔“

وہ غلصہ سے بولی۔

”میری ساس کے زمان میں مرنے کی تھی، غصہ تو انہیں آتا ہی نہیں تھا۔“

”اماں! آپ بھی تو.....“

”نہیں دلہن! مجھے غصہ بہت آتا ہے۔“

اماں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑیں۔

”دستی بار تم پر بگڑ چکی ہوں۔ یوں کہو کہ تم ابھی جو میرے بگڑنے کا برا نہیں مانتیں۔“

اگر کوئی اس وقت ساس، بہو کی باتیں سن لیتا تو اپنی بے ساختہ ہنسی کو کبھی نہیں روک سکتا تھا۔ دونوں بڑی

ایمانداری اور صاف گوئی سے اپنی غلطیوں اور دوسرے کی اچھائیوں کا اعتراف کرتی تھیں۔

ویسے بھی ساس بہو کے درمیان رنجش کا باعث کوئی تیرا فرد ہوتا ہے اور خوش قسمتی سے یہاں ایسا کوئی

تیرا اقوامی نہیں۔ کھانے کے بعد اماں اسے پھر آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے خود فرائض کی تیاری کرنے لگیں اور وہ

ان کے کہنے پر اپنے کمرے میں آ تو گئی، لیکن سوئے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ویسے بھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔

کچھ دیر تک یوں ہی کمرے میں ادھر سے ادھر بٹھتی رہی، پھر ٹیبل سے میگزین اُٹھا کر بیڈ پر آ بیٹھی۔

اصل میں تنہا ہوتے ہی ذہن اُٹھنے لگتا تھا۔ زوہیب کی باتوں کو وہ محض ذہنی پر محمول نہیں کر سکتی تھی۔ جس طرح وہ کینکٹی

پرائز آیا تھا، اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ تصویر جہانزیب کو دکھا کر کوئی ایسی داستان سنائے جس سے جہانزیب اس

سے متاثر ہو جائیں۔

”میں کیا کروں.....؟“

وہ اس وقت بچیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا چاہتی تھی کہ جہانزیب آگئے۔ یہ ان کے آنے کا وقت

نہیں تھا، اس لئے وہ کچھ چونک کر ٹیبل پر ہونٹوں کی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ قدرے مطمئن ہو کر بولی۔

”خفیک ہوں۔“

”میرے جاتے ہی کام سے تو نہیں لگ گئی تھیں.....؟“

”نہیں بھئی! اس وقت کی سوئی، ابھی اٹھی ہوں۔ آپ کھانا کھائیں گے.....؟“

”نہیں.....!“

وہ کپڑے لے کر ہاتھ روم میں چلے گئے۔ اور جب کپڑے تبدیل کر کے واپس آئے تو اس کے برابر

لیٹتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کیا پڑھ رہی تھیں.....؟“

”ابھی تو لے کر بیٹھی ہوں۔“

وہ گھٹنوں پر سر رکھے میگزین کے صفحات اُلٹتے ہوئے بولی۔

”اب تم تو سو گئی نہیں.....؟“

”نہیں.....!“

”اچھا! تو میں سو رہا ہوں۔ مجھے پانچ بجے اُٹھانا۔“

”کہیں جاتا ہے کیا...؟“

وہ یوں ہی پوچھ گئی۔

”ہاں..... از وہیب نے بلایا ہے۔ اسی کی طرف جاؤں گا، بلکہ تم بھی چلنا۔“

زوہیب کی طرف جانے کا سن کر ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دے کر اور وہ اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ کر کڑوٹ بدل گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی، پھر پہلے کن اکیوں سے انہیں دیکھا، اس کے بعد بظاہر کھلے میزین پر نظریں دوڑانے لگی گوکہ ذہن کہیں اور بٹک رہا تھا پھر بھی نظریں ”آپ کے مسائل“ پر بٹھ گئیں۔ کبھی وہ یہ کام بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتی تھی۔ خاص کر ایسے خطوط جن میں لڑکیاں ایسی ہیصو مسائل سے جا دوڑا ہوتی تھیں۔

اسے یاد آیا، وہ ایسے خطوط پڑھ کر لڑکیوں کو بہت برا بھلا کہا کرتی تھی کہ وہ کیوں لڑکوں کو خط لکھنے اور تصویریں دینے کی غلطیاں کرتی ہیں اور اب انجانے میں ہی سہی، وہ خود یہ غلطی کر گئی تھی تو اسے اپنی طرح وہ ساری لڑکیاں بے قصور نظر آئے لگیں۔

”چنانچہ کس کے ساتھ کیا حالات رہے...؟“

وہ سوچتی ہوئی اس کا کم کو سرسری انداز میں پڑھنے لگی، لیکن تیسرے خط نے اس کی پوری توجہ سیٹ لی۔ پہلے گزشتہ محبت یا غلطی کا اعتراف تھا، پھر لکھا تھا۔

”اب میری شادی ہو چکی ہے، لیکن وہ اب میرا جیچا نہیں چھوڑتا۔ مجھے دھمکیاں دیتا ہے۔ اگر میں نے قطع تعلیق کر لیا تو وہ میرے خطوط اور تصویریں میرے شوہر کو دکھا دے گا۔ مجھے بتائیے باہی..... میں کیا کروں...؟ کیا ایک بار اس سے مل لوں...؟“

جواب میں لکھا تھا۔

”اس سے ملنے کی غلطی مت کیجئے، بلکہ اپنے شوہر کو اعتماد میں لے کر انہیں تمام حالات بتا دیجئے۔“

اس جواب پر وہ خاموشی مایوس ہو کر جہانزیب کی طرف دیکھنے لگی۔ گوکہ اس نے انہیں ہر لحاظ سے بہت اچھا پایا تھا، لیکن اب تو اس خیال سے ہی اس کی جان جاتی تھی کہ

”اگر کبھی انہیں خبر ہو گئی تو...؟“

اور اس ”تو...؟“ کے آگے تو وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

”آخر خاتون نے اتنا احتیاط مشورہ کیوں دیا...؟“

وہ مایوس ہوئی تو جل کر سوچنے لگی۔

”مرد میں اتنا ظرف اور حوصلہ کہاں ہوتا ہے بھلا.....؟ اپنی شخصیت کو کتنا ہی نکھار کر پیش کریں، اندر سے ایسے ہی کھوٹے ہوتے ہیں۔“

”سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

اس کے اندر سے آواز آتی تھی۔

”لیکن میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔“

وہ عاجزی سے بڑبڑاتی۔

”یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ زوہیب اپنی طرف سے کوئی داستان کھڑا کرنا ہے، تم سب کچھ سچ بتا دو۔ اس طرح معافی کا کچھ امکان ہے، ورنہ اگر بھول کر زوہیب کی طرف سے ہو گئی تو پھر جہانزیب تمہاری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔“

”ہوں.....! یقیناً۔“

اس نے پڑ سوچ انداز میں سر ہلایا پھر وہیں سے میزین ٹیبل پر پھینک کر لیٹ گئی۔ سامنے وال کھاک پر نظر پڑی۔ ابھی صرف تین بجے تھے اور جہانزیب نے پانچ بجے اٹھانے کے لئے کہا تھا۔ اس دوران اس نے ایک تو خود کو جہانزیب سے بات کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار کیا، دوسرے آریا پار سوچتے ہوئے ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے اپنے اندر حوصلہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ پھر شام میں جب جہانزیب تیار ہونے لگے تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”کہاں جا رہے ہیں...؟“

”بتایا تو تھا کہ زوہیب کے پاس جاتا ہے۔ تم بھی مجھے ساتھ چلو.....! تھوڑی آنکھ ہو جائے گی۔“

انہوں نے کہا تو وہ سوچ کر بولی۔

”آؤ آنکھ کے لئے میں ضرور جانا چاہتی ہوں، لیکن زوہیب کے گھر نہیں۔“

”کیوں...؟“

”بس...!“

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر ہلکے سے کندھے جھٹک کر بولے۔

”تو اسیا کرتے ہیں، آؤ آنکھ کے لئے کلک ملیں گے۔ آج کیونکہ اس نے بلایا ہے تو۔“

”نہیں...!“

وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“

”کم آن جانو! امیر ایک ہی تو دوست ہے۔“

ہیں۔

”ہی لئے تو آپ کو دوستوں کی پہچان نہیں۔“

”کیا مطلب؟ یعنی اب تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ۔۔۔“

”زویب دوست نہیں، آستین کا سانپ ہے۔“

اس نے فوراً ان کی بات مکمل کی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، اپنے کپڑے لے کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہاں آئی تو وہ جیسے انتظار میں بیٹھے تھے، اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے تم رواجی بیوی بن رہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں اگر میرا زویب سے میل جول پسند نہیں ہے تو صاف کہو، لیکن اس کے بارے میں ایسی باتیں

مت کرو۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

”چلیں؟“

وہ ان کی بات نظر انداز کر کے اپنے سر اپنے پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”کہاں چلیں؟“

وہ یوں بولے جیسے جبراً اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے ہوں۔

”کہیں بھی کسی ایسی جگہ جہاں زیادہ شور ہوگا نہ ہو۔“

وہ ظاہر خوش گوار لہجے میں بولی اور ان سے پہلے ہی کرے سے نکل آئی۔ وہ اس کی خواہش پر اسے ساحل پر لے آئے۔ کچھ دیر تک وہ ان کا سوزیوں ہی گڑا بگڑا سا رہا، لیکن پھر آپ ہی آپ ٹھیک ہو گئے۔ شاید اس لئے کہ وہ اچانک بھی سمجھی نظر آنے لگی تھی اور وہ بھی سمجھے کہ ان کے رویے کو محسوس کر رہی ہے۔

”تھک گئی ہو؟“

وہ اسے رُکنے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ہاں! آئیے، وہاں بیٹھتے ہیں۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے، کیفے چلتے ہیں، وہاں چائے بھی پی لیں گے۔“

”چلیں!۔۔۔“

وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ پھر چائے آنے تک وہ یوں ہی میز کی شفاف سطح پر انگلی سے آؤڑی زچھی کٹیریں کھینچتی رہی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور کچھ اضطرابی کیفیت میں ہونٹ بھی نیم وا ہوتے اور کبھی وہ جتنی سے بچھتی لیتی، اور اس وقت پہلی بار انہوں نے سرسری انداز کی بجائے نیتین سے سوچا کہ وہ اول روز سے ان کے لئے محمد بنی ہوئی ہے اور وہ اب تک اسے سمجھنے سے قاصر رہے

”چائے لوٹاں!۔۔۔“

انہوں نے متوجہ کیا تو وہ زرا سی چونک کر سیدھی، بوٹیچی، بھر جائے کاپ اپنی طرف کھینچے ہوئے بولی۔

”آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں نے زویب کو آستین کا سانپ کیوں کہا۔۔۔؟“

”کیا واقعی تم اسے ایسا سمجھتی ہو۔۔۔؟“

انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”صرف سمجھتی نہیں ہوں، بلکہ۔۔۔“

”دیکھو جانا۔۔۔!“

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”زویب جیسا بھی ہے، میرا دوست ہے۔ اس کی تمام خامیاں میری نظر میں ہیں اور میں نے تمہیں بھی بہت پہلے بتا دیا تھا کہ میرے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ اپنی رنگین مزاحمتی کے باعث کچھ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ لیکن اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تمہیں یہ غم نہ ہے کہ اس کی صحبت میں کہیں میں نہ گڑ جاؤ تو میری جان۔۔۔! جب میں بگڑنے والی عمر میں نہیں گڑا تو اب۔۔۔“

وہ قصداً بات اُدھوری چھوڑ کر مسکراتے ہوئے اُلجھ کر بولی۔

”آپ پہلے میری بات تو سنیں!۔۔۔“

”زویب کے متعلق کچھ نہیں سنوں گا۔“

وہ جتنی انداز میں بولے اور اس کے خاموشی اختیار کر لینے پر قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”تمہاری زویب سے بس سرسری ملاقات ہی تو ہوئی ہے، کبھی آرام سے اس سے بات کر کے دیکھنا۔

میں محسوس کرتا ہوں، اس کے اندر ایک اچھا انسان موجود ہے۔“

”ہوگا۔“

وہ آستین کر بولی اور غصہ نہی چائے ایک ہی سانس میں پی کر اپنے اطراف یوں دیکھنے لگی جیسے اچانک دل

اُچاٹ ہو گیا ہو۔

”چلیں؟“

انہوں نے اس کی بے زاری کو فوراً محسوس کر لیا۔

”ہاں!۔۔۔“

اس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی۔

واپسی کا تمام راستہ خاموشی سے نکلا۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ وہ تو اندر ہی اندر جڑ بڑھوتی رہی

کتاب جبکہ اس نے اپنے آپ کو سب کچھ جاننے پر تیار کر لیا تھا تو وہ سننے پر آمادہ کیوں نہیں ہو رہے؟ اور ان کی خاموشی جتانے والی تھی تاکہ آئندہ وہ زوہیب کے خلاف کوئی بات نہ کرے، اور اس روز کے بعد سے وہ خاصی محتاط ہو گئی۔ وہ خود سے زوہیب کا ذکر کرتے تو بس سن لیتی، جبکہ زوہیب کا وہی معمول تھا۔ ہر دوسرے دن فون کرتا نہ بھولتا۔ یوں جیسے یہ بھی اس کے معمولات میں شامل ہو۔ وہی پرانی باتیں دہراتا، پھر ملنے پر اصرار اور اس کے انکار پر دمکی۔ ابھی تک اس نے اپنی دمکی پر عمل نہیں کیا تھا۔ جس سے اب وہ کچھنے لگی تھی کہ وہ محض اسے دھمکا تا ہے، ورنہ اس میں اتنی جرأت نہیں ہے۔

اور اب ایک طرح سے وہ مطمئن سی ہو گئی تھی کہ اسی روز وہ جہانزیب کے ساتھ گھر تک آ گیا۔ خاصے بے تکلف انداز تھے اس کے، جس سے وہ کچھ لگی کہ وہ پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔ وہ کھانے میں سب کے ساتھ شریک ہوا۔ اس کے بعد جہانزیب اسے چائے کا کپڑا کر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ اس نے انتہائی بے دلی سے چائے بنائی اور جب لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو ناکواری کا اظہار اس کے ہر انداز سے ہو رہا تھا۔

”چینی؟“

اس نے پیشانی پر مزید ٹکٹوں کا اضافہ کر کے زوہیب سے پوچھا تو وہ جہانزیب کا خیال کے بغیر بولا۔

”نہ بھی ڈالیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”اس کی باتوں کا برا مت ماننا جائیے۔ ایسا ایسا ہے۔“

جہانزیب فوراً اس کی طرف داری میں بول پڑے۔

”ایسا ہی سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

وہ چائے بنانے میں مصروف رہ کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”شوخی اور بدلتی رہتی ہے؟“

”اچھا؟“

وہ استہزاء پھنی۔ پھر ذرا سی گردن موڑ کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”اور کیا کیا خوبیاں ہیں تم۔ میرا مطلب ہے آپ میں؟“

”اب میں خود اپنی کیا تعریف کروں خاتون محترمہ؟“

وہ انکساری کی ایک ٹینک کرتے ہوئے بولا تو جہانزیب ہنس پڑے۔

”وہیے میں تمہاری کافی تعریف کر چکا ہوں۔“

”جی ہاں۔! جہانزیب نے مجھے آپ کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔“

وہ چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”بس!.....! وہ دیکھنا ہے جو میری تعریف کرتا ہے، ورنہ تو لوگ مجھے ڈور سے دیکھ کر ہی راستہ بدل جاتے ہیں۔“

گوکہ اس نے اپنے بارے میں کچھ بولا تھا، لیکن انداز جہانزیب کی ہمدردی سمیٹنے والا تھا، جس میں وہ کامیاب رہا۔ جہانزیب اس کی پیشہ پڑہا تھا مارتے ہوئے بولے۔

”چھوڑو ویا!.....! کتنی بار کہا ہے، لوگوں کی پرواہ مت کیا کرو۔“

”مکس قدر مرکا رہے۔“

اس نے جل کر سوچا اور اٹھ کر جانے لگی تو جہانزیب نے پکار لیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

وہ کچھ نہیں بولی، بس سالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ!.....! زوہیب خاص طور سے تم سے ملنے آیا ہے۔“

”مجھے؟“

اس نے بے تحاشہ دھڑکتے دل پر بے اختیار ہاتھ رکھا۔

”جی!.....! اس روز تو آپ سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔“

وہ اس کی بدلتی رنگت دیکھ کر محظوظ ہو کر بولا، تو وہ محض خود کو سہارا دینے کی خاطر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

تب وہ کہنے لگا۔

”میں نہ صرف آپ سے ملے، بلکہ آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔ کل رات آپ کا کھانا آپ دونوں.....“

”نہیں!.....!“

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بے اختیار بول پڑی تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر جہانزیب کو

دیکھنے لگا۔

”اصل میں جانی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

جہانزیب کا معذرتی لہجہ اسے قطعی پسند نہیں آیا، پھر یہاں سے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ جہانزیب اٹھتے ہوئے بولے۔

”بہر حال، مجھے تمہاری دعوت جی جان سے قبول ہے۔ البتہ تم جانیہ کو آمادہ کرلو۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”سگر ریٹ.....! غالباً کمرے میں رکھ دیا ہوں۔“

وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے تو وہ اسے دیکھ کر خاصی بے تکلفی سے مسکرایا۔

”مکس قدر ذلیل انسان ہو تم؟“

وہ تلخ ہو کر تاسف سے بولی۔

”اس شخص کو جو کہ دے رہے ہو، جو تمہارے بارے میں کوئی غلط بات سننا ہی نہیں چاہتا۔“

”گویا تم اسے میرے خلاف بہانے کی کوشش کر چکی ہو۔؟“

وہ اتنی ڈھٹائی سے ہنس کر بولا کہ اس کا دل چاہا کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

”میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گی، البتہ کسی دن انہیں تمہارا اصلی روپ ضرور دکھاؤں گی۔“

”کسی دن کیوں؟ آج ہی، بلکہ ابھی۔“

”شٹ آپ۔!“

وہ دلی آواز میں چیختی۔

”اٹنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔“

اس پر زنی برابر اس کی باتوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ جیسے اس کی حالت زار کا لطف لے

رہا تھا۔

”اور اس وقت تو میں تمہارا مہمان ہوں۔ کم از کم مہمان کے ساتھ تو ایسا سلوک نہ کرو، اور کچھ نہیں تو سکرا

کر دکھائی لو۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر۔!“

اس وقت جہانزیب آگے اور کیونکہ وہ دروازے ہی سے کچھ کہتے ہوئے آئے تھے، اس لئے اس کی

بات سن نہیں سکے، مرنہ ضرور پوچھتے کہ کس پر لعنت بھیج رہی ہو۔؟“

”تمہاری بیوی مجھ سے نا صبی متفر ہے جہانزیب! لگتا ہے تم نے انہیں میرے بارے میں کچھ زیادہ

ہی بتا دیا ہے۔“

اس کی بات سن کر جہانزیب تنہی نظروں سے اسے دیکھنے لگے وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر بولی۔

”میں کیوں متفر ہونے لگی؟“

”اگر تنفر نہیں ہیں تو میری دعوت قبول کر لیجئے۔“

جہانزیب نے اسے اشارہ بھی کیا کہ مرو تا ”ہاں“ کہہ دے، لیکن وہ نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے

اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی، اور وہ اٹھ کر آ تو کئی تھی، لیکن اب اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ کیونکہ زوہیب سے کچھ

بہید نہیں تھا کہ وہ بدلے میں اسی وقت اپنی دھکیوں پر عمل کر ڈالت۔

کچھ دیر تک وہ اضطراری کیفیت میں کمرے میں بیٹھ رہی، پھر ایک میزین اٹھا کر بیڈ پر آ بیٹھی اور

بظاہر اس کی درق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ لیکن اس کا سارا دھیان جہانزیب کی طرف تھا کہ وہ کب آتے

ہیں۔؟

اور جہانزیب کا فی دیر بعد اٹھا زوہیب کو زخمت کر کے آئے تو کن اکیوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”مجھے تم سے ایسی امید ہو رہی نہیں تھی۔“

انہوں نے فحشی بھرے لہجے میں کہا تو اسے اپنا دل ڈوتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر بھی ہمت کر کے ان کی طرف

دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

”آخرا خلاق بھی کوئی چیز ہے۔ تم بے شک اس کے گھر نہ جاتیں، میں کل اس سے کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔

لیکن اس وقت اگر تم ہاں ہی بیٹھیں تو تمہارا کیا جاتا۔؟ پتیارہ اتنا خام اس اور آ زردہ ہو کر گیا ہے۔“

”ہونہ۔! پتیارہ۔؟“

اس نے سوچا اور دو بارہ میزین دیکھنے لگی۔

”بہر حال، میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ کل ہم ضرور آئیں گے۔“

وہ اپنی جگہ پر لیٹے تو حسی انداز میں کہہ کر اس کی طرف سے منہ موڑ کر لیٹے۔

☆☆☆☆

دانیال کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ زونی اور رداس کے پاس آ بیٹھے۔ دونوں

پس اس کے کافی ناموس ہو گئے تھے۔ وہ بھی ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی۔ پھر دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی

اہکی پوچھنے لگی۔

”یہ بتاؤ۔! اپنی کلاس میں فرسٹ کون آتا ہے۔؟“

”میں۔!“

ردانے فوراً ہاتھ اٹھایا۔

”جا چلی۔! میں فرسٹ آتی ہوں۔“

”اچھا۔! اور تم۔؟“

وہ زونی کو دیکھنے لگی۔

”یہ تو حیرت انگیز نہیں آتا چاچی۔! 6th اور 7th۔“

ابھی بھی ردانے جواب دیا۔

”کیوں زونی؟ تم بڑے جتن نہیں ہو کیا۔؟“

اس نے زونی سے پوچھا تو وہ متناہر ہو کر بولا۔

”پڑھتا ہوں چاچی۔! ارداسے زیادہ پڑھتا ہوں۔“

”پھر فرسٹ کیوں نہیں آتے۔؟“



”کیونکہ میں اسکول ناظم کے بعد ٹیچر سے ٹیوشن نہیں پڑھتا۔ اس لئے ٹیچر مجھے کم نمبر دیتی ہیں۔“  
نوی کی بات سن کر وہ جہان رہ گئی کہ اتنا سا بچہ بھی یہ باتیں سمجھتا ہے۔  
”یہ تو یاد دہانی ہے۔“

اس نے کہا تب ہی دانیال آگیا۔

”السلام علیکم۔“

دانیال کی نظریں اس پر جمیں۔

”چاچو آگئے۔! چاچو آگئے۔!“

نوی اور روراہیل پڑا چھلنے لگے۔

”ہاں۔! چاچو آگئے۔ بہت تھکے ہوئے آئے ہیں، ابھی آرام کریں گے۔ چلو جاؤ۔!“

دانیال نے دونوں بچوں کو اٹھا کر بیڈ سے اُتارا اور ان کے احتجاج کرنے کے باوجود انہیں کمرے سے

بہج کر دروازہ بند کر کے پلٹ کر شرارت سے ٹائیڈ کو دیکھا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”یہ کیا حرکت ہے۔؟“

”ارے بیوی۔!“

وہ آکر اس کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”ہاہ۔۔۔۔۔! سچ بچ آرام لیٹ گیا۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر سارے دن کی تھکن اتر گئی۔“

”اچھا۔!“

وہ ذرا سانس کر بولی۔

”پھر تو میں سیدھی جنت میں جاؤں گی۔“

”وہ کیسے۔؟“

دانیال نے قصداً انجمن بن کر پوچھا۔

”وہ ایسے کہ جس عورت کا شوہرا سے دیکھ کر خوش ہو جائے، تو وہ عورت جنت میں جائے گی۔“

اس نے کہا تو وہ مظلوظ ہو کر پوچھنے لگا۔

”اور جس مرد کو دیکھ کر اس کی بیوی خوش ہو جائے۔۔۔۔۔؟“

”تو بھی بیوی جنت میں جائے گی۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”اور مرد۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

”جناب۔۔۔۔۔! جنت میں مردوں کا کیا کام۔؟“

اس کی برکتی پروہ بے ساختہ ہنستے ہوئے اس پر چھٹنا چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

فون کی چھٹی مسلسل بج رہی تھی۔ عبادا سی وقت آفس سے آیا تھا، جو تے اتار رہا تھا اور پتا نہیں بتول بیگم

اور اسد کہاں تھے جو کوئی فون نہیں اٹھا رہے تھے۔؟ آخر کسی کو آ پڑا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔!“

”راہبہ بات کر رہی ہوں۔“

ادھر سے راہبہ کی آواز سن کر عبادا دیک دم ڈھبلا پڑ گیا۔

”ہاں راہبہ۔! کیا بات ہے۔؟“ ٹھیک تو ہے ناں۔؟ میرا مطلب ہے، شوبی۔؟“

”شوبی بالکل ٹھیک ہے۔“

وہ بے حد سہاٹی تھی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“

”پھر یہ کہ آپ اپنے بھائی کو لگام ڈال کر رکھیں۔ جب سارے رشتے ختم ہو گئے تو پھر وہ کس تعلق سے

میرے گھر آتا چاہتا ہے۔؟“

راہبہ نے کہا تو وہ بلا ارادہ پوچھ گیا۔

”کون۔؟ اسد۔؟“

”اسد کے علاوہ بھی آپ کا کوئی بھائی ہے۔؟“

وہ اچانک بیچ بیچ گئی تھی۔

”میں اسد ہی کی بات کر رہی ہوں۔ پہلے میرا راستہ روکا اور آج گھر چلا آیا۔۔۔۔۔؟ آخر کیوں۔؟“

”سوری راہبہ۔! مجھے نہیں معلوم کہ وہ گھر سے باہر کیا کرتا پھرتا ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ واقعی چکر گیا تھا۔

”اب تو معلوم ہو گیا ناں۔۔۔۔۔؟“

وہ ہنسنے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں۔! میں کوشش کروں گا اسے سمجھانے کی۔ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اس نے تمہارے

ساتھ۔۔۔۔۔؟“

”وہ اور کبھی کیا سکتا ہے۔؟ نہ صرف میرے ساتھ، بلکہ راستے میں ابا کو بھی نہیں چھوڑا اس نے، اور

یہ آخری بار ہے عباد.....! اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“  
راجہ نے اپنی بات کہہ کر فون بچ دیا تھا۔ وہ کتنی دیر وہیں کھڑا کھولتا رہا۔ خود پر قابو پانا چاہا لیکن یہ ممکن نہیں ہوا تو بٹول بیگم کو پکارا۔ بٹول نے ان کے کمرے میں آیا اور اسد کو ان کے ساتھ بیٹھ دیکھ کر غصے سے کہنے لگا۔

”امی.....! پوچھیں اس سے، یہ راجہ کے گھر کیوں اور کیا کرنے گیا تھا۔؟“

”ہائیں.....؟“

بٹول بیگم اُچھل پڑیں۔ اسد کو دیکھا تو وہ شہنا کر بولا۔

”مم..... میں کیا کرنے جاؤں گا.....؟ ہاں.....! شولی کی یاد آ رہی تھی، اس سے ملنے گیا تھا۔“

”شولی کا باپ میں ہوں، میں.....! تم کو ہوتے ہو.....؟“

عباد دھاڑا تھا۔

”چاچا ہوں میں.....!“

”کوئی چاچا اور چاچا نہیں ہے اس کا۔“

عباد بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

”امی.....! آپ سمجھائیں اسے۔ میں نے صرف اس کی وجہ سے اپنے بچے کو خود سے ڈور کیا ہے۔ میں

نہیں چاہتا اس کا سایہ بھی اس پر پڑے۔“

”سن رہی ہیں اماں.....! اب میں اتنا گیا گزرا ہوں.....؟“

اسد نے ماں کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی۔

”ہاں.....! ہوتے گئے گزرے۔ میں نے کہہ دیا ہے راجہ سے، تمہارے خلاف جو چاہے کارروائی

کرے۔ آپ بھی سن لیں امی.....! اگلوں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہنیں، حوالات میں بند کروادیں گے اسے، پھر

مجھ سے مت کہنے گا۔“

وہ چہر چٹکا ہوا چلا گیا۔ بٹول بیگم کڑے تیوروں سے اسد کو دیکھنے لگی تھیں۔

☆☆☆

انسان سب جانتے، سب سمجھنے کے باوجود خدا کے کاموں میں دخل دینے سے باز نہیں آتا۔ کہنے کو یہ بھی

کہتا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، لیکن شاید یل سے تسلیم نہیں کرتا۔ جب ہی انہیں توڑنے پر کمر بستہ ہو جاتا

ہے۔

سیما بھی حالانکہ دیکھ رہی تھی، دانیال اور ثانیہ کی اس کی فرمانبرداری بھی کر رہی تھی، پھر بھی

وہ جو اپنے دل میں غمان چھپی تھی کہ اس گھر میں حجابی آئے گی، وہ تو مستقل اسی گھر میں گئی تھی، اور جب دانیال

لے اسے یہ خوش خبری بتائی کہ وہ باپ بنے والا ہے تو وہ پکارائی ضرور، لیکن اس کے سامنے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے

ہوئی۔

”جج.....! کچھ کہہ رہے ہوتاں.....؟“

”بالکل جج.....!“

وہ بے حد خوش تھا۔

”مبارک ہو.....! ثانیہ کہاں ہے.....؟“

سیما کو ایک دم غائبہ کا خیال آیا۔

”ثانیہ کو اس کی اماں نے رک لیا ہے بھائی.....! اصل میں ڈاکٹر نے ابھی بہت احتیاط کرنے کو کہا ہے

تو اس کی اماں اچھی دیکھ بھال کر لیں گی۔“

دانیال نے کہا تو وہ بگڑ گئی۔

”پاکل ہو گئے ہو.....؟ وہ یوزمی عورت کیا دیکھ بھال کرے گی.....؟ لے کر ڈاکٹر ابھی۔“

”ابھی.....؟“

وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

”چلو.....! اکل نے آنا، اور دیکھو.....! اب صرف دیکھ بھال ہی نہیں، ثانیہ کو ایکسٹرا ڈائنٹ کی بھی

ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہوگا، پھل جو ضرور وغیرہ۔“

”جی جی.....! ابھی کہا ہے ڈاکٹر نے۔“

”تو ابھی.....! ہم خوبصورت صاحب پر یو کچھ سو ڈالیں.....؟ پہلے ہی ان کی ایک بیٹی بچے کے ساتھ گھر

آگئی ہے۔ خوبصورت صاحب بے چارے کی کیا کریں گے.....؟“

سیما جس غلوں کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس پر وہ شہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی.....!“

”پھر ثانیہ کا کچھ کھانے کو دل چاہے گا، تو وہاں ایسے ہی بیٹھی رہے گی۔ اپنے گھر میں ہر بات کی آزاد

ہوتی ہے۔ پھر آرام بھی اپنے ہی گھر میں ملتا ہے۔“

سیما نے مزید کہا تو وہ قائل ہو کر اس وقت ثانیہ کو لینے چل پڑا تھا، اور اس کے جاتے ہی اس نے حنا کو

فون ملا ڈالا، اور پوچھنے ہی بولی تھی۔

”سنو.....! میرے منصوبے پر عمل کا وقت آ گیا ہے۔ تم تیار ہوناں.....؟“

”ٹھیک ہے.....! پھر تم آ جانا.....!“

اس نے غلات میں کہہ کر فون بند کر دیا اور لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ بظاہر نظریں ٹی وی پر

تھیں، لیکن اس کا ذہن مسلسل کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

جب دانیال، ٹانیہ کے ساتھ آیا تو وہ ایک دم متحرک ہو گئی۔ اٹھ کر ٹانیہ کو گھٹے لگا کر مبارک باد دی کہ وہ ماں بننے والی ہے، پھر ان دونوں کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی اور باقاعدہ ہدایات جاری کرنے لگی۔

”بس ٹانیہ.....! اب تمہیں آرام کرنا ہے۔ زیر حیاں اترنے چڑھنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، جو چیز تمہیں چاہئے ہوگی، سب مل جائے گی۔ سن رہی ہو ناں؟“

”جی.....!“

ٹانیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دانیال کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”صرف سننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بھائی کی باتوں پر عمل بھی کرنا ہے۔“

”بس.....! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹانیہ میری بات مانتی ہے۔“

سہانے دانیال کو ٹوکا تو وہ سکین ہی شکل بنا کر بولا۔

”ہاں بس.....! آپ کی ہی مانتی ہے، مجھ سے چارے کی تو سختی بھی نہیں ہے۔“

”ہاں.....! بڑے بے چارے.....! خبردار جو اسے ٹھک کیا تو؟“

”میں کہاں ٹھک کرتا ہوں؟ یہ مجھے ٹھک کرتی ہے۔“

”اچھا بس.....! زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ٹانیہ.....! تم آرام کرو۔ میں تمہارے لئے دودھ لاتی ہوں، چنانچہ ضرور.....!“

”گھر مت کریں بھائی.....! میں چلا دوں گا۔“

دانیال فوراً بولا وہ اسے گھورتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

وہ کسی صورت زدہ ہیپ کے گھر نہیں جاتا جانتی تھی، لیکن جہانزیب کو بھی غالباً ضد ہو گئی تھی، جب ہی اس کا کوئی مدد نہیں سنا اور شام میں اس کے موڈ خراب کر لینے کے باوجود اسے اپنے ساتھ لے گئے، اور وہ جہانزیب کے ساتھ اسے دیکھ کر یوں فاتحانہ انداز میں مسکرایا کہ اسے کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر بھی روٹھی ہی جہانزیب کے پہلو میں بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگا۔

”یقین کریں، مجھے آپ کے آنے سے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

”بکومت.....!“

وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

”ارے.....! آپ تو ڈانٹنے لگیں۔ خیر.....! آپ کو یہ حق حاصل ہے۔ میں قطعی برا نہیں مانوں گا،

ہاں تو تھپڑ مار لیں۔“

اس کی ڈھٹائی پر وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی، پھر بھی کافی حد تک خود پر قابو پا کر پوچھنے لگی۔

”گھر کے باقی افراد کہاں ہیں؟“

”فقط ایک ملازم ہے جو جگن میں مصروف ہے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ اس کی بجائے جہانزیب کی طرف دیکھنے لگی تو انہیں بتانا پڑا۔

”اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ دو بڑے بھائی ہیں اور دونوں ہی ملک سے باہر ہیں۔“

”اور شادی میں نے ابھی تک کی نہیں۔“

جس طرح وہ فوراً بولا، اس طرح اس نے فوراً پوچھا۔

”کیوں؟“

”شاید اس لئے کہ میرے بارے میں سوچنے اور فکر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ والدین کے بعد یہ کام

مہائوں کو کرنا چاہئے تھا، لیکن وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مست و گمن ہیں۔ ہاں.....! البتہ کوئی بہن ہوئی تو وہ ضرور سوچتی۔“

بات کے اختتام پر وہ ہلکے سے مسکرایا تو بس ایک ہل کو اسے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک ڈھکی بھلک نظر آئی تھی جو غالباً جہانزیب نے بھی محسوس کی، جیسی کہنے لگے۔

”یار.....! میں ہوں ناں.....! کیوں تو ابھی بیٹھ بکھواتا ہوں۔“

”اچھا.....!“

وہ ہنسا۔

”صرف بیٹھ بھونانے سے بات نہیں بنتی، اس کے لئے ایک لڑکی کا ہونا بھی ضروری ہے۔“

”لو کیوں کی کیا کیسی ہے؟ البتہ اگر تم نے کوئی آئیڈیل بنا رکھا ہے، تب مشکل ہے۔“

”آئیڈیل تو نہیں بنایا، بس چوتھوں کے لڑکی اچھی سلجھی ہوئی ہو۔“

وہ بات کرتا ہوا اٹھ کر دیوار کے ساتھ رکھے شوکیں کے پاس چلا گیا۔ اس کی دراز میں سے غالباً گہرے کپڑے نکالا اور جب پلانا تو پوچھنے لگا۔

”کیا تمہاری کوئی سائی دیگر نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

وہ پوری قوت سے چیخ کر تنبیہ کرنا چاہتی تھی، لیکن آواز کہیں ملنے ہی نہ لگ گئی۔

”ہاں ہے۔“

جہانزیب بڑے مطمئن اس کی بات کا جواب دے کر کہنے لگے۔  
”مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ چکی واقعی بہت اچھی اور سلیبی ہوئی لڑکی ہے اور تمہارے لئے موزوں بھی

ہے۔“

”جہانزیب.....!“

اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں یہاں ایک لمبے کے لئے بھی نہیں رک سکتی۔ پلایز، گھر چلیں۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟“

جہانزیب نے اس کی کلائی تھامنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا، لیکن وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”بس.....! آپ چلیں۔“

”آخر کیوں.....؟“

”مجھ سے پوچھ رہے ہیں، کیا آپ کو ذرا احساس نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟ ایک آوارہ اور لالو فر

فخس کے ساتھ میری بہن کا نام لیتے ہوئے آپ.....“

”جانے.....!“

انہوں نے ٹوک دیا۔

”کہتے دو یار.....! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔“

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا تو وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جہانزیب سے کہنے لگی۔

”آپ یہاں بیٹھنا چاہیں تو شوق سے بیٹھیں، لیکن میں جاری ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل آئی۔ گیٹ سے نکل رہی تھی کہ جہانزیب تیز قدموں سے چلتے

ہوئے اس کے پیچھے آگئے۔

”تم انتہائی بدتمیز عورت ہو۔“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے گاڑی کا لاک کھولا، پھر کافی ڈورا اٹے کے بعد کہنے لگے۔

”میں نے کوئی ایسی عیب بات تو نہیں کی تھی جو تمہیں آپ سے باہر ہو گئیں۔ وہ بھی زوہیب کے

سامنے، کیا سوچنا ہو گا وہ.....؟“

وہ اس وقت ضبط کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ جانتی تھی کہ بولے گی تو آنسو بھی چھلک پڑیں گے اور پھر

کوئی بڑا ہنگامہ نہ ہوگا، اس لئے ہونٹ ہچکچاتے ہوئے دوسری طرف شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جس کا بدلہ

انہوں نے یوں اٹا کر گھر کے سامنے اسے اتار کر بغیر تھکے دے دیا تھا۔ وہیں سے جانے کس طرف نکل گئے.....؟ اس نے

ان کی گاڑی کو دھڑکتے ہوئے دیکھا، پھر بوجھل قدموں سے اندر آ گئی۔

”ہائیں.....؟ ابھی تو تم گئی تھیں۔“

اس کی اتنی جلد واپسی پر ماں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....!“

”اور جہانزیب کہاں ہے.....؟“

”وہ کسی کام سے گئے ہیں۔“

وہ مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے زوہیب کی اتنی جرأت پر

حیرت کے ساتھ شدید غصہ بھی تھا، جبکہ جہانزیب کی باتوں اور دوپٹے نے بے حد تکلیف پہنچائی تھی، جس سے وہ

رہی تھی اور روئے کے علاوہ کبھی کیا سکتی تھی.....؟

فوری طور پر ذہن یکجہ کی سوچنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بس وہ وہ کراہی ہی خیال کہ زوہیب اس کے بعد اب

اس کی بہن کو فریب دینا چاہتا ہے اور یہ خیال ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے جھٹک سکتی۔

”میرے ساتھ جو ہوا سوہوا، لیکن میں چکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

اس نے سوچا۔

رات کو ماں کھانے کے لئے بلائے آئیں اور جہانزیب کا پوچھا تو ان کے بارے میں لاطینی کا اظہار کر

کے اس نے سہولت سے کھانے کو بھی منع کر دیا۔

”کچھا چھانگے نہ لگے، کھا ضرور لیا کرو۔ ایسی حالت میں بیٹ خالی رہے تو دل زیادہ تلاتا ہے۔“

اماں نے جاتے جاتے کہا۔

”جب بھوک لگے گی تو کھاؤں گی۔“

وہ بے زار سے لہجہ میں بولی۔

”اچھا.....! اور ہاں، تمہارے جانے کے بعد تمہاری امی کا فون آیا تھا۔“

اماں نے اچانک یاد آنے پر بتایا۔

”کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

”تمہاری خیریت معلوم کر رہی تھیں اور یہ کہ بہت دنوں سے تم ان کے پاس گئی نہیں۔“

”جاؤں گی کسی دن۔“

اماں کو اس کا سرسری انداز عجیب سا لگا۔ یعنی نیٹے کے نام پر بھی کوئی اشتیاق ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تب تکیا

کر تے ہوئے بولیں۔

”تم بہت جلد جہانزیب کی ہواؤں بہن.....! انا یاد دہیانے کی کوشش کرو، جیسی تو طبیعت سننے لگی۔ اور یہ

جہانزیب آ جائے تو میں اس سے کہتی ہوں کہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر تمہیں کہیں گھمانے لے جائے۔“

اس نے بہت خاموشی سے ان کی بات سنی تھی۔ پھر انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔

نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا چپ چاپ نکیوں میں سر جھپکا کر سو جائے، لیکن وہ سوچ بھی نہ سکی، خواہ کچھ بھی ہو، اسی وقت جہانزیب کو زور و ہیب کا اصل روپ دکھائے گی۔ اسی لئے جہانزیب کے انتظار میں بیٹھی رہی اور وہ نصف شب کے بعد آئے۔

☆ ☆ ☆

راجہ کو آفس جوائن کئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اس مصروفیت نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اسے پراگندہ سوچوں سے نجات مل گئی تھی اور اب اسے خود پر حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس نے کیسے بتول بیگم کے مظالم برداشت کر لئے۔ اسے تو بہت پہلے خود ہی اسٹینڈل لے لیا تھا پتے تھا۔ بہر حال اب وہ مطمئن تھی۔ اس وقت آفس سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل رہی تھی کہ اسد نے بائیک اس کے سامنے لا کر رکھی۔

”کہاں تک پیدل چلی گی؟ آؤ میں چھوڑ دوں۔“

وہ اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ وہ ناگوار سے سر جھٹک کر سائڈ سے نکل کر پھر چل پڑی، لیکن وہ ایک ذہیت پھر بائیک قریب لے آیا۔

”بواغزوہ ہے؟“ ایک تو بس تھرپرس کھارہا ہوں۔“

”مجھ پر ترس کھانے کی بجائے اپنے آپ پر ترس کھاؤ۔ تمہاری بد معاشیاں جنہیں کہاں لے جائیں گی، کبھی سوچا ہے؟“

وہ چپچا کر بولی تھی۔

”سوچنے کے لئے دماغ چاہئے اور میرے پاس تو دماغ ہے ہی نہیں۔“

اسد نے انتہائی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو دانت پیٹتے ہوئے اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

”ارے! سنو تو!“

وہ بائیک پر تھا۔

”تم نے کیا سوچ کر بھائی سے میری شکایت کی؟ بھائی تو خود مجھ سے ڈرتا ہے۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے؟ بھائی ڈرتا ہے تو میں بھی ڈر جاؤں گی؟ اپنا راستہ لو رو نہ۔“

”ورنہ شور مچا دو گی؟“

وہ اس کا تھوڑا سا ڈرتا ہوا زور زور سے ہنسنے لگا تو وہ واقعی پریشان ہو گئی۔ تب ہی ایک گاڑی اس کے بالکل قریب آن رکی۔ وہ اچھل کر پیچھے بچی، پھر گاڑی میں دانیال کو دیکھ کر فوراً دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”کون ہے؟“

دانیال نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔“

وہ رکتے ہوئے بولی۔

”میرا سابقہ دوست۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“

دانیال کچھ کر پوچھنے لگا۔

”پریشان کرتا ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟“

”بس! ایسا ہی ہے۔ آپ پلیز! گھر میں ذکر مت کیجئے گا۔ اماں پریشان ہو جاتی ہیں۔“

اس نے کہا تو دانیال خاموش ہو رہا۔ پھر بقدر راست خاموشی میں کنا۔ گھر پر اترتے ہوئے اس نے دانیال کو اندر آنے کو کہا، لیکن وہ پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ وہ اندر آگئی۔ اماں شوبی کو دیکھ کر ہنس گئیں۔ خولید صاحب وہیں

”اُوہ جوتے۔ وہ سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھی تو وہ پوچھنے لگے۔“

”بیٹا! تمہیں آنے جانے میں یا آفس میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”نہیں بابا۔۔۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور اگر ہوگا بھی تو اب میں گھبرا کر بھاگوں گی نہیں۔ میں نے سوچ لیا۔“

پ۔

اس نے جی داری کا مظاہرہ کیا تو خولید صاحب خوش ہو گئے۔

”شاہناشا بیٹا! میں تمہارے منہ سے یہی سنتا جا رہا تھا۔ میری بیٹی اب بہادر بن گئی ہے۔“

”کمزورتوں پہیلے بھی نہیں تھی اب! بس! مجھے ارشٹوں کا پاس تھا۔“

ان کے دل میں شس سی اٹھی تھی۔

”میں جانتا ہوں بیٹا! ارشٹوں کا پاس رکھنے والے کمزور نہیں ہوتے، بلکہ اصل بہادری ہی انہی ہے، لہذا انسان کو خود اپنے ساتھ جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اپنی ”میں“ کو مارنا آسان نہیں ہے، جو اپنی ”میں“ کو کھٹکتا

اچھے ہیں، وہی بہادر کہلاتے ہیں۔ کیوں نیگم۔۔۔۔۔؟“

خولید صاحب نے کہتے ہوئے اچانک بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

”جتنائیں میاں! آپ کی باتیں آپ کی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ اسی سے پوچھیں، ٹھیک کہہ رہے ہیں یا

”؟“

اماں نیکیں سے شوبی کا منہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”ابا! ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں!“

وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر شوٹی کو اٹھانا چاہا تو وہ اس سے چٹ گیا۔  
”ارے.....! یہ تو اب میرے پاس آتا ہی نہیں، دیکھ رہے ہیں اب!.....!“  
”ہاں.....!“

خوبصاحب ہنسنے لگے۔

”چلو جاؤ.....! تم منہ ہاتھ دھو، دھو چکی ہوئی آئی ہو۔“

اس نے کہا تو وہ شوٹی کو پیار کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”پتا نہیں آپ باپ جی کیسے مطمئن ہیں؟ مجھے تو ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔“

اس نے کہا تو خوبصاحب چونک کر پوچھنے لگے۔

”کیسا دھڑکا.....؟“

”اسی اسدکا، اس دن گھر تک آ گیا تھا۔ اب کہیں آتے جاتے رابعہ کے پیچھے لگ گیا تو.....؟“

”تو اس کے ڈر سے رابعہ گھر میں بند ہو بیٹھ جائے.....؟“

خوبصاحب فوراً بولے تھے۔

”نہیں بیگم.....! رابعہ کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ اگر پہلے ہی قدم پر ڈر کر بیٹھ گئی تو آگے

کیسے بڑھے گی.....؟“

”اور جو لوگ.....“

”کیا لوگ لوگ.....؟ لوگوں کے ساتھ مسائل نہیں ہوتے کیا جو باتیں بتاتے ہیں؟ وہ پہلے اپنے

گربانوں میں جھانگیں، مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے.....! امت کریں کسی کی پروا!.....! لیکن یہ ضرور سوچیں کہ رابعہ کی ابھی کوئی اتنی عمر نہیں

ہے۔ اپنے محلے میں ہی رابعہ کے ساتھ کی کتنی لڑکیاں ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔“

اس نے انہیں احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے.....؟“

خوبصاحب چونکے تھے۔

”مطلب پوری زندگی بٹھائے نہیں رکھنا رابعہ کو، کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر رخصت بھی کرتا ہے اسے۔“

اس نے خوبصاحب کو سختی سے کہہ کر رخصت کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آرام کی ضرورت ہے اور سیر حیاں اترنا چڑھنا تو اس کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ پہلا بچہ ہے، احتیاط کرنی چاہئے۔ احتیاط کے نام پر قید تجانی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔

اس وقت وہ دانیال سے شکایت تو نہیں، طرے سے بات کر رہی تھی۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا دانیال.....! بھابی کو بار بار اوپر آنا پڑتا ہے۔ آپ ان سے کہیں ناں.....! میں آرام

سے سیر حیاں اتروں گی۔“

”بے کار ہے، بھابی مائیں کی ہی نہیں۔ انا مجھے ڈانٹنے کھڑی ہو جائیں گی۔“

دانیال نے کہا تو وہ مت سے بولی۔

”پلیز دانیال.....! آپ میرا نام لے لیجئے گا، میں ایک کمرے میں بور ہو گئی ہوں۔ چلنا پھرنا

چاہتی ہوں۔“

”جی ہاں.....! بھابی کہیں گی، ضرور چلو.....! میرے پر جانے دو.....!“

”آف.....!“

وہ جھنجھلا گئی۔

”آپ خود ہی ہر بات کا جواب دیئے جارہے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے ناں جان.....! بھابی یہی کہیں گی، پھر تم خود سوچو.....“

دروازہ کھلنے سے دانیال کی بات ادھوری رہ گئی۔ حنا کھانے کی فرے لے اندر آ رہی تھی۔

”ارے.....! آپ نے کیوں زحمت کی.....؟“

دانیال اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے دانیال صاحب.....! کیونکہ میں نے یہ زحمت آپ کے

لئے نہیں، اپنی آپا کے لئے کی ہے۔ بے چاری اوپر بچے آ جا کر تھک گئی ہیں۔“

حنانے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”ہاں.....! جانیابھی یہی کہہ رہی تھی کہ بھابی کو بار بار اوپر آنا پڑتا ہے۔“

”اس لئے انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ خیر.....! یہ باتیں، یہ فرے کہاں رکھوں.....؟“

حنانہ اصرار دیکھنے لگی۔

”لائیے.....! مجھے دیجئے.....!“

دانیال نے فرے پکڑی، حنا بٹھانا، دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہو.....؟“

حنانیہ نے مسکراتے پر اسکا کیا تھا۔

حنانیہ کو سیمانے اس کے کمرے تک محدود کر دیا تھا اور دانیال بھی سیمائی باتوں میں آ گیا تھا کہ اسے ابھی

”چلیں..... آپ لوگ کھانا کھائیں، اور ہاں!..... کچھ اور چاہئے ہوتا یا نہیں۔“  
 ”نہیں بس..... شکریہ!“

دانیال نے ٹرے کا تانبہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو خداوند نے اسے اچکا کر چلی گئی۔  
 ”دیکھو۔۔۔ اچھا! کوکتا خیال ہے تمہارا، تو کھٹک گئیں تو بہن کو بلا لیا۔“

دانیال نے پھر بیٹھے جوئے کہا تو وہ خاموش ہو رہی، اور پھر وہ خاموش قماشانی ہی بن گئی تھی۔ ناشہ، کھانا، شام کی چائے کے علاوہ بھی کتنا، دانیال کے چھوٹے مونسے کو نام پوچھنے کے لئے چلی آتی تھی، اور اس شام تو حد ہی ہو گئی۔ دانیال بچوں کی ضد پر انہیں آفس کریم دلانے لے جا رہا تھا تو خدا بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی کونڈی کے سامنے دانیال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو اس کی جھمی جس آلام بہانے لگی تھی۔ وہ فوراً کمرے سے نکل کر پیچھے آئی تو اسے دیکھتے ہی سیما بول پڑی۔

”ارے.....! تم یہاں کیوں آ گئیں؟ کچھ چاہئے کیا؟“

”نہیں..... اوہ..... میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ کتنا، دانیال کے ساتھ گئی ہے؟“  
 اس نے مشکل سے ہی سہی لیکن اصل بات کہہ دی۔

”ہاں..... اوہ کتنا گھر جانا تھا۔ دانیال نے کہا، میں چھوڑ دوں گا۔ وہ تو منع کر رہی تھی لیکن.....“  
 سیما کھیا ہٹ میں بات پوری نہیں کر سکی تو اسے سمجھانے لگی۔

”جسمیں سیزہاں نہیں اُترتی چائیں..... خدا کو اتنی اونچ اونچ سوچ ہو گئی تو؟“

”کچھ نہیں ہوتا بھائی.....! اس فارغ بیٹھے بیٹھے پور ہو گئی ہوں۔ پلیز.....! مجھے اتنا پابند نہ کریں۔“  
 وہ جگ پڑ کر بولی تھی۔

”میں کہاں پابند کر رہی ہوں چند!؟ یہ وقت تو ہر عورت پر آتا ہے۔ ماں بننا آسان نہیں ہوتا۔ بہت کچھ سہا پڑتا ہے۔“

سیما نے اس کا کال چھو کر پیار سے کہا۔

”لیکن بھائی.....! اس طرح تو میں دست اور پیار پڑ جاؤں گی۔ پھر ڈاکٹر نے بھی مجھے کام کرنے سے تو منع نہیں کیا۔“

”سیزہاں اُترنے چڑھنے سے تو منع کیا ہے ناں؟“

سیما فوراً بولی تھی۔ وہ براہ سمنہ بنا کر رہ گئی۔

”بس.....! شروع کے تین چار مہینے ہیں، اس کے بعد ڈاکٹر خود جسمیں واک کرنے کو کہے گی۔ چلو.....! اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ زیادہ دیر کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جاؤ ناشاباش.....! آرام کرو۔۔۔!“  
 سیما کے اتنا پیار جتنا ہے پروہ بس ہو گئی اور اپنے کمرے میں آکر وہ اصل بات بھول ہی گئی، یعنی اس

کا دھیان ختا کی طرف سے ہٹ گیا تھا، جب ہی اگلے دن جس وقت دانیال آفس جا رہا تھا تو وہ اس کے ساتھ ماں کے گھر آ گئی۔ اس کا ارادہ کچھ دن نہیں رہے۔ دانیال مان تو نہیں رہا تھا، لیکن پھر اس کی طبیعت دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

بہر حال وہ کھلی آواز فضاء میں سانس لینا چاہتی تھی۔ لیکن آگے ماں، رابعہ کے لئے فکر مند بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے اس کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں اسد رابعہ کو آفس آتے جاتے جگ نہ کرے تو وہ بھی خوب صاف صاف کی طرح کہنے لگی۔

”اماں.....! آپ کیا جانتی ہیں۔ اسد کے ڈر سے رابعہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے؟ نہیں.....! اس نے جاب جو ان کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔“

”اچھا بس.....! ابھی اپنے سرال میں نڈھوٹہ دراپنا۔“  
 اماں نے اسے نوک دیا۔

”ارے اماں.....! میرے سرال والے دقیقہ فوری نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ سب پڑھے لکھے ہیں۔“  
 اس نے کہا تو اماں آہ بھر کر بولیں۔

”پڑھا کھتا تو عباد بھی تھا، لیکن دیکھو.....! کیسی جہالت کا ثبوت دیا۔ سوچا نہ سمجھا، طلاق تھا کہ نکال دیا۔“

یوٹی کو.....  
 ”ان کی بات تو آپ رہنے ہی دیں۔ میں تو کہتی ہوں، اچھا ہی ہوا جو رابعہ کی جان چھوٹ گئی ان لوگوں سے۔“

”تمہارے اماں بھی یہی کہتے ہیں۔“

اماں سر جھک کر بولی تھیں۔

”جب سب ہی کہتے ہیں تو آپ کیوں نہیں مان لیتیں.....؟ آپ کو کس بات کا غم ہے.....؟“  
 اس کی بات پر اماں چڑھ گئیں۔

”ارے.....! جوان بنی اجڑ کر آ گئی، غم نہیں ہوگا تو کیا خوشی ہوگی.....؟“  
 ”افوہ اماں.....! میرا یہ طلب نہیں تھا۔“

وہ اٹھ کر ان کے پاس بیٹھی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

”ہونے والی بات تھی، خیر چھوڑیں.....! یہ بتائیں.....! ابابک آتے ہیں.....؟“  
 ”آ جاتے ہیں چار پانچ بجے تک۔“  
 ”تم تو زکوٰۃ کی ناں.....؟“

”ہاں اماں.....! تین چار دن رہیں گی۔“

”اچھا.....! پھر تم ذرا شوہنی کو سنبھالو، میں رابعہ کے کچھ سوٹ درزن کو دے آؤں۔ آفس آنے جانے

کے لئے ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں اس کے پاس۔“  
اماں نے کہتے ہوئے اٹھ کر الماری کھول دی۔  
”ہاں اماں..... میں پوچھنے والی تھی۔ راجہ کا سامان واپس نہیں بھجوا یا ان لوگوں نے؟“  
اس نے کہا تو اماں جلتے کانداز میں بولیں۔  
”نہیں..... اسب دبا کر بیٹھ گئے۔ خیر..... ادفع کرو..... تم دروازہ بند کر لو، میں بس یہ کپڑے دے کر آ جاؤں گی، اور ہاں.....! شوٹی کو فیڈ رو سے دیتا۔“  
”جی اچھا.....!“  
وہ اماں کے ساتھ باہر نکلتی آئی۔ پھر دروازہ بند کر کے شوٹی کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆

راجہ آج آفس سے کچھ جلدی نکل آئی تھی۔ اسے شوٹی کے لئے کپڑے اور کچھ کھلونے خریدنے تھے۔ اس نے اپنی کوئی نو رین کو بھی ساتھ قرعہ مار کر لے کر لے لیا، لیکن اسے کہیں اور جانا تھا اور اس نے راجہ سے کہا بھی کرکل پٹیں گے، لیکن راجہ اب خود کو کسی کے بھی سہارے کی محتاج نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لئے وہ اکیلی ہی مار کرکل چل پڑی، اور اسے زیادہ شاپنگ تو کرنی نہیں تھی، شوٹی کے دو تین سوٹ اور ایک دو کھلونے لے کر وہ جلدی فارغ ہو کر کنوئیں کے انتظار میں کھڑی تھی کہ اسے نام کی پکار پر چونک کر دیکھتے ہی بلا ارادہ پیچھے ہٹنے لگی۔

”راجہ..... امیری بات سنو.....!“

عباد اس کی طرف بڑھا تو وہ ایک دم ہلٹ کر چلنے لگی۔

”زک جاؤ راجہ..... امیری بات تو سنو.....!“

عباد تیز قدموں سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”خیر ارستہ چھوڑیں پلیز..... اچھے آپ کی کوئی بات نہیں منی۔“

وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی تھی۔

”سنوٹی نہیں تو بھوکھی کیسے؟“

عباد نے کہا تو وہ ترخ کر بولی۔

”کیا سمجھنا چاہتے ہیں آپ مجھے.....؟ اور اب آپ ہوتے کون ہے مجھے سمجھانے والے؟“

”فیک ہے.....! میں تمہارا کوئی نہیں، لیکن تمہارے بچے کا باپ تو ہوں ناں.....؟ اور یہ تعلق تو ہمارا

ٹوٹنے والا نہیں ہے۔“

عباد کی بات پر وہ حیرت سے لک گئی۔

”آپ مجھے بلیک سیل کر رہے ہیں۔“

”بھڑا.....! نہیں.....!“

وہ فوراً بولا تھا۔

”میں نیک منی سے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، پلیز.....!“

”کیسے.....! کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

وہ جرم کرکڑی ہو گئی تو عباد نے ادھر ادھر دیکھا، پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”میرا خیال ہے، ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں.....؟“

”آپ.....“

اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”دیکھو.....! مجھ پر نہ کسی تمہیں اپنے آپ پر تو بھروسہ ہے ناں.....؟“

وہ ایک دم ہونٹ پیچھنے لگی۔ پھر اس کے ساتھ شاپنگ مال کے کیفے میر یا میں آگئی اور بیٹھنے ہی بولی تھی۔

”جو کہنا ہے، جلدی کہیں.....! میں زیادہ پر نہیں رک سکتی۔“

”ووہ..... میری کچھ بات نہیں آ رہا ہے، میں تم سے کیسے کہوں.....؟“

عباد واقعی بے بس لگ رہا تھا۔

”تم شاید یقین نہ کرو، لیکن یہ سچ ہے کہ میں اپنے کپڑے پر صرف شرمندہ ہی نہیں، بلکہ بچپتا بھی رہا

ہوں۔“

”اچھا.....؟“

اس کی ذرا سی ہنسی میں ڈکھ کے ساتھ استہزاء بھی تھا۔

”آپ کا بچپتا میرے ماتھے پر لگا طلاق کا داغ نہیں مٹا سکتا عباد الرحمن.....! اور نہ میرے بچے کو وہ

کانفیڈنس دے سکتا ہے جو ماں باپ کے سایے میں پروان چڑھنے والے بچے کو حاصل ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہارا اور بچے، دونوں کا نگاہ رہوں۔ تم مجھے جو چاہے سزا دو۔“

وہ بے حد نامدم تھا۔ راجہ نے تاسف سے اسے دیکھا، پھر کہنے لگی۔

”بچپتا دے کی آگ میں جل رہے ہیں آپ، کیا یہ سزا کافی نہیں ہے.....؟ اور آپ کیا سمجھتے ہیں؟

میرے سامنے اعتراف کر کے آپ اطمینان سے ہو جائیں گے.....؟ نہیں عباد.....! آپ کی قسمت میں اطمینان ہے

فی نہیں۔ جو شخص بیوی کو غلام بنا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا، اسے کوئی بات اطمینان نہیں دے سکتی۔“

”تم مجھے معاف کر دو تو شاید.....“

اس کے کرور لہجے پر وہ سچ کر فوراً بولی تھی۔



”معاف کیا.....! سب معاف کیا آپ کو، اور آپ کی اماں کی بھی سب زیادتیاں معاف کرتی ہوں۔ اس کے بعد مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔“

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی اٹھ کر تیز قدموں سے وہاں سے نکل آئی تھی۔ پھر اس نے وین کا انتظار نہیں کیا، بدکشہ سے گھر آگئی اور ٹائیڈ کچھ کر کے اس کا موڈ آپ ہی آپ ٹھیک ہو گیا۔

”تم کب آئی؟“

”میں تو صبح ہی آگئی تھی، اور کچھ دن ہوں گی بھی۔“

ٹائیڈ نے بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔

”جج؟“

”ہاں.....! لیکن تم تو سارا دن ہوتی نہیں ہو۔“

”تو کیا ہوا.....؟ راتیں تو اپنی ہیں۔“

وہ کل کر مسکرائی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے بعد وہ جلدی جلدی اگلے دن کے لئے کپڑے اسڑی کرنے لگی، ہاتھ کراغٹ سے ٹائیڈ کے ساتھ بیٹھ سکے۔ ٹائیڈ شہنشاہی کو چھپتے ہوئے جیسی آواز میں کوئی لوری ٹنگتا رہی تھی، تب ہی اماں آکر پوچھنے لگیں۔

”شوئی سو گیا کیا؟“

”جی.....! آئیں بیٹھیں اماں.....! کیا کیا کر رہے ہیں؟“

ٹائیڈ نے کچھ بتا کر اماں کو بیٹھنے کا کہتے ہوئے ابا کا بھی پوچھا۔

”تمہارے ابا بھی لیٹے ہیں۔“

اماں بیٹھ گئیں۔ رابعہ نے پرس کیا ہوا سوٹ بھنگ کر کیا، پھر اماں سے بولی تھی۔

”اماں.....! ایک بات بتانی ہے آپ کو۔“

اماں کے ساتھ کچھ بھی اے دیکھنے لگی تھی۔

”آپ پریشان مت ہوئے گا اماں.....! اور ابا سے بھی مت کہنے گا۔“

رابعہ نے کہا تو اماں ٹھک کر بولیں۔

”بات کیا ہے؟“

”وہ..... آج جب میں آفس سے آ رہی تھی تو راستے میں عبا دل گئے تھے۔“

رابعہ نے بتایا تو اماں پریشان ہو گئیں۔

”پھر؟“

ٹائیڈ نے ناگواری سے پوچھا۔

”پھر کچھ کہا تو نہیں، بس اپنی یاد تئیں کی معافی مانگ رہے تھے۔“

رابعہ نے قہقہہ آہستہ انداز اختیار کیا تھا۔ اماں تو گنگ بیٹھی تھیں، لیکن ٹائیڈ خاموش نہیں رہ سکی۔

”تم نے کیا کیا.....؟“

”میں کیا کہتی.....؟ معاف کر کے چلی آئی۔“

رابعہ، ٹائیڈ کو جواب دے کر اماں سے مخاطب ہو گئی۔

”اماں.....! یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ کبھی بھی سامنا ہو سکتا ہے،

اور آپ کو میں اس لئے پریشانی ہوں کہ کسی اور سے کن کر مجھ سے بدگمان نہ ہو جائیں۔“

”ٹھیک ہے.....! لیکن آئندہ کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے بات کرنے کی۔“

اماں نے اچانک تیز لہجے میں کہا تو وہ جڑ بڑ ہو کر بولی۔

”میں کیا بات کروں گی اماں.....؟ عبا خود ہی سامنے آگئے تھے، اور وہ تو شوئی سے ملنے بھی آ سکتے ہیں

ناں.....؟ باپ ہیں شوئی کے، ہم منع تو نہیں کر سکتے تان.....؟“

اماں خاموش ہو گئیں تو وہ ایک نظر ٹائیڈ کو دیکھ کر بولی۔

”خیر.....! آپ فکر نہ کریں، عبا یہاں نہیں آئیں گے۔“

☆.....☆.....☆

وہ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ذرا سا جھکے پھر فوراً ہی نظر انداز کرتے ہوئے واش روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کپڑے تبدیل کر کے نفل کو سیدھ اچنی چلے گئے اور آنکھیں بازو سے ڈھانپ لیں۔ عام حالات میں وہ فوراً غافل بھی ہو جاتے تھے، لیکن اس وقت جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ فوراً سوئیں سکیں گے۔

وہ کچھ دیر تک بہت خاموش نظر دے کر ان کا جائزہ لینے کے ساتھ یہ جانے کی کوشش کرتی رہی کہ آیا ان کی ناراضگی محض زرد وہیب کے کھڑے چلنے پر ہے، یا وہ دوبارہ اس کے پاس جا کر مزید کچھ جان آئے ہیں.....؟ لیکن اپنے طور پر وہ کچھ نہیں جان سکی۔ جب ساری ہمتیں کجا کر کے انہیں پکارا۔

”بھاننا زب.....!“

انہوں نے ذرا سا بازو نیچے کیا اور گردن موڑے بغیر آنکھیں ترچھی کر کے اسے دیکھ کر بولے۔

”بھتر ہے، اس وقت چپ چپ سو جاؤ۔“

”مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

وہ عاجزی سے بولی۔

”کیوں.....؟“

انہوں نے بازو مزید نیچے کھسکایا اور جواب نہ پا کر پوچھا۔

”کیا تم اپنے رقبے پر نام ہو؟“

”نہیں!“

”نہیں؟“

اس نے کچھ جھنجھلا کر زہرا یا اور طفر سے بولے۔

”گو یا میری طرف سے ندامت کا اظہار چاہتی ہو؟“

”نہیں!“

”پھر کیا چاہتی ہو؟“

”بس! آپ میری بات بس لیں۔“

”کون سی بات؟“

”وہی جو میں نے آپ سے جب جب کہنی چاہی، آپ نے ٹوک کر مجھے خاموش کر دیا۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً سوچنے لگے تھے کہ انہوں نے کب کب اسے ٹوکا اور کس بات پر؟ پھر قدرے تاخیر سے ابھیر کی تجسس کے بولے۔

”کہو!“

اور وہ جو بیڑی کی بجائے ٹیک لگے سیدھی بیٹھی تھی، گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگی اور انہیں متوجہ پا کر دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں آ کر گویا ہوئی۔

”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ بس جو میری غلطی ہے، اس کا اعتراف کروں گی۔ اس کے بعد میں خود کو مذہدار نہیں سمجھتی اور آپ سے میں یہی کہوں گی کہ غیر جانبداری سے میری بات سنیں۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میں شادی سے پہلے اس وقت جب آپ کی اور میری نسبت طے ہو چکی تھی، آپ کے چنک گئی تھی اور آپ کو دیکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس روز میں خاص طور سے اس مقصد کے لئے نہیں گئی تھی، میری ایک ساتھی خیر کو وہاں کام تھا اور وہاں جا کر میں نے سوچا، جب یہاں تک آئی گی ہوں تو آپ کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ اگر آپ مجھے کہیں تو یہ ایک فطری خواہش تھی جسے میں دبا نہیں سکی اور بار بار وہ

بے اختیار آپ کی فینک کی طرف بڑھ کر آپ کا نام پوچھا تھا اور اس وقت وہاں جو شخص بیٹھا تھا، اس نے بڑے اعتماد

یقین کے ساتھ خود کو ”جہانزیب“ کہا تھا اور میں اسے ہی جہانزیب سمجھ کر فوراً وہاں سے پلٹ آئی تھی۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”جانتے ہیں وہ شخص جس نے خود کو جہانزیب کہا، وہ کون تھا؟ آپ کا جگہری دوست زوہیب۔“

اس کے لہجے میں بے تحاشائی آسانی۔

”اگر بات وہیں ختم ہو جاتی تو میں سمجھتی اس نے یوں ہی مذاق کیا ہے، لیکن اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً مجھے آپ کے حوالے سے ملتا رہا، جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں آپ کی نگہبیر ہوں۔ آپ شاید اس کی طرف داری میں یہ کہیں کہ

ہو سکتا ہے، اسے یہ بات معلوم نہ ہو اور اس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر دوسری لڑکیوں کی طرح میرے ساتھ بھی راہِ رو کم بڑھائی ہو تو ایسا نہیں ہے۔

اگر ایسی بات ہوتی تو مجھے آپ کی بیوی کے روپ میں دیکھ کر نہ صرف شرمندہ ہوتا بلکہ معافی بھی مانگتا۔ جبکہ اس کے برعکس وہ اب تک مجھے دھمکیاں دیتا ہے کہ مجھ سے اسی طرح ملوور نہ میں جہانزیب کو سارا احوال کہہ

شاؤں گا اور پھر شروع میں آپ نے خود محسوس کیا کہ میں کتنی خوفزدہ تھی لیکن پھر ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آپ کو ساری حقیقت بتا دینی چاہئے اور بارہا میں نے آپ کو بتانے کی کوشش بھی کی لیکن ہمیشہ آپ نے یہی سمجھا کہ

میں روایتی بیوی بن کر آپ کو زد و کوب سے متفرک کرنا چاہ رہی ہوں، اس لئے پہلے ہی مقام پر آپ نے مجھے سختی سے ٹوک دیا کہ میرا ایک ہی دوست ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنوں گا۔ اب آپ ہی بتائیے، میں کیا کرتی۔“

اس نے خاموش ہو کر انہیں دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ وہ غلطی کا اعتراف کر کے ایک اور غلطی کر گئی ہے۔ وہ پتا نہیں ضبط کر رہے تھے یا کیا تھا کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا؟ اور آنکھوں میں

بے تحاشہ غصہ پتا نہیں کس کے لئے تھا؟

اور اسے اپنی طرف دیکھتے یا کر انہوں نے پہلے رخ موڑا، پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر سر گرہٹ کا پکٹ آٹھا یا اور کچھ کہے بغیر کرے سے نکل گئے۔ جس سے وہ مزید پریشان ہو گئی۔ اگر وہ کچھ کہہ کر دل کی بھڑاس

نکال لیتے لیٹے وہ اتنا تواضعانہ ہی لیتی کہ انہوں نے کس حد تک اسے قصور وار سمجھا ہے؟ اور آیا معافی کی تمنا نہیں ہے یا نہیں؟ لیکن وہ تو یوں ہی اس کے سر پر تلواریں چھوڑ گئے تھے، جس کے سوا اسے اپنا دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا، اور

یہ خوف الگ کہ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

☆.....☆.....☆

جتانے دانیال کی گاڑی دیکھ کر ہی اسے رُکنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر تیز قدموں سے قریب جا کر گاڑی کے

شیشے پر دونوں ہاتھ جا کر بولی تھی۔

”سوری! میری وین بس ہو گئی ہے۔ پلیز! آپ مجھے چھوڑ دیں۔“

”چھوڑ دوں؟“

دانیال جانے کس موڈ میں تھا۔

”میں نے آپ کو پکڑا ہی کب ہے؟“

”تو اب پکڑ لیں ناں.....!“

حنا شوقی سے کہتے ہوئے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”ارے ارے.....! آپ تو زبردستی.....“

”مجھے پتا ہے، آپ منع نہیں کریں گے۔ چلیں!“

وہ دھڑلے سے بولی تو دانیال نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اب آپ یونیورسٹی کو بغیر باء کہہ دیں۔“

”کیوں.....؟“

وہ اٹھلا کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیونکہ چار سال بہت ہوتے ہیں، جھگڑا آگئی ہوگی یونیورسٹی آپ سے۔“

”جناب.....! آپ کو پتا ہی نہیں ہے، ہم جو سولے تو یونیورسٹی کی شان ہے۔“

اس کے گردن اکڑنے پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اچھا.....!“

”ارے.....! آپ ہنستے بھی ہیں.....؟“

حنا نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”کیوں.....؟ آپ نے مجھے پہلے ہنسنے ہوئے نہیں دیکھا کیا.....؟“

”نہیں.....! میں نے تو جب بھی دیکھا، آپ کی پیشانی پر اتنی موٹی موٹی کیریں کھینچی ہوتی تھیں۔“

اس نے کہا تو دانیال ذرا سے کندھے اچکا کر پچھنے لگا۔

”آپ کو کہاں چھوڑنا ہے.....؟“

”اپنے گھر.....! اٹنی مین، مجھے آپا نے بلایا ہے، ان ہی کے پاس جاؤں گی۔“

اس نے کہا تو وہ خاموش ہو رہا۔ پھر اسے گھر کے گیٹ پر ہی اتار کر وہ چلا گیا۔ اسے کانپے کے پاس جانا

تھا۔ حنا نے اندر آتے ہی ”آپا.....! آپا.....!“ پکارنا شروع کر دیا۔ وہ یوں خوش ہو رہی تھی جیسے کوئی میدان مار لیا

ہو۔

والی ہو۔

”میں دانیال کے ساتھ آئی ہوں۔“

”دانیال کے ساتھ.....؟ کہاں ہے دانیال.....؟“

سیما اس کے عقب میں دیکھنے لگی۔

”اسے کہیں اور جانا تھا۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا، اور پتا ہے آپا.....! سارا راستہ دانیال میرے ساتھ بنی

ملاقات کرتا رہا۔ بڑے موڈ میں تھا۔“

”اچھا.....! لیکن تم اب ذرا سنبھل کر چلتا۔ یہ نہیں کہہ دانیال نے بس کہ بات کر لی اور تم اس کے آگے

بچے پھرنے لگی.....؟“

سیما نونکے ہوئے واپس بچن میں چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں آپا.....! آگے پیچھے تو اب وہ میرے پھرے گا۔“

”اللہ کرے، جو تم کہہ رہی ہو، ویسا ہی ہو۔ بس.....! مجھے تمہاری جلد بازی سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔“

سیما ساکن کی قبلی میں کچھ چلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں کروں گی جلد بازی، آپ بے فکر رہیں، اور یہ آپ کا کیا رہی ہیں.....؟“

حنا نے قبلی میں جھانک کر دیکھا۔

”نہاری.....!“

”آف.....! کون کھاتا ہے نہاری.....؟“

حنا نے برا سامنا بنایا۔

”دانیال.....! دانیال کو نہاری بہت پسند ہے۔ پکنا سیکھ لو، ہر دوسرے دن نہاری کی فرمائش کرے گا۔“

”اچھا.....! میں تو جیسے فوراً اس کی فرمائش پوری کروں گی.....؟“

”پھر کیا کروں گی.....؟“

”وہ تو جب میں یہاں آ جاؤں گی، تب آپ خود کہہ لیجئے گا۔“

دونوں بہنیں یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے دانیال حنا کا منگیتر ہو اور کچھ ہی دنوں میں ان کی شادی ہونے

☆ ☆ ☆

ٹائی فون رکھ کر اماں کے پاس آ کر بولی۔

”اماں.....! ابھی دانیال کا فون آیا تھا، وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔“

”ہیں.....؟ ابھی دہشتی کچھ دن اور.....؟“

”خیر ت تو ہے ناں.....؟ کیوں چلا رہی ہو.....؟“

سیما نے بچن سے نکل کر پوچھا تو وہ بھاگ کر اس سے پٹ گئی۔

”چلا نہیں رہی، خوش ہو رہی ہوں۔ آپ پوچھیں کیوں.....؟“

”کیوں.....؟“

سیما نے فوراً پوچھا تو وہ کھلکھلا کر بولی۔

اماں نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”منع کروں دانیال کو؟“

”ارے نہیں بیٹا! اسے منع کرنا مناسب نہیں ہے۔“

اماں، رابعہ کی وجہ سے بہت محتاط ہو گئی تھیں۔

”چلیں! کچھ دن ٹھہر کر میں پھر آ جاؤں گی۔“

اس نے کہا تو اماں تا کیر کرتے ہوئے بولیں۔

”ہاں بیٹا! پہلے اپنا کھر دیکھو۔ دانیال خوشی سے اجازت دے تو آ جانا۔“

”جی.....!“

تب ہی گاڑی کے بارن کی آواز پر وہ چونک کر بولی۔

”میرا خیال ہے دانیال آ گئے! ٹھیک ہے اماں! میں چلتی ہوں۔“

”ارے! اندر تو آنے دو اسے۔“

اماں نے نو کا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں اماں! دانیال کہہ رہے تھے، انہیں کہیں اور بھی جانا ہے، پھر آ جائیں گے۔“

”اچھا.....!“

”اللہ حافظ اماں!.....“

وہ اماں سے سگڑل کر فوراً ہر نکل آئی۔ دانیال نے اسے دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

”میں نے آپ سے چار دن کا کہا تھا، آپ دوسرے ہی دن لینے آ گئے.....؟“

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی بولی تھی۔

”کیا کروں؟ دل ہی نہیں لگتا تمہارے بغیر۔ اپنا کمرہ کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ بس! اب یہاں

رہنے کی بات مت کرنا۔“

وہ ڈرائیونگ کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے بولے رہا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

”بہن! یہ بات ہے، میں آنے جانے کو منع نہیں کر رہا، صبح آؤ، شام میں واپس! دن تو کٹ جاتا ہے

تمہارے بتا، رات نہیں ٹھنکی۔“

اس کی محبت پر وہ خاموش ہو رہی تھی۔ پھر گھر آ کر وہ سب کو صرف سلام کر کے، دانیال اسے کھینچے ہوئے

کمرے میں لے آیا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے.....؟“

وہ روٹھنے لگی۔

”کیا سوچتی ہوں گی بھابی.....؟“

”کچھ نہیں سوچیں گی۔“

دانیال نے اسے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی شوخ جسامتوں سے پتیلی جاری تھی کہ اچانک دروازہ

کھلنے پر وہ گھر آ کر اس کی ہاتھوں سے نکل گئی۔

”جائے حاضر ہے جتااب.....!“

جنا جانے کی ٹرے اٹھائے اندر چلی آئی۔

”اور دیکھیں، میں نے آپ کے لئے سینڈ ویچ بنائے ہیں۔“

”جھیک یو.....! اس وقت واقعی جائے کے ساتھ کچھ ہلکا کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔“

دانیال کو مردانہ کہنا پڑا۔ جبکہ اسے جتنا کا بغیر دستک دیئے آتا عجیب سا لگ رہا تھا۔

”مجھے آپ کے دل کی خبر ہو گئی تھی، جیسی میں نے جھٹ پٹ سینڈ ویچ بنا ڈالے۔“

جنا کچھ زیادہ اور رو ہو گئی تھی۔ دانیال نے شپٹا کر اسے دیکھا تو وہ قصداً انجان بن گئی تھی۔ جتنا ٹرے ٹیبل پر

رکھ کر کپ سیڈے کرنے لگی، پھر تانیہ کو دیکھ کر بولی۔

”دانیال کا تو غیر مجھے پتا ہے، تم تپتی چینی لوگی؟“

”جتنی دانیال لیتے ہیں۔“

وہ سہولت سے بولی تھی۔

”واؤ!.....! یعنی دونوں کا ٹیٹ ایک ہے.....؟“

جنا نے اپنی کھسپاٹ ”واؤ“ میں چھپائی تھی۔

”ہم ایک ہیں تو ٹیٹ بھی ایک ہی ہوگا۔“

اب اس نے قصداً احتیاط جتایا تھا۔

”اچھی بات ہے.....! چلیں، آپ جائے نہیں!.....!“

جنا مزید ٹھہر نہیں سکی۔ کپ میں جانے والے بغیر چلی گئی تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، دانیال سانس کھینچ

کر بولا تھا۔

”جھیک گاؤ!.....!“

وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہتی تھی تو اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیونکہ اپنی ذات کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

حتا کو پہلے اگر خوش تھی حتیٰ تو اب مند ہو گئی تھی۔ اس کے خیال میں شاید اس کے مقابلے میں بے حد معمولی لڑکی تھی اور دانیال زیادہ عرصہ اس معمولی لڑکی کی محبت میں گرفتار نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس صورت میں جب وہ بار بار دانیال کے سامنے جانے کی تو بالا خرہ وہ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے مستقل یہیں ڈیرہ جمایا تھا۔ پھر سہرا اس کا ساتھ دے رہی تھی، اس لئے وہ دھڑلے سے گھر کے ہر گوشے میں دندنا پی پھرتی تھی۔ اس وقت جب وہ سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں رات ایک ڈیڑھ کے درمیان تھیں، جب سہرا غالباً پانی پینے کے لئے کمرے سے نکلی تھی کہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی لگی۔

”حتا! تم ابھی بیٹھی ہو؟ سوؤ گی نہیں؟“

”سو جاؤ گی گی آپا!۔! نیند آئے گی تو سو جاؤ گی گی۔“

حتائی وی سے نظریں ہٹائے بغیر یوں ہی تھی۔

”بستر پر لیٹو گی تو نیند بھی آ جائے گی۔ ڈیڑھ بج رہا ہے۔ صبح یونیورسٹی نہیں جاؤ گی کیا؟“

”سوچ رہی ہوں جب تک یہاں ہوں، یونیورسٹی گول کر جاؤں۔“

حتانے کہتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا تو سہرا اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”پڑھائی کا حرج نہیں ہوگا۔؟“

حتانے لا پرواہی سے کندھے اچکا تے تھے۔

”اچھا سنو۔!۔“

سہرا حقا ہو کر پوچھ گئی۔

”جتنیں کیا لگتا ہے، دانیال کو اس حرافہ کے چنگل سے نکال لو گی۔؟“

”ہے تو مشکل آپا!۔! لیکن نامکن نہیں ہے۔“

اس نے کہا تو سہرا فوراً بولی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ نامکن نہیں ہے، البتہ وقت لگے گا۔“

”اب خواہ کتنا بھی وقت لگے آپا!۔! سال! دو سال!؟ دس سال!؟“

حتا آخر میں مسکرائی تھی۔

”دس سال!؟“

سہرا نے آنکھیں پھیلا کر ”دس سال“ کو کہا پھینچا تھا۔

”ہاں آپا!۔! میری زندگی کا اب ایک ہی مقصد ہے۔ دانیال کو حاصل کرنا۔ دس سال کیا۔؟ دس

ہزار یاں بھی گزر جائیں، تب بھی میں اپنے مقصد سے نہیں ہٹوں گی۔“

حتا کے اطمینان سے کہنے پر سہرا پریشان ہو گئی۔

”چلو اب سو جاؤ!۔! اور صبح جلدی آنکھیں کھلی گی۔“

”آپ پریشان ہو گئیں؟“

حتانے ہنستے ہوئے سہرا کو دیکھا تو وہ آنکھ کھلی گئی۔

”دس صدیاں!؟ بانی گاؤ!۔!۔“

حتانے اپنے آپ بڑبڑاتے ہوئے جھرجھری لی، پھر وہ بھی سونے کے لئے اٹھ گئی۔

اور صبح میں اس وقت جب دانیال افس جانے کو نکل رہا تھا، وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی اور بیڑیوں پر تانبہ کو

کھڑے دیکھ لینے کے باوجود دانیال سے بولی تھی۔

”آپ افس جا رہے ہیں۔ پلیز!۔! مجھے اسٹاپ تک ڈراپ کر دیجئے گا۔“

دانیال نے بوکھا کر تانبہ کو دیکھا تو وہ وہیں سے واپس پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”چلیں ناں!۔! میری دین بس ہو جائے گی۔“

حتانے کہا اور دانیال کی ناگوار بی محسوس کرنے کے باوجود اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

☆☆☆☆

کتنی دیر گزر گئی، جہاز زیب پنا نہیں کہاں تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو ان کے پیچھے جانے پر آمادہ کر

سکی۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی اور پھر دے پاؤں ڈرائنگ روم کے دروازے تک آ کر رک گئی۔ اندر

سے پکھا چلنے کی ہلکی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر وہیں رک کر خود کو سنبھالا پھر دروازے کو آہستہ سے

کھلی کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر لیٹے نظر آئے۔

ایک ہاتھ سر کے نیچے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ سوچوں کے بھنور میں ڈوبی

ا تھیں کسی نا بدیدہ نقطے پر جمی تھیں۔ اسے سچ سچ ان نادر دم آیا، کیونکہ وہ ان کی کیفیت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اس

وقت انہیں چھیڑنا مناسب نہیں تھا لیکن وہ باز نہیں رہ سکی۔

”آپ یہاں کیوں آ گئے؟“

وہ سامنے آ کر بولی تو انہوں نے ایک ٹیکہ کو اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔

”جہاز زیب!۔!۔“

اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ بول پڑے۔

”جاؤ، جاؤ، جاؤ سو جاؤ۔!۔“

”سو جاؤں؟“

اس نے ذریعہ زہر لایا۔

”پلیز، جاؤ۔“

ان کے لہجے میں عاجزی اور جھکم ایک ساتھ تھا۔ وہ ہاؤس ہوکر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

☆.....☆.....☆

خواجہ صاحب کتنی دیر سے نوٹ کر رہے تھے کہ بیگم تم بیٹھی ہیں۔ ایک دو بار انہوں نے کھانسی کر متوجہ کرنا چاہا، لیکن ان کی نحوست نہیں ٹوٹی۔ جانے کیا سوچ رہی تھیں؟ آخر خواجہ صاحب کو کون کاڑھا۔

”ہاں بھئی بیگم! کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ؟“

اماں بری طرح چوکی تھیں۔

”جو بھی مسئلہ ہے، اس کی تمام سے حل نہیں ہوگا۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو اماں سانس کھینچ کر بولیں۔

”جانتی ہوں میاں! جانتی ہوں۔“

”پھر بتاؤ! کیا بات ہے؟“

خواجہ صاحب سیدھے ہونٹھے۔

”وہ میں درزن کے پاس گئی تھی۔ رابعہ کے کپڑے سٹلے دیتے تھے ناں! ادبی لینے لگی تھی، تو اس

نے رابعہ کے لئے ایک رشتہ بتایا ہے۔ سوچ رہی ہوں میاں! اگر دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟“

اماں نے اپنی سوچ کا سر خواجہ صاحب کے ہاتھ تھما دیا کہ پھر وہ کتنی دیر بعد بولے تھے۔

”حرج تو کوئی نہیں ہے، لیکن پہلے رابعہ سے تو پوچھ لو۔“

”پوچھ لوں گی رابعہ سے بھی، اور وہ بھی آخر کب تک منع کرے گی؟ سال؟ دو سال؟“

”ہاں! تو ابھی تو سال بھی نہیں ہوا۔“

خواجہ صاحب فوراً بولے تھے۔

”آپ بھی حد کر تے ہیں میاں! یعنی جو کام ابھی ہو رہا ہے، اسے دو سال بعد ٹال دینا کہاں کی

عقل مندی ہے؟“

اماں قدرے زنج ہوئی تھیں۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔؟“

خواجہ صاحب تائید میں سر ہلانے لگی۔

”بس! تو پھر اللہ کا نام لے کر آپ پہلے لڑکے کے بارے میں جو چھان بین کرنی ہو، کر لیں۔ پھر

ات آگے بڑھائیں گے۔“

”ارے بھئی! مجھے کیا ہٹا لڑکا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے۔؟“

”بتاتی ہوں میاں! درزن نے فون نمبر اور پتہ لکھ کر دیا ہے، لاتی ہوں۔“

اماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے رک کر بولی تھیں۔

”اور ہاں! جسے آپ لڑکا کہہ رہے ہیں، وہ وہ بچوں کا باپ اور بڑا ہے۔“

خواجہ صاحب انہیں دیکھتے رہ گئے۔ کچھ کہنے کا حوصلہ یوں نہیں ہوا کہ اپنی بیٹی بھی تو ایک بچے کی ماں اور

ملا تھی۔ پھر وہ بات کہ جو بات مقدر میں لکھی ہوئی ہے، وہ ہو کر رہتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اماں سے فون نمبر اور

الہامیں لے کر اسی وقت پہلے فون کیا اور ملاقات طے کر کے گھر سے نکل آئے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد خواجہ صاحب ایک عالی شان بیٹنگ کے سامنے شش و پنج میں کھڑے تھے۔

”بیٹی کو بڑے گھر میں بیاہنا آرزو تھی، لیکن اس کے بعد اگر وہ اس صاحب سے اس کی آؤ بھگت کر لیں

گے۔“

یہ سوچ ان کے قدم روک رہی تھی، تو واپس پلٹنے کو ہی دل آمادہ نہیں تھا۔ آخر بہت کر کے انہوں نے

ہالیدار کے ذریعہ اپنے اندر پیغام بھجوادیا تو فوراً ہی ایک ملازم آ کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور بیچ و عرض ڈرائنگ

روم میں چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ وہ ششدر کھڑے تھے، جب لگ بھگ پینتالیس سالہ شاندار

ہٹائی کے مالک شیر ازامہ نے کمرے میں داخل ہوکر ”سلام“ کیا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”علیکم السلام۔“

خواجہ صاحب چونک کر اسے دیکھے گئے۔

”مجھے شیر ازامہ کہتے ہیں۔“

شیر ازامہ آگے آ کر خواجہ صاحب سے مصافحہ کر کے بولے۔

”پلیز! اشرف رکھیں۔“

”شکر ہے!“

خواجہ صاحب بیٹھے گئے، لیکن وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھے۔ شیر ازامہ نے چند لمبے انتظار کیا، پھر خود

وہ کہنے لگے۔

”دیکھیں خواجہ صاحب! میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ یہ نہیں کہ میں ابھی کچھ کہوں اور بعد

میں اپنی بات سے ٹکرا جاؤں۔

”جی جی ہاں.....! بہتر یہی ہے کہ ہم صاف بات کریں۔“

خوبصاحب نے ان کی تائید کی ورنہ وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا صاف بات کرتا چاہ رہے ہیں.....؟

”جی.....! تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی کے دو بیٹے۔“

شیراز نے اسی قدر کہا تھا کہ خوبصاحب بول پڑے۔

”جی نہیں.....! میری بیٹی کا ایک بیٹا ہے، دو سال کا ہوئے والا ہے۔“

”اور میرے دو بیٹے ہیں۔ بیٹا دو سال کا اور بیٹی ایک سال کی، اور میرے پاس آپ کے نواسے کے لئے بھی بہت جگہ ہے لیکن.....“

شیراز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ غالباً ان کے خیال میں خوبصاحب خود ہی سمجھ جائیں گے، لیکن وہ سوالیہ نشان بن کر رہ گئے تھے۔ ملازم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات رکھ کر چلا گیا۔

تب شیراز گویا ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں خوبصاحب.....! کہ آپ کے نواسے کے حق میں یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ آپ کے پاس رہے۔“

”جی.....؟“

خوبصاحب کا ”جی“ نہ سمجھنے والا تھا۔

”جی ہاں.....! یہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں آکر وہ نہ صرف آپ کا نواسہ، بلکہ میرے بیٹے بھی ذیل مائندہ اور شایہ کیلکس کا شکاری ہو جائیں گے۔ کیونکہ فطری طور پر آپ کی بیٹی کا جھکاؤ اپنے بیٹے کی طرف ہوگا اور میرا اپنے بچوں کی طرف۔ یوں میرے بیٹے یہ سمجھ لیں گے کہ آپ کی بیٹی ان کی ماں نہیں ہے، جبکہ میں یہ نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، جو میری لڑکی میری زندگی میں آئے، وہی میرے بچوں کی ماں کہلائے۔ میں اپنے بچوں کو سوتیلے کا تصور ہی نہیں دینا چاہتا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟“

خوبصاحب ایک ٹک آنکھ دیکھے جا رہے تھے اور سب سمجھ بھی رہے تھے۔

”باقی آپ کے نواسے کی تمام ذمہ داری.....! آئی میں.....! اخراجات وغیرہ میں پورے کروں گا، اور آپ کی بیٹی کو اپنے بیٹے سے ملنے کی بھی پوری آزادی ہوگی۔“

شیراز نے اپنی بات ختم کر کے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”چائے پیچھے پائیز.....!“

خوبصاحب کی نظر میں شیراز سے ہٹ کر ٹیبل پر چائیں اور پھر کچھ سوچ کر ہی انہوں نے چائے کا

لپ اٹھایا تھا۔

☆.....☆.....☆

اب خوبصاحب چپ بیٹھے تھے اور اماں کے اندر کھلبلی مچی تھی۔ بار بار ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ آخر مہر جواب دے گیا۔

”آپ بتا بھی دیں میاں.....! کیا بات ہوئی.....؟ لڑکا کیسا ہے.....؟“

”لڑکا تو اچھا ہے بیگم.....! بڑا حالگذا سمجھا ہوا، جیسے اپنا دنیا ال ہے۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔“

خوبصاحب ابھی بھی سوچنے انداز میں بول رہے تھے، غالباً ان کا ذہن بچہ اور سوچ رہا تھا۔

”اچھا.....!“

اماں خوش ہو گئیں۔

”گھر میں اور کون کون ہے.....؟ ماں باپ، بہن بھائی کتنے ہیں.....؟“

”نہیں.....! اور کوئی نہیں ہے۔“

خوبصاحب اب چونک کر پوری طرح بیگم کی طرف متوجہ ہو کر بتانے لگے۔

”ماں باپ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک بڑی بہن ہے، وہی جو درزن کے پاس کپڑے سلوانے آتی ہے، وہ بھی اسے گھرا دالی ہے۔“

”تو اس کے بیٹے کون سناٹا ہے.....؟“

اماں نے پوچھا تو خوبصاحب قدرے جھٹھلا گئے۔

”یہ سب میں نے نہیں پوچھا۔ ایسی باتیں عورتوں میں ہوتی ہیں۔ مجھ سے تو شیراز نے صاف بات

لی۔“

”صاف بات.....؟“

اماں کے ٹوکنے پر خوبصاحب شٹٹا گئے۔ غالباً وہ صاف بات بتانا نہیں چاہتے تھے، بیشکل بات بنا

۔۔۔

”ہاں.....! یہی کہ وہ رابعہ کے بیٹے کی ساری ذمہ داریاں اٹھائے گا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میاں.....!“

اماں کے اطمینان پر خوبصاحب جڑ بڑ ہو کر بولے۔

”ہاں.....! لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میرا مطلب ہے، شوبی اگر ہمارے پاس رہے تو زیادہ اچھا

ہے۔“

خواجہ صاحب زور اندیشی سی کام لیتے ہوئے ساری بات خود پر رکھ کر بتیکم کو سمجھانے لگے۔  
 ”دیکھو ناں بتیکم! وہاں شیراز کے بھی دو بچے ہیں۔ اگر راجہ شوبی کو ساتھ لے گئی تو بتاؤ! ایک ساتھ تین بچوں کو کیسے سنبھالے گی؟ پھر بچوں میں ذرا سی جھگڑا ہوئی نہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو اثرام دینے لگیں گے۔ اس لئے میں نے شیراز سے کبھی کہا دیا ہے کہ شوبی ہمارے پاس رہے گا۔“  
 ”ناہیں؟“ آپ نے خود ہی سب سوچ لیا؟“ پہلے راجہ سے پوچھ لیں، وہ شوبی کو ہمارے پاس چھوڑے گی کہ نہیں؟“

اماں قائل ہو رہی تھیں لیکن خواجہ صاحب کی آخری بات پر اچھل پڑیں۔

”راجہ سے پوچھنا نہیں، اسے سمجھانا ہے۔“

خواجہ صاحب زور دے کر کہنے لگے۔

”اور سمجھانا بھی کیا؟ اس سے کبھی دینا کہ ہم شوبی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

”اللہ کرے راجہ راجہ ہی ہو جائے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔“

اماں کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ثانیہ کچھ نہیں پاری تھی کہ یہ گھر میں کیا کچھڑی پک رہی ہے؟ حنا کیوں یہاں مستقل طور پر رہ جائے ہوئی ہے؟ مزید دیدہ دلیری سے روزانہ صبح پوچھو رہی جانے کے لئے دانیال کے ساتھ لٹکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر دانیال اور حنا کے درمیان پہلے سے کوئی بات تھی تو پھر دانیال نے اس کے ساتھ شادی کیوں کی؟ سیما بڑے آرام سے اپنی بہن کو دو پرانی بنا کر لاسکتی تھی۔ کیونکہ دانیال، سیما کی بات نہیں نالٹا تھا۔

جب پہلے نہیں تو پھر اب کیوں؟

اس وقت وہ بیوی سوچ رہی تھی کہ دانیال بہت غلط میں کرے میں داخل ہوا اور اسے اپنا سوت نکال لئے کہہ کر وائش روم میں گھس گیا۔ وہ بیٹی کبھی امیر غرضی کسی مینگ میں جانا ہوگا، جلدی سے اس کا سوت نکال دیا۔ پھر جب وہ اسی غلط میں بالوں میں بڑبڑا کر رہا تھا تب اس نے یوں یہ پوچھ لیا۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“

”وہ۔“

دانیال نے پہلے بڑبڑا رکھا، پھر اسے دیکھ کر بولا۔

”نونی اور دروڑے لے لینڈ جانے کی خبر کر رہے ہیں۔“

”میں بھی چلوں گی۔“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”تم کہاں جاؤ گی؟ میرا مطلب ہے، تم ایسی حالت میں۔“

دانیال ٹپٹایا تھا۔

”کوئی بری حالت نہیں ہے میری! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ زبردستی مجھے تیار کرنے پر تلے

ہے ہیں۔“

اس نے کہا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

”کیا بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ کو میرا خیال ہے تو آپ بھی مت جائیں۔ کیوں مجھے ایسی حالت

میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔۔۔؟“

اس کے ناراضگی سے کہنے پر وہ عاجزی پر اُتر آیا۔

”کہیں دور نہیں جا رہا ہاں! بس! بچوں کو اس کریم دلا کر آ جاؤں گا، اور ہاں! تم بتاؤ!

لون سی اس کریم کھاؤ گی۔۔۔؟“

”کوئی سی بھی نہیں!“

وہ روٹھ گئی۔

”اوہو۔۔۔! تم تو بچوں کی طرح روٹھ رہی ہو۔؟ اچھا! میں تمہارا فیورٹ فلپور لے آؤں گا۔

اے!“

اسے منانے کے لئے فقط اتنا ہی کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔

”دانیال!“

وہ اس کے پیچھے دروازے تک آ کر ڈک گئی۔ لاؤنج میں دروازے کے ساتھ حنا بھی تیار کھڑی تھی۔ اس

نے حیرت اور ڈر کے دانیال کو ان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا، پھر پلٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ اب اسے ایک پل

بہن نہیں تھا۔ مسلسل ٹپٹ ٹپٹ کر اس کی جگہیں مل گئیں، لیکن اس نے سوچ لیا کہ وہ آج دانیال سے حنا کی بابت

پوچھ کر ہی رہے گی کہ آخر وہ کیا چاہتی ہے؟

لیکن وقت گزرتا گیا، شام سے رات ہو گئی، اور آخر تک کہ وہ سو گئی تھی۔ پتا نہیں دانیال کس وقت آیا

تھا؟ صبح جب وہ اٹھی تب بھی دانیال پہلے سے اُٹھ چکا تھا اور آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے خاموش

ہے آئیے میں اسے دیکھا اور مٹ ہاتھ دھوئے کی غرض سے اُٹھ کر وائش روم کا رخ کیا۔ پھر جب لٹکی تو اس وقت حنا

ہاتھ کی ٹرے لئے آ گئی، اور اس سے پہلے کہ وہ اسے آئندہ ایسی زحمت نہ کرنے کا کہی، حنا نے رکھ کر چلی گئی، لیکن

اس کے اندر غبار بھرا تھا، دانیال کو سنا کر بولی تھی۔



”ذرا تیز نہیں ہے، اتنا بھی نہیں پتا کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دی جاتی ہے۔“  
”نہیں؟“

وانیال اس کی طرف گھوم کر پوچھنے لگا۔

”یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو؟“

”وہی جو ابھی منہ اٹھائے چلی آئی تھی۔“

اس کے تحفے کے باوجود وانیال آرام سے بولا تھا۔

”کمال ہے..... ایک تو وہ تمہارا خیال کر رہی ہے۔“

”میرا نہیں! آپ کا۔“

وہ سلگ کر فوراً بولی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

وانیال بجائے سمجھنے کے، گہرا گیا، تو وہ صبح صبح فساد نہیں ڈالنا چاہتی تھی، جب ہی خود پر مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے نہیں پتا.....! بس آپ بھابی سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بہن کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ میں اپنا کام خود کروں گی۔“

”تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے، سمجھیں.....؟ اور تمہیں تو احسان مند ہونا چاہئے تھا کہ جو ہر دھک تکلیف میں بھاگی آتی ہے۔ ورنہ کون کرتا ہے کسی کے لئے اتنا؟“

”میں تو میں کہہ رہی ہوں..... مجھے کسی کا احسان نہیں چاہئے۔“

”دماغ خراب ہے تمہارا.....! ناشکری ہو تم.....! انا چور کو تو ال کوڈاٹنے کے مصداق۔“

وانیال اسے سنا کر چلا گیا۔ وہ کتنی دیر سنانے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ پھر وہ اسی منہ سے میسا سے بات کرنے جا رہی تھی کہ فون کی بیل پر بادل نواست پلٹ کر فون اٹھا لیا تھا۔

”ہیلو.....!“

”راجہ بات کر رہی ہوں۔“

ادھر سے راجہ نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

”ہاں راجہ.....! کیسی ہو؟“

”تمہارا یہ خبری پر ماتم کر رہی ہوں۔“

راجہ نے کہا تو وہ سمجھی نہیں۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی میں نے وانیال کے ساتھ گاڑی میں حنا کو جاتے ہوئے دیکھا ہے، اور یقیناً تمہیں لبر ہی نہیں ہوگی؟“

راجہ کی بات پر وہ چکر اگائی، لیکن پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔

”ارے نہیں راجہ.....! مجھے خبر کیوں نہیں ہوگی؟ میرے سامنے ہی تو نکلے ہیں دونوں۔ اصل میں

مناکلی نہیں رہ گئی تھی، اور ابھی اسے یونیورسٹی جانا تھا تو وانیال اسے چھوڑ دیں گے۔“

”وانیال کیوں؟ وہ کمال حسن کے ساتھ چلی جاتی؟“

راجہ نے کہا پھر اسے سمجھانے لگی۔

”دیکھو.....! مرد پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔“

”اچھا بابا.....! نہیں کروں گی۔ یہ بتاؤ.....! تم ابھی کہاں ہو.....؟“

اس نے بات بدلی۔

”آفس.....! میں نے آفس آتے ہوئے ہی ان دونوں کو دیکھا تھا۔ اور سنو.....! تم ابھی اماں کے پاس

ہاگن ہو.....؟“

راجہ نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”ابھی؟“

وہ سوچنے لگی۔

”ہاں یا.....! اچلی جاؤ.....! اور سمجھاؤ انہیں، دووں سے میرا دماغ چاٹ رہی ہیں۔“

راجہ نے کہا تو وہ بالکل بھی نہیں سمجھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟.....! اماں کیوں تمہارا دماغ چاٹ رہی ہیں؟“

”تمہیں نہیں بتایا انہوں نے؟.....! بتایا ہوگا؟“

راجہ نے یقین سے کہا۔

”نہیں بھئی.....! مجھے کچھ نہیں بتایا۔ ہو کیا ہے؟“

اس نے اُلجھ کر پوچھا۔

”کوئی رشتہ لگ گیا ہے انہیں، اور اب اٹھتے بیٹھتے مجھے دوسری شادی پر زور دیتی ہیں۔“

راجہ نے جس قدر سلگ کر کہا، وہ اسی قدر خوش ہو گئی۔

”ہائے.....! جی، تو بہت اچھی بات ہے راجہ.....! تم منع کیوں کر رہی ہو.....؟“

”کیونکہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“

راجہ نے کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا، اور وہ ہنسنے لگی۔ کچھ دیر پہلے کی ساری باتیں اس کے ذہن سے

”جی.....!“

وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کہاں بات چلا گئیں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ جہاں آپ مناسب سمجھیں۔“

”نہیں ڈہن! ایوں دامن نہ بچاؤ۔ تم بھی اسی گھر میں رہتی ہو اور جہاں تمہارا ایک ہی دیور ہے۔

بڑی بھابھ ہونے کے ہاٹے کیا تمہارا فرض نہیں بننا؟“

”وہ تو ٹھیک ہے ماں! لیکن.....“

وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔

”میں نے بھی کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا، البتہ اب آپ کہہ رہی ہیں تو ضرور دیکھوں گی۔“

پھر اچانک خیال آیا تو کہنے لگی۔

”اماں! لڑکیاں تو گھر ہی میں موجود ہیں۔ آپ کی بہن کے ہاں اور بھائی کے گھر بھی۔ میں سمجھتی

ہوں کہ جب اپنا میں میں رہتے موجود ہیں تو پھر فیروں میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو، اور مجھے بھی خیال آیا تھا، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”سوچتی ہوں، جب میری بیٹیوں کے لئے وہ نہیں آئے تو میں کیوں ان کی لڑکیوں کا خیال کروں؟“

حالانکہ جب میری بیٹیاں بیاہیں، اس وقت میرا بھائی اور بہن دونوں ہی اپنے اپنے لڑکوں کے لئے لڑکیاں ڈھونڈ

رہے تھے تو کیا میری لڑکیاں جب دائر میں جو انہوں نے نظر انداز کیں؟“

”چھوڑیں اماں! اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ آج آپ کی لڑکیاں ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں

میں خوش ہیں۔ ہو سکتا ہے خالہ، ماموں کے ہاں بیاہی ہو تیں تو اب تو انکی خوشیاں نہ تھیں۔“

اس نے رساں سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ محض اس بات کو کہہ نہیں آئے تو ہم کیوں جائیں، انا کا مسئلہ مت بتائیں۔ اگر ان لڑکیوں میں

سے آپ کو کوئی پسند ہے تو اللہ کا نام لے کر رشتہ لے جائیں۔ ویسے جہاں گیا کہتا ہے؟“

”وہ کیا کہے گا؟“

اماں کے لہجہ میں مان کے ساتھ تھوڑا سا نفرت آٹا یا جو یقیناً ان کا حق تھا۔ اولاد نیک اور سعادت مند ہو

تو والدین فخر کیا ہی کرتے ہیں۔

”اللہ کا شکر ہے ڈہن! میری کسی اولاد نے بھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ بیٹیاں بھی

نگل گئی تھیں اور اب وہ راجہ کے لئے آنے والے رشتے کی تفصیل جاننے کے لئے اماں کو فون کر رہی تھی۔

☆—☆—☆

پھر اگلا دن اور اس کے بعد کتنے بہت سارے دن یوں گزرے کہ جہاں زیب اس کے وجود، اس کی ذات سے نیکرے خبر رہے گو کہ وہ اسی گھر میں موجود تھی، لیکن انہیں جیسے نظر نہیں آتی تھی۔ وہ بات کرتی تو بہرے بن جاتے، جواب طلب کرتی تو گونگے۔

یہ صورت حال اس کے لئے خاصی تکلیف دہ تھی۔ ان کے کسی انداز سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے لئے کس انداز سے سوچ رہے ہیں؟ اس کے ساتھ کمرے میں تنہا ہوتے تو جب تک خود کوئی کام کر رہے ہوتے، اپنی ساری توجہ اسی کام کی طرف مبذول رکھتے اور کام ختم ہوتے ہی یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ لائٹ آف کر کے لیٹ جاتے اور وہ جہاں کھڑی ہوتی، جہاں بیٹھی ہوتی، کتنی دیر تک وہیں کی وہیں رہ جاتی۔

کئی بار اس کا دل چاہتا، وہ انہیں سمجھوڑ کر اٹھا دے اور کہے کہ اسے آس و فراس کی اس کیفیت سے آزاد کر دیں۔ لیکن ان کا گوشتے بہرے والا رویہ اسے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور اب تو اس کی قوت برداشت بالکل جواب دے رہی تھی۔ کیونکہ گھر کے کسی کونے میں رکھا فلو سا مان بھی کبھی کبھار نظر میں آ جاتا ہے اور اس کی اہمیت اتنی بھی نہیں رہی تھی۔

اس روز جب وہ آفس کے لئے نکل رہے تھے وہ بہت بہت کر کے ان کے سامنے آ گئی۔

”میں اسی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں!۔“

وہ ساٹ لہجے میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

”آ خر کیوں؟“

ان کے پیچھے تقریباً چھ گھنٹے اس نے پوچھا، لیکن جواب نہ دار، بلکہ جیسے معلوم ہی نہیں ہو کہ وہ پیچھے آ رہی ہے۔ برآمدے کی حد پر وہ رُک گئی اور انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی تب بڑمردہ قدموں سے واپس اندر کی طرف جاری تھی کہ اماں اپنے کمرے سے نکلیں اور اس پر نظر پڑی تو کہنے لگیں۔

”آؤ ڈہن! یہاں بیٹھو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”جی.....!“

وہ ان کے ساتھ تخت پر آ بیٹھی تو اماں کہنے لگیں۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جہاں گیارہ ماشاء اللہ لکھانے والا ہو گیا ہے اب اس کی شادی کا سوچیں۔“

ہماری رضا میں راضی رہیں اور جہانزیب کی طرح اب جہانگیر کا کہنا بھی یہی ہے کہ جہاں آپ مناسب سمجھیں کریں۔

”یقیناً آپ خوش قسمت ہیں، ورنہ آج کل لڑکے تو لڑکے ہلاک یا بھی۔“

اس وقت فون کی بیل بجی، جس سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

”جاؤ دیکھو، کس کا فون ہے۔؟“

اماں نے کہا تو وہ اٹھ کر لابی میں آ گئی۔

”ہیلو۔۔۔!“

”کیسی ہو جانیہ۔۔۔؟“

دوسری طرف زوہیب کی آواز سن کر وہ پوری جان سے تپ گئی اور محض اس خیال سے کہ کہیں اس کی آواز اماں نے نہ سن لیں، خاموشی اختیار کر گئی۔

”سنو۔۔۔! بہت دنوں سے جہانزیب میری طرف نہیں آیا۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ یا تم نے اسے روکا ہے۔؟“

”میں نے روکا نہیں، بس تمہارا اصلی چہرہ دکھایا ہے۔“

وہ بمشکل آواز اور لہجے کو نارمل رکھ کر جبکہ دوسری طرف اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

”کیا۔۔۔؟ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟ کیا بتایا ہے تم نے اسے۔؟“

”وہی باتیں جو تم اسے بتانے کی مجھے دھمکیاں دیا کرتے تھے۔“

اس نے وہی انداز اپنایا جو کچھ عرصہ پہلے زوہیب کا تھا کہ خود مطمئن رہ کر اسے زلزلوں کی زد میں دھکیل دیتا تھا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”میں ایسا کر چکی ہوں۔“

اس نے اپنا اطمینان برقرار رکھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب اسے جن مشکلات کا سامنا ہے، اس کی خبر زوہیب کو ہو۔ بڑے آرام سے بولی۔

”میں نے پوری ایمانداری سے سچ سچ جہانزیب کو بتا دیا ہے کہ تم نے کس طرح مجھے فریب دیا۔؟ یہ جانتے ہوئے کہ میں ان کی نگہباز ہوں، یہ بھی کہ تم نے نہ صرف جہانزیب بن کر مجھ کو دیا بلکہ اب اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے دھمکیاں بھی دیتے ہو۔“

”میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم نے جہانزیب سے یہ سب کہا ہو۔“

وہ مکرور لہجے میں بولا۔

”اور میں تمہیں یقین دلائے گی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

وہ ریسور کھٹا جاتی تھی، اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً بولا۔

”سنو۔۔۔! فون بند مت کرنا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”مجھے بتاؤ تم نے ایسی بے وقوفی کیوں کی۔؟“

”تمہاری چالاکی سے بچنے کی خاطر۔۔۔!“

وہ فوراً بولی۔

”اس سے پہلے کہ تم اپنی طرف سے کوئی داستان سنا کر سارا الزام میرے سر رکھتے، میں نے بھی مناسب سمجھا کہ خود ساری حقیقت بتا دوں۔“

”اور اب ذرا اس بات کا راجل بھی بتا دو، جو جہانزیب کی طرف سے ظاہر ہوا ہوگا۔“

”کس قدر کہینہ ہے۔“

اس نے سوچا اور یہ بھی کہ اسے بے شمار کاغذوں سے نوازے، لیکن وہی بات کہ وہ کیوں اسے خبر ہونے دے کہ اگر اس کا سبکی مقصد تھا تو اس کی کامیابی پر وہ مکمل اٹھے گا، اور وہ خود مشکل میں گھر کر اب کم از کم اسے تماشائی نہیں بنا سکتی تھی، جیسی خود پر تھا بویا کر بولی۔

”جہانزیب کو افسوس اس بات کا ہے کہ جسے وہ دوست سمجھتے تھے، وہ آستین کا سانپ نکلا۔“

”اور تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔؟“

”یہ جانتا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے، اور سنو۔۔۔! آئندہ اس نمبر پر رنگ مت کرنا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا اور وہ بارہ برآمدے میں آئی تو اماں وہاں موجود نہیں تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اماں کچن میں ہوں گی۔ وہ بھی ان کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

”آپ بیٹے اماں! کھانا میں پکاؤں گی۔“

”ارے۔۔۔! تمہاری طبیعت۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، اور زیادہ بیکار بیٹھنے سے ہی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ کام میں لگوں گی تو اپنی طرف سے دھیان نہیگا۔“

”یہ تو ہے۔۔۔! لیکن کوئی بھاری کام مت کرنا۔“

”میں! کوئی بھاری کام نہیں ہے۔ بس۔۔۔! آپ مجھے کھانا پکانے دیں۔“

”اچھا۔۔۔!“

انہوں نے تھپتھاڑا لٹے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے

وہ اماں سے رابعہ کے رشتے کی تفصیل سن کر خوش ہو گئی اور جو رابعہ نے اس سے اماں کو باز رکھنے کو کہا تھا، تو اس کے برعکس اس نے جلدی کرنے کو کہا تو پھر سارا دن وہ اسی سچ پر سوچتی رہی تھی۔ شام میں روزانہ کی طرح سیرا اس کے لئے جوں نے کرائی تو اس نے خوشی خوشی لپی لیا۔ ورنہ ادھر کچھ دنوں سے اس کا جوش پینے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو طبیعت کچھ ایسی تھی، مزہ یہ تھا کہ بے باکیوں نے پریشان کیا ہوا تھا۔

بہر حال اس وقت وہ ساری باتیں بھلا کر رابعہ کے بارے میں سوچ کر خوش تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ دانیال آئے گا تو اسے بھی بتائے گی اور پھر اسی وقت دانیال کے ساتھ اماں کے گھر جا کر وہ بھی رابعہ کو سمجھائے گی۔

لیکن جانے کیا ہوا.....؟ اچانک اس پر نیند سوار ہو گئی۔ حالانکہ یہ سونے کا وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ اس نے سوچا، اٹھ کر وضو کرے، لیکن اتنی زور کا پتھر آیا کہ کیسے پر سر رکھتے ہی وہ سو گئی۔ ایسی بے خبری کی نیند کہ پتا ہی نہیں چلا۔ دانیال کب آیا.....؟ کب گیا.....؟

پھر جب اس کی آنکھ کھلی، کمرے میں مکمل اندھرا تھا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رات ہے یا کوئی اور وقت.....؟ اس نے دانیال کے کیسے پر ہاتھ مارا، وہ موجود نہیں تھا۔ تب اس نے اٹھ کر لائٹ چلائی۔ سراسیمہ بھی بھاری ہو رہا تھا۔ ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر بیٹنگ تک آتے ہی ٹھک کر ٹک گئی۔ نیچے لاؤنج میں دانیال اور حنائی کی وی کے سامنے ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور ریموٹ کنٹرول پر دونوں میں پھینا پھینتی ہوئی تھی۔ ایک پل میں اس کے دل پر قیامت کر گزرتی تھی۔ بمشکل خود کو ٹھیک ہوتی وہ واپس کمرے میں آئی اور جان بوجھ کر دروازہ اتنی زور سے بند کیا تا کہ دانیال آواز سن سکے، اور واقعی وہ آواز سن کر بھاگا آیا تھا۔

”میں آیا تھا، تم سو رہی تھیں۔“

دانیال نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”اور آپ نے سمجھ لیا کہ میں اب ہمیشہ سو رہی ہوں گی.....؟ کبھی نہیں اٹھوں گی.....؟“

اس کے لہجے میں ہلاکی جبین تھی۔

”بے کار باتیں مت کرو۔!“

وہ قصداً جھنجھلا رہا تھا۔

”میری باتیں بے کار ہیں.....؟ اور جو آپ کرتے پھرتے ہیں، وہ کیا ہے.....؟“

وہ ایک دم تیز ہو گئی۔

”کیا کرتا پھرتا ہوں میں.....؟ جتنا وقت گھر میں ہوتا ہوں، تمہارے ہی ساتھ گزارتا ہوں۔ ابھی تم سو رہی تھی تو میں وہاں بی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔“

وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا، جس پر وہ مزید سلگ گئی۔

”بی وی دیکھ رہے تھے حنا کے ساتھ.....؟“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو.....؟“

”وہی جو آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔“

وہ تیزی سے بولنے ہوئے ایک دم ڈگمگائی۔

”دانیال.....! اگر آپ کو حنا پر سنا تھی تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی.....؟ حنا سے ہی کر لیتے۔“

”پاکل ہو گئی ہو.....؟ ذرا سی بات کا پتھر بٹکانا تم عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔“

وہ گڑگڑایا۔

”ذرا سی بات.....؟“

وہ ڈھکے سے بولی۔

”یہ ذرا سی بات ہے دانیال.....؟ سارا دن آپ حنا کے ساتھ تھے۔ جھٹلائے گامت.....! مجھے سب پتا ہے۔“

”پتا ہے تو میں کیا کروں.....؟“

وہ اب ڈھٹائی پر اتر آیا۔

”میں تمہاری طرح احسان فراموش نہیں ہوں۔ حنا اگر تمہارا اور بھائی کا خیال کر رہی ہے تو ہمیں بھی اس کا خیال کرنا چاہئے۔“

”کچھ زیادہ ہی خیال کر رہے ہیں آپ.....! اور مجھے یہ پسند نہیں ہے۔“

”پسند نہیں ہے تو جان بٹھو اپنے باپ کے گھر.....!“

وہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا تھا۔

”دانیال.....!“

وہ سناٹے میں آگئی تھی۔

اماں گھوم پھر کر پھر اسی موضوع پر آگئی تھیں۔

”قسمت سے اچھا رشتہ ل رہا ہے رابعہ.....! خدمت کرو بیٹا.....! اگر شہزادی بہن نے ہماری طرف

سے مایوس ہو کر کوئی اور لڑکی دیکھ لی تو میں جی کہتی ہوں کہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔

”اماں!“

رابر نے عاجز ہو کر اسی قدر کہا تھا کہ اماں نے اس کی ٹھوڑی پکڑی۔

”اماں جاؤ بیٹی.....! اسی میں میری اور تمہارے ابا کی خوشی ہے۔ ہماری زندگی میں اپنے گھریاں کی ہو جاؤ گی تو چین سے مر بھی سکیں گے۔“

”مریں آپ کے ڈشٹن.....! شوٹی کو کون دیکھے گا؟“

رابر دو ٹٹے انداز میں بول رہی تھی۔

”ارے.....! شوٹی کے لئے تو ہم جی رہے ہیں، اور تم سن لو.....! شوٹی ہمارے ہی پاس رہے گا۔

تمہارے ابا کی جان ہے اس میں۔“

اماں یوں بولیں جیسے وہ ہابی بھر چکی ہوں۔ ان کا چہرہ بھی پتک رہا تھا۔ وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”پھر میں تمہارے ابا سے کیا کہوں؟“

اماں نے قدرے زک کر پوچھا تو وہ جیسے ہار کر بولی تھی۔

”مجھے نہیں پتا اماں.....! جو آپ کا دل چاہے۔“

”خوش رہو.....!“

اماں کل اٹھیں، اور اسی وقت اٹھ کر اپنے کمرے میں آئے ہی خوبصورت صاحب سے بولی تھیں۔

”مبارک ہو میاں.....! رابر نے رضا مندی دے دی ہے۔“

”اچھا.....! کیا کہا ہے اس نے؟“

خوبصورت صاحب نے اطمینان سے ہو کر پوچھا۔

”کیا کہے گی؟ یہی کہا ہے کہ جو آپ کا دل چاہے، اور میاں.....! میرا دل کہہ رہا ہے، یہی ٹھیک ہے۔“

”ہاں.....! اللہ چاہے گا تو رابر کے حق میں.....! خیر ہوگا۔ پھر میں شیراز سے کہہ دوں؟“

خوبصورت صاحب نے پوچھا۔

”کہہ دیں، لیکن میاں.....! ہمارے پاس تیاری تو ہے نہیں؟“

اماں قدرے غر مند ہوئیں۔

”تیاری کیا کرتی ہے؟ سادگی سے نکاح کر کے زحمت کرتا ہے رابر کو۔“

خوبصورت صاحب نے اتنے آرام سے کہا کہ اماں چل گئیں۔

”کس..... کیا مطلب؟“ ایسے خالی ہاتھ تو نہیں زحمت کر دیں گے.....؟ میاں.....! کچھ تو دنیا دہ ہو گا ہی۔“

”ہاں تو جتنی محنت ہوگی، دے دیں گے۔ ویسے شیراز بھی منع کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کہتے تو سب ہی ہیں۔ پھر بعد میں طے پارتے ہیں۔“

اماں نے کہہ کر روبرو جھکا تو خوبصورت صاحب خاموش ہو رہے۔

”اچھا نہیں.....!“

اماں کو پھر کچھ یاد آیا۔

”آپ کے خیال میں شیراز کب تک نکاح کا کہے گا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ ہو سکتا ہے، اس بھٹکا کہہ دے۔“

خوبصورت صاحب کے اطمینان پر اماں ششدر رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ رات پھر اپنے کمرے میں گیا ہی نہیں، وہیں لاؤنج میں صوفے پر سو گیا تھا۔ صبح سیمانے اسے دیکھا تو پلٹھٹکی، پھر اس کا کندھا ہلا کر بکارا۔

”واٹاں!.....! واٹاں!.....!“

”جج..... جی.....!“

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

”یہ تم یہاں کیوں سو رہے ہو.....؟“

سیمانے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”بس..... بس وہ.....“

وہ اسی قدر کہہ کر اٹھ گیا۔

”کیا بس وہ.....؟ کوئی بات ہوئی؟“ جھجکا ہوا ہے ٹانیہ سے.....؟“

سیمانہ کو جتنی نظروں سے اے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں بھابی.....! آپ کو پتا ہے، میں جھگڑا نہیں ہوں۔ بس وہ ٹانیہ.....“

”ہاں ہاں.....! کیا کیا ٹانیہ سے.....؟“

سیمانہ کی بے تابی اس نے زخمیں ہی نہیں کی۔

”ایسے ہی اہل سیدھی باتیں کر رہی تھی۔“

”اچھا! چلو، میاں بیوی میں چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو جاتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم یہاں آسو۔۔۔ چلو جاؤ کمرے میں۔“

سیمانے قصداً کھٹکی دکھائی تو وہ روٹھے انداز میں بکیہ اٹھا کر اپنے کمرے میں آگیا اور ٹائیہ کو سوتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ رات وہ دیر سے سوئی ہوگی اس لئے اس نے اسے اٹھایا نہیں اور جلدی جلدی آتش کے لئے تیار ہو کر تاشہ کے بغیر ہی نکل آیا تھا اور عجیب بات تھی، اسے ذرا احساس نہیں تھا کہ رات اس نے ٹائیہ کے ساتھ کیا سلوک روارکھا تھا۔ اس کے برعکس وہ اس کی سوچ پر گلوہ رہا تھا۔ گویا خود کو قنبح سمجھتے ہوئے اس نے جلدی جلدی کچھ ضروری فائلیں چیک کیں اور معمول سے بہت پہلے کمرہ کو تاحی سیدھا اپنے کمرے میں جانے کی بجائے حنا کو تلاش کرتے ہوئے کچن میں جھانکا تو وہاں سیماکو صروف دیکھ کر اندر آتے ہوئے بولا۔

”السلام علیکم بھابی!“

”وعلیکم السلام!“

سیمانے چکی تھی۔

”آج اتنی جلدی آگئے۔۔۔ ابھی تو کھانا بھی نہیں پکا۔“

”ہاں بس۔۔۔ اور یہ کھانا آپ کیوں پکارتی ہیں؟ میرا مطلب ہے، حنا کہاں ہے۔“

اس کے حواسوں پر حنا چھائی ہوئی تھی۔

”حنا تو صبح ہی گھر چلی گئی تھی۔“

سیمانے آواز دیکھا ہے ہوئے سانس کی پتیلی میں چیخ چلائے لگی۔

”کھک۔ کیوں؟“

اس کی بے تابی محسوس کرنے کے باوجود سیمانے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی، ہنوز پتیلی میں چیخ چلائے ہوئے کہنے لگی۔

”بھئی! اصاف بات ہے دانیال! برا مت ماننا، تمہاری بیوی کو حنا کا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ۔۔۔ یہ آپ سے کس نے کہا۔؟“

اس نے فوراً پوچھا تو سیمانہ سچے اچکا کر بولی۔

”کسی نے نہیں! میں خود سمجھ سکتی ہوں اور حنا بھی تاوان نہیں ہے۔ کہہ رہی تھی، میں نہیں چاہتی کہ

میری وجہ سے دانیال کا گھر ڈسٹرب ہو۔“

”پاکل ہے وہ جو ایسا سوچ لایا اس نے۔“

وہ کہہ کر ڈانٹیں، تیزی سے پلٹ کر بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں آتے ہی ٹائیہ پر غرایا تھا۔

”خوش ہو گئی ہو تم؟“ مقصد پورا ہو گیا ہے تمہارا۔۔۔؟“

”کیسا مقصد۔۔۔؟“

ٹائیہ بالکل نہیں سمجھی۔

”حنا چلی گئی، یہی چارہ رہی تھی تاں تم۔۔۔؟“

اس نے کہا تب ٹائیہ سگ گئی۔

”اوہ! تو آپ کو حنا کے جانے کا افسوس ہو رہا ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! ہو رہا ہے افسوس، اور زیادہ افسوس تم پر ہے۔ تمہارے جاہلانہ رویے نے بھابی کی نظروں میں میری پوزیشن کتنی کمزور کر دی ہے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ۔۔۔؟“

”دانیال!“

ٹائیہ نے چیخ کر نواکھا۔

”آپ کو بھابی کی فکر ہے کہ وہ کیا سوچتی ہوں گی؟ مجھ پر کیا بیت رہی تھی، اس کا احساس نہیں ہے

آپ کو۔۔۔؟“

”کیا بیت رہی تھی تم پر؟ بتاؤ۔! زیادہ آرام طلبی نے تمہارے دماغ میں خناس بھر دیا ہے۔

الفاظ بھول گئی ہو تم اپنی۔“

”اپنی اوقات نہیں بھولی دانیال! آپ زیادہ ادھما اڑنے لگے ہیں۔“

ٹائیہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے مقابل آگئی تھی۔

”میری پروا نہ ہمیشہ سے ادھم تھی ٹائیہ بیگم! اپنا نہیں کیسے میں اپنی سطح سے نیچے آگیا تھا۔۔۔؟“

وہ اس کے مقابل آنے پر دانت پیس کر بولا تھا۔

”کتنی نیچے۔۔۔؟“

وہ حریف سگ گئی۔

”میں بھی کوئی ایسی گری پڑی نہیں تھی دانیال بیگ! آپ کو پانے کے لئے میں نے اوجھے تھہ

کھلے استعمال نہیں کئے تھے۔“

”بس! بند کرو اپنی بکواس!“

وہ لا جواب ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

محسوس کرنے لگے تھے۔ اماں اس سے کرید کرید کر پوچھتیں کہ کیا ہوا ہے۔؟  
جہانزیب اتنا چپ چاپ اور الگ تھلک سا کیوں رہنے لگا ہے۔؟  
وہ کیا جواب دیتی۔؟

بس کام کی زیادتی کا بہانہ کر دیتی تھی۔

لیکن اماں نادان نہیں تھیں۔ اس روز دونوں کو پاس بٹھا کر پوچھا کہ تم دونوں میں کس بات کی رنجش ہے۔؟ وہ کچھ نہیں بولے۔ اس کی طرف دیکھا کہ نہیں جب اسے کہنا پڑا۔

”کوئی رنجش نہیں ہے اماں! کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو آپ سے چپا رہ سکتا تھا بھلا۔؟“

”جھگڑا تو میں نے نہیں دیکھا۔“

اماں بڑا سوچ انداز میں کہتی ہوئی جہانزیب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”پھر کیا بات ہے جو تم زیادہ وقت گھر سے باہر نہ گئے ہو۔؟“

”میں۔؟“

وہ غائب دماغی سے چونکے۔

”ہاں! میں تم ہی سے پوچھ رہی ہوں۔“

”میں نے اصل میں ایک عربین بینک میں اپلائی کیا تھا، وہاں میری جاب بھی گئی ہے اور اب وہ لوگ

مجھے جدہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ بس اسی سلسلے میں کچھ مصروف ہوں۔“

انہوں نے بڑے آرام سے بتایا جبکہ وہ بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی اور اماں ان کی ساری بات

سن کر بولیں۔

”وہی تو یہ اچھی بات ہے بیٹا! پھر بھی میں کہوں گی کہ جب یہیں اللہ عزت کی روٹی دے رہا ہے تو

پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔؟ کون کون سی باتیں۔۔۔“

”نہیں اماں! میری اپنی خواہش بھی ہے باہر جانے کی۔“

”لیکن بیٹا! ڈوہن کا بھی تو سوچو۔ یہ ایسی حالت میں ہے کہ۔۔۔“

”یہ نہیں رہے گی، آپ کے پاس، یا اپنے سینے۔“

انہوں نے ایک لمبے کے لئے بھی اسے سنبھرا سے نہیں نکالا۔ اگر صرف یہیں کا کہتے تو وہ خوش فہمی میں

جتلا ہو سکتی تھی۔ اس نے بخور انہیں دیکھا شاید انداز کا حال جان سکے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”کس قدر گھر سے ہیں۔“

وہ سوچتی ہوئی وہاں سے اُٹھ آئی۔ اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ اماں نے ان سے کیا کہا۔۔۔

ملکر رہے گی یا اپنے سینے۔؟

☆.....☆.....☆

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ حنا کے مقابلے میں نرم نہیں پڑے گی خواہ وانیال اس کے ساتھ کتنا جھگڑے۔  
وہ سہا اور حنا کی دال نہیں گلنے دے گی۔ اس لئے وانیال کو وہ بد جواب دینے پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ البتہ یہ فکر  
گھر ورتی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔؟

وہ پہرے شام ہو گئی تھی اور اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ سہا سے پوچھ کر اپنی پوزیشن کمزور نہیں کرنا چاہتی  
تھی، اس لئے اپنے کمرے میں ہی آہوں پر کان لگائے بیٹھی تھی کہ فون کی تیل پر ایک دم اچھلی تھی اور دوسری تیل  
سے پہلے ہی اس نے کارڈش اٹھا لیا تھا۔

”ہیلو۔۔۔!“

”ہاں ٹائی۔! کیا حال ہے بیٹا۔۔۔؟“

دوسری طرف اماں تھیں۔

”جی اماں! میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔۔۔!“

اس نے سنبھل کر جواب دیا تو اماں کہنے لگیں۔

”اللہ کا شکر ہے بیٹا۔! میں نے اس وقت تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ پرسوں جمعہ کو راجہ کا

لح ہے۔“

”سچ اماں۔؟“

وہ اپنی ساری فکریں بھول گئی۔

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔ وہیں شراز کے ساتھ سب ملے ہو گیا۔“

”ہاں! اتہارے ابانے اپنا اطمینان کر لیا ہے اور وہ خوش بھی ہیں۔“

اماں نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”اور آپ اماں۔؟ آپ خوش نہیں ہیں کیا۔؟“

”کیوں نہیں بیٹا۔؟ میں خوش ہوں، بس دل دلتا ہے۔“

”خواہ مخواہ وہم دیکر میں اماں! اللہ بہتر کرے گا۔“

اس نے فوراً ٹوک کر کہا۔

”انشاء اللہ! پھر تم وانیال کو بتا دو اور اگر ہو سکے تو آ جاؤ۔ راجہ کے جوڑے وغیرہ رکھنے ہیں۔ مجھے تو

بکھر نہیں آ رہی۔“

اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں ٹائیہ! اس لئے چاہئے کہ باوجود خود کو بہلا نہیں پاری۔ پتا نہیں تم سب نے یہ کیسے سوچ لیا ہے کہ میں نے اپنے حصے کے دکھ جھیل لئے، اب آگے میرے ساتھ اچھا ہی اچھا ہوگا۔ دکھ کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے ٹائیہ! کبھی نہیں!“

رابعہ کا کرب اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”میں تم سے اختلاف نہیں کروں گی رابعہ! لیکن یہ بھی تو ج ہے کہ ہر رات کی صبح ضرور ہوتی ہے۔“

”اور یہ بھی ج ہے کہ نصیب والے ہی ج دیکھتے ہیں۔“

رابعہ نے آنسو اپنے اندر اُتارے ہوئے کہا تو وہ سانس سنبھل کر بولی۔

”ہاں! لیکن آس تو ہر دل میں ہوتی ہے۔ اب ہائیر یہ مت کہہ دینا کہ تمہارے دل میں آس بھی نہیں ہے۔“

اس نے کوشش سے لہجہ میں خوشی سمو کر رابعہ کو گلہ لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حنانے قصداً پوائنٹ بس کر دی تھی۔ اس کے بعد یوں جیسے کنوئس کے انتظار میں کھڑی ہو۔ جبکہ اسی طرف تھا جس سے دانیال کو آتا تھا۔ پھر دُور سے اس کی گاڑی دیکھ کر وہ مزید خود کو انجان ظاہر کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی اس کے قریب گاڑی کے بریک چرچر آئے اور جب دانیال نے پکارا، تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آ جاؤ!“

دانیال نے کہنے کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ بھی کیا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں! میں چلی جاؤں گی۔“

”جتا ہے، جا سکتی ہو۔“

وہ کہتے ہوئے گاڑی سے اُتر آیا اور اس کی طرف سے دروازہ کھول کر بولا۔

”خود بیٹھو گی یا۔“

”بس!“

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بیٹھ گئی تو وہ ہنستا ہوا ڈرائیونگ پر آ گیا، پھر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھنے

”تاراض ہو۔۔۔۔۔؟“

”آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اماں! میں سب کر دوں گی۔ دانیال آ جائیں تو پھر میں ان کے ساتھ آ جاؤں گی جھٹک ہے۔!“

”اللہ حافظ۔۔۔۔۔!“

اس نے دانیال کو آتے دیکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ بے اختیار اس کی طرف بڑھ کر بولی تھی۔

”دانیال! اماں کا فون تھا، جھٹک کو رابعہ کا نکاح ہے۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“

وہ ایک لفظ سوالیہ نشان بنا تھا، پھر فوراً سر جھٹک کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، اچانک۔۔۔۔۔؟“

”ہاں! بس اچانک ہی سب طے ہو گیا۔“

”اچھا! حیرت ہے۔“

دانیال کے انداز میں حیرت سے زیادہ نظر تھا۔

”حیرت کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟ سادگی سے نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

وہ مصلحتاً اس کا طرز نظر انداز کر گئی۔

”ہاں! اوصاف دھڑکا تو پہلی شادی میں ہوتا ہے۔ خیر! اچھی بات ہے۔“

وہ کہتے ہوئے پیٹھ کر شوز اتارنے کا قصہ کہہ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”دانیال! میں ابھی اماں کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ وہ بے چاری اکیلی پریشان ہو رہی ہیں۔ اگر

آپ تھکے ہوئے نہیں ہیں تو۔۔۔۔۔“

”نہیں! کوئی ایسی جھکن نہیں ہے۔ چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔“

وہ فوراً تیار ہو گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی نہ جاتی، لیکن مجبوری تھی۔ اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے اس

نے بیک میں دو تین سوئچر لگے اور اسی وقت اس کے ساتھ اماں کے گھر آ گئی۔

دانیال اسے باہری سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اماں اباسے مل کر کمرے میں آئی تو رابعہ کو گم سم دیکھ کر

جھٹک گئی۔ پھر سست روی سے قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو رابعہ۔۔۔۔۔؟“

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا، پھر پچھلی ہی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”سوچ رہی ہوں، زندگی کے نئے سفر کا تصور جتنا خوب صورت ہوتا ہے، حقیقت اس سے زیادہ

بھیاں بک روپ میں سامنے آتی ہے۔ کوری آنکھوں میں بھٹنے والے خواب کیسے کچی کچی ہو جاتے ہیں۔“

”رابعہ!“



”نہیں! میں کیوں ناراض ہوں گی؟“

”اس کا مطلب ہے ناراض ہو۔“

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم اسے ناراضگی بھجویا کچھ بھی، میں بہر حال نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہارے اور ٹانیہ کے درمیان رنجش پیدا ہو۔“

وہ یہ بات پہلے سے سوچ چکی تھی۔

”تمہاری وجہ سے کچھ نہیں ہوا حنا! اور اگر ہوا بھی تو تمہیں پروا ہی نہیں کرنی چاہئے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

دانیال کی آخری بات نے اسے بے پناہ خوشی بخشی تھی، جسے بمشکل چھپا کر وہ بولی تھی۔

”تم ہمیشہ تو میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔“

”کیوں نہیں دے سکتا؟“

وہ فوراً کہہ کر پوچھنے لگا۔

”تم بتاؤ، کیا تم ہمیشہ کا ساتھ چاہتی ہو.....؟“

”میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔“

اسے خود پر قابو پا پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں۔“

دانیال نے کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو دانیال.....؟ تمہاری بیوی ہے اور.....“

”کچھ بھی ہونے والا ہے۔“

وہ اس کی بات اچانک کر پوچھنے لگا۔

”تمہیں اعتراض میرے بیوی بیٹے پر ہے یا تم مجھے پسند ہی نہیں کرتیں.....؟“

”میں کسی عورت پر ظلم نہیں کر سکتی۔“

وہ بہت چالاکی سے دانیال کو ٹھیک رہی تھی۔

”ٹانیہ پر ظلم نہیں ہوگا حنا! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں.....؟“

”اچھا! ابھی تو تم مجھے نہیں ڈرا پ کر دو، باقی باتیں بھر بھی۔“

وہ بظاہر اس موضوع سے کتر کر بولی لیکن اور جیسے ہی دانیال نے گاڑی روکی، وہ فوراً اتر گئی۔ پھر اس کے جاتے ہی وہ رکشہ روک کر یونیورسٹی جانے کی بجائے واپس اس کے گھر آگئی اور لاؤنج سے ہی چٹا کر بولی تھی۔

”آپا! آپا! آپا! جلدی سے ابھی سی چائے لے آئیں۔“

”ہائیں.....؟“

سیما بچن سے برآمد ہوئی تھی۔

”یہ تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو.....؟“

”بس! یونیورسٹی جانے کا سوڈ نہیں ہوا، آپ کے پاس آگئی۔“

وہ بیگ ایک طرف پھینک کر خود صوفے پر ڈھکی۔

”تمہارے حمرے ہیں۔“

”گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟“

اس نے سیما کی بات ان کی کر کے پوچھا۔

”اس وقت کون ہوتا ہے.....؟ ہاں، ٹانیہ بھی بیٹھے گئی ہوئی ہے۔ آج اس کی بہن کا نکاح ہے ناں۔“

سیما بتاتے ہوئے بیٹھ گئی تو وہ انجان بن کر بولی۔

”اس کا مطلب ہے دانیال بھی وہیں ہوگا.....؟ سالی کو زحمت کر کے آئے گا۔“

”ہاں! ظاہر ہے، تم ابھی رکو کی.....؟ میرا مطلب ہے، شام میں ٹانیہ آجائے گی۔“

سیما نے اس خیال سے کہا کہ ٹانیہ کی موجودگی میں اسے نہیں آنا چاہئے۔

”ٹانیہ ابھی نہیں آتی آیا.....؟“

اس کے اطمینان پر سیما چوکی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا.....؟“

”دانیال کہہ رہا تھا کہ ابھی ٹانیہ کو نہیں لائے گا۔“

اس نے ہونٹوں میں سرکراہٹ دبا کر کہا تو سیما نے سمجھ کر اس کے بازو میں چٹکی کاٹی تھی۔

”اور کیا کہا دانیال نے.....؟“

”وہی جو میں چاہتی ہوں۔ کہہ رہا تھا، وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔“

اس نے ٹھٹھکا کر بتایا تو سیما خوش ہو گئی۔

”سچ کہہ رہی ہو.....؟“

”ہاں! بالکل سچ!“

دانیال عین نکاح کے وقت آیا تھا اور پھر رابعہ کے زحمت ہوتے ہی جانے کی عجلت دکھانے لگا تو ٹانیہ

فوراً اپنا بیگ لے کر آگئی۔

”اچھا ماں! میں چلتی ہوں۔“

”ہائیں! تم بھی جاری ہو۔“

اماں نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس سے پہلے دانیال بول پڑا۔

”میرا خیال ہے ٹائیہ! انہیں ابھی یہیں رہنا چاہئے۔“

”ہاں بیٹا! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔“

”ارے نہیں آئی! میں تو خود کہہ رہا ہوں۔ آپ شوق سے جیتے دن چاہیں ٹائیہ کو اپنے پاس

رکھیں۔“

اس نے کہتے ہوئے اچھتی نظر ٹائیہ پر ڈالی تھی۔

”خوش رہو بیٹا۔“

اماں ممنونیت سے بولیں تو پھر اس نے ٹائیہ کی طرف دیکھا ہی نہیں، جلدی سے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے

نکل آیا تھا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی اس حرکت سے ٹائیہ کیسا سوچے گی، یا شاید اب اسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ جب ہی

ٹائیہ سے جان چھڑا کر گھر آیا تو سہا اسے اکیلے آتے دیکھ کر بمشکل اپنی خوشی چھپا کر پوچھنے لگی۔

”ہائیں! تم ٹائیہ کو ساتھ نہیں لائے۔“

”وہ۔۔۔ بھابی! اس کی اماں نے اسے روک لیا۔ اصل میں رابعہ کا بچہ بہت رورہا تھا۔ ٹائیہ اس کی

وجہ سے بھی آگئی۔“

وہ بڑے آرام سے بری الذمہ ہو گیا۔

”ہاں! رابعہ کے بچے کا تو بڑا مسئلہ ہوگا۔ رابعہ ساتھ کیوں نہیں لے گئی اپنے بچے کو۔۔۔؟“

سہا کو بڑا موضوع مل گیا۔ لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”پتا نہیں بھابی! مجھے ان کے معاملات میں کودنا اچھا نہیں لگتا۔“

”خیر! یہ تو اچھی بات ہے۔ مردوں کو دوسرے کی تو چھوڑو، اپنے گھر کی ٹوہ میں بھی نہیں رہنا

چاہئے۔“

سہا نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بیڑھیاں چڑھا دیا اور اپنے کمرے میں آئی کارڈ لیس اٹھا کر حنا کا نمبر

ڈائل کرنا چاہتا تھا کہ گنگنا ہٹ کی آواز سن کر اس کی نظریں بے اختیار تیسری طرف اٹھیں۔

”حنا۔۔۔؟“

وہ خوش ہو گیا، اور کارڈ لیس رکھ کر بے پاؤں اس کے قریب جا کر سرگوشی میں بولا تھا۔

”تم کب آئیں۔۔۔؟“

”آف۔۔۔!“

حنا کو کراہی کی منتہی تھی، پھر بھی چونک کر دل پر ہاتھ رکھا۔

”تم نے تو ڈرامی دیا۔ دیکھو میرا دل کتنی زور سے دھڑکنے لگا ہے۔“

”واقعی۔۔۔؟“

وہ مرد تھا، اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا تھا کہ حنا شرمناک بھاگ گئی۔ وہ اس کے پیچھے دیکھتا رہ گیا، پھر

بمباری کمرے میں ڈک کر بیچے آقا تو لاؤنگ میں حنا کی آنکھیں پٹی تھیں۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“

اس نے حنا کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریوٹ کنٹرول لے کر پینٹل چھینج کر دیا۔

”کیا کر رہے ہو۔۔۔؟ میں ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔“

حنا نے ریوٹ کنٹرول لینا چاہا، لیکن اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”دانیال! جلیز دو دیاں۔!“

”لے لو۔۔۔!“

اس نے ریوٹ والا ہاتھ اوپر اٹھالیا تو حنا اس کے ہاتھ سے ریوٹ چھیننے کی کوشش میں تقریباً آدھی

اس کے اوپر تھی اور اسی وقت کمال حسن آفس سے لوٹے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر نہ صرف ہنسنے بلکہ ان کی پیشانی پر

نام گارہی کی گلیں بھی ابھر آئی تھیں۔

”بھیا۔۔۔؟“

دلی سرگوشی میں حنا کو آگاہ کرتے ہوئے دانیال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کمال حسن کے نہیں، سیدھے

اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

”اوگا۔۔۔!“

دانیال نے گہری سانس کھینچی تو حنا انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔!“

وہ قہقہہ اچھکاتے ہوئے بازار پر اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ سہا نے کھانے کے لئے بلایا۔

”مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔“

حنا کہتے ہوئے بچوں کے کمرے میں چلی گئی اور بھوک تو اسے بھی نہیں لگی تھی، لیکن کمال حسن کی وجہ سے

وہ اننگبوم میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد کمال حسن چھینج کر کے آئے تو وہ دروازہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ

”شروع کرو دانیال..... کیا لو گے.....؟“

سیمانے بیٹھے ہوئے اس سے کہا تو وہ چونک کر بولا۔

”جی.....!“

”کہاں گم ہو.....؟“

سیمانے ہنس کر ٹوکا۔

”جی..... کہیں نہیں.....!“

وہ شیشا کراچی پلیٹ میں سالن نکالنے لگا تو کمال حسن نے بظاہر سرسری انداز میں اسے مخاطب کر کے پوچھ بیٹھا۔

”دانیال.....! ٹانیہ کہاں ہے.....؟“

”ٹانیہ اپنے سینکے لٹی ہے، میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ اس کی بہن کا نکاح تھا۔“

سیمانے فوراً جیسے اسے مشکل سے نکال لیا تھا۔

”نکاح ہو گیا، پھر اب ٹانیہ وہاں کیا کر رہی ہے.....؟“

کمال حسن کا انداز جارحانہ تھا۔

”ارے.....! آپ تو.....!“

”تم چپ رہو، میں دانیال سے بات کر رہا ہوں۔“

کمال حسن غصے سے سیمانے کو ٹوک کر پھر اس سے کہنے لگے۔

”دانیال.....! میری بیوی نے تمہاری بہت خدشیں کر لیں، اب اپنی گھر بیٹو ذمہ داریاں تم اپنی بیوی پر

ڈالو۔ سمجھ رہے ہو ناں.....!“

”جی.....!“

وہ ان کا مطلب سمجھ کر کچھ خائف ہو گیا تھا۔

”میں گھر میں کوئی بد مزگی نہیں چاہتا۔“

کمال حسن اسے تنبیہ کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے تو سیمانے کو دیکھ کر بولی۔

”انہیں کیا ہوا ہے.....؟“

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”آ خر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے.....؟“

رات میں جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو وہ ان کے سر پر کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

”مجھے پریشان مت کرو۔“

انہوں نے کہا اور سر کے نیچے سے کھینچ کر منہ پر رکھ لیا۔

”میں واقعی آپ کو پریشان نہیں کروں گی اگر آپ مجھے اس اذیت سے نکال لیں، یا تو میرا قصور معاف

کریں، یا پھر.....“

”تم کیا چاہتی ہو، ابھی چلا جاؤں یہاں سے.....؟“

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔ لیجے میں کاٹ تھی جسے محسوس کر کے اس نے سوچا،

شاید اسی طرح طیش میں آ کر ہی وہ اپنا خیال ظاہر کر دیں کہ اس کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا اور کیا کرنے کا

ارادہ رکھتے ہیں.....؟

”اگر آپ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں اور میرا وجود برداشت نہیں کر پار ہے تو مجھے جانے کی اجازت

دیں۔“

انہوں نے ہونٹ ہینچ لئے، جیسے اپنے آپ کو کچھ کہنے سے باز رکھا ہو۔

”اس طرح خاموش مت رہیں۔ جہانزیب.....! پلیز.....“

وہ منت سے بولی۔

”شکر کرو، میں خاموش ہوں، ورنہ طوفان اٹھنے میں کیا دیر لگتی ہے.....؟“

انہوں نے کہا اور نگہ اٹھا کر کمرے سے نکل گئے تب وہ رو پڑی۔ یہ صورت حال اب واقعی اس کے

لئے ناقابل برداشت تھی۔ ہر جہل یہ دھڑکا ”چنانچہ کیا ہو.....؟“

گویا اس کی زندگی کا سارا اختیار مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ وہ واقعی کوئی فیصلہ نہیں کر پا

رہے تھے یا جان بوجھ کر اسے اس اذیت میں جکڑا کر رکھا تھا.....؟

اور اب تک تو وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ ان کے رحم و کرم پر ہے اور وہ مکمل با اختیار۔ لیکن اب اچانک

اس کا ذہن پلٹ گیا۔

”یہ سراسر زیادتی ہے۔“

وہ سوچنے لگی۔

”یہ صحیح ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، وہ بھی انجانے میں۔ لیکن میں اتنی قصور وار ہرگز نہیں کہ مجھے لمحہ لمحہ کمتری

کا احساس بخش کر میری ہستی کا غور و چین لیا جائے۔ پھر میں نے تو آریا پار سوچ کر اعتراف کیا تھا۔ یہ درمیانی

راستہ تو گمان میں بھی نہیں تھا۔ جہانزیب اگر اپنا ظرف بڑا نہیں کر سکتے تو انہیں یہ حق بھی نہیں ہے کہ وہ اب یہ حالات

پیدا کر دیں کہ میں ہمیشہ ایک مجرمانہ احساس میں گھری رہوں۔“

”نہیں! میں نے فیصلے کی ڈوران کے ہاتھ میں اس لئے تھی تھی کہ وہ غیر جانبداری سے سوچیں گے، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے اور اب اپنے بارے میں، میں خود سوچوں گی اور خود فیصلہ کروں گی۔“

اس کے بعد نیند آنے تک وہ سترے سے گزشتہ حالات کو سوچتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رابعہ سر جھکائے لیکن پوری توجہ سے شیراز کی باتیں سن رہی تھی، جو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ ان کی ماہر بہت جلد واپس آ جائیں گی۔ ہا تو خیر بہت چھوٹی تھی، لیکن سنی اپنی ماما کو پوچھتا تھا، اور آج انہوں نے سنی سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کی ماما کو اپنے بارے میں، جس کا مطلب تھا کہ اس موصوم بچے کو اپنی ماں یاد نہیں تھی۔ بہر حال وہ ان کی بات سمجھ گئی تھی۔ پھر شیراز احمد اسے بچوں کے کمرے میں لے آئے اور سنی کو پکار کر بولے۔

”سنی بیٹا! آپ کی ماما آئی ہیں۔“

سنی نے پہلے حیران ہو کر دیکھا، پھر ایک دم خوش ہو کر اپنی اچھل اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بازو پھیلائے تو اس نے بے اختیار بڑھ کر اسے اپنی ماماں میں لے لیا۔

”میں آگئی ہوں بیٹا! اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”اوکے بیٹا! آپ ماما سے باتیں کرو۔“

شیراز احمد اطمینان سے ہو کر کمرے سے نکل گئے تو وہ کچھ چونک کر ان کے پیچھے دیکھنے لگی۔

”آپ اتنے دنوں سے کہاں چلی گئی تھیں ماما؟“

سنی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

”کتنے دنوں سے؟“

”اتنے بہت سارے دنوں سے۔“

”آپ مجھے یاد کرتے تھے؟“

وہ اس کا جواب گول کر گئی۔

”جی! اور ہا تو بہت روتی ہے۔ گندی بچی ہے۔“

سنی کے کہنے پر اسے ہما کا خیال آیا تو وہ اسے چھوڑ کر کات کے پاس آئی۔ سال بھر کی بچی منہ میں فیڈر لئے بغیر سو رہی تھی۔ فیڈر میں دودھ نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کمرے میں کہیں تھرماس اور دودھ وغیرہ نہیں تھا تب وہ سنی سے پوچھنے لگی۔

”ہما کا دودھ کہاں ہے بیٹا؟“

”پتا نہیں!“

سنی کی اگلی پراس نے کچھ دیر سوچا، پھر کہنے لگی۔

”چلو! آپ مجھے کچن میں لے چلو۔ پہلے ہما کا فیڈر دیکھیں گے، پھر آپ کو بھی دودھ پینا ہے۔ اس کے بعد سوئیں گے۔“

”چلیں!“

سنی بیڈ سے اُتر تو وہ رک کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سنی کو شاپی کی طرح دھیرے دھیرے تھپک کر سلا یا اور اس کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے؟

شیراز احمد تو بڑے آرام سے اُسے بچوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا بھی نہیں تھا، کوئی دماغی جملہ یا مسکراہٹ میں چھپا کوئی اشارہ، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی وہ خود سے جا کر ان کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتی تھی۔

زیر پاؤر کی مدہم رہی روشنی میں اس نے وال کال پر نظر ڈالی، سوا بارہ ہو رہے تھے۔ تب وہ سنی کے ساتھ لینا چاہتی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک کر ادھر دیکھنے لگی۔ شیراز احمد مسکراتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”شکر ہے سب کام بخیر و خوبی پٹ گئے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میاں بیوی کو کج کراوے۔ بڑی آرزو ہے مکہ مکہ بندہ کیوں۔“

اس سبزی کا سننے ہوئے رابعہ کی شادی پر شکر کرتے ہوئے بولیں تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر پوچھنے لگی۔

”اماں! انسان کو سارے کاموں کے بعد ہی مکہ بندہ کیوں یاد آتا ہے؟ پہلے کیوں نہیں خیال

آتا۔۔۔؟“

”خیال تو آتا ہے بیٹا! لیکن دنیاوی جھیلے اس خیال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔“

اماں نے ابھر کر کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ساتھ شیطان بھی حاوی ہو جاتا ہے اماں! ابھی تو جھیلوں سے نکلنے میں آدھی سے زیادہ عمر گزر

جاتی ہے۔“

”ہاں!۔۔۔“

اماں نے اُن کو لمبا کھینچا تھا۔ تب ہی رابعہ کی آواز آئی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔!“

”ارے۔۔۔!“

وہ رابعد کو دیکھ کر خوشی کے اظہار کے ساتھ اٹھ کر اس سے پرٹ گئی۔

”کبھی ہو۔۔۔؟“

”اچھی ہوں۔“

رابعد سسکرائی، پھر اس سے الگ ہو کر اماں کے گلے لگ کر پوچھنے لگی۔

”شوئی کہاں ہے اماں؟“ تنگ تو نہیں کیا اس نے آپ کو۔۔۔؟“

”ارے نہیں بیٹا! تنگ کیوں کر رہے گا؟ ماشا اللہ آرام سے ہے۔“

اماں نے کہہ کر رابعد کی پیشانی پر دم لی۔

”اچھا۔۔۔! میں دیکھ لوں اپنے بچے کو۔۔۔؟“

رابعد بے قراری سے کمرے کی طرف بڑھی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی اور اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

رابعد نے سوئے ہوئے شوئی کو اُٹھا دیا اور اسے لگہ لگہ دے ہوئے خود بھی کلکھلا رہی تھی۔

”ماشا اللہ۔۔۔! اللہ نظر بد سے بچائے۔ سچ، میں تو تمہاری ایسی بے بسی کو ترس گئی تھی۔“

اس نے کہا تو رابعد جیسے پ گئی، پھر شوئی کو بٹھا کر پوچھنے لگی۔

”تم ابھی رہو گی؟“

”ہاں نہیں۔۔۔!“

وہ اچانک آزدگی میں گھر گئی۔

”کیا مطلب؟“

رابعد اس کی آزدگی محسوس کر کے ہلکی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔!“

وہ رابعد کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، جب ہی سر جھٹک کر زبردستی سسکرائی تو رابعد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر

اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”جانے۔۔۔! کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ مجھ سے چھپا رہی ہو۔۔۔؟“

”ارے نہیں۔۔۔! تم سے کیوں چھپاؤں گی۔۔۔؟“

”پھر بتاؤ ناں کیا بات ہے۔۔۔؟“

رابعد کے محبت بھرے اصرار پر وہ ڈھمکے گئی تھی۔

”میں بہت پریشان ہوں رابعد۔۔۔! اپنا تیسری جھٹائی کا مقصد کیا ہے؟“ وانیال کو انہوں نے ایسا

نہ لگایا ہوا ہے کہ وہ ان کے خلاف کچھ سنائی نہیں چاہئے۔ جائز بات بھی نہیں، وہ جو کہہ دیتی ہیں، اسی پر ایمان لے آتے ہیں۔“

”کیوں؟“ میرا مطلب ہے، تمہاری جھٹائی تمہارے ساتھ کسی ہیں۔۔۔؟“

رابعد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بظاہر بہت اچھی ہیں، سبکی تو ان کی چالاکی ہے۔ یوں ظاہر کر رہی ہیں جیسے میری سب سے بڑی ہمدرد

اور یہی خواہ رہی ہوں۔ جبکہ اندر ہی اندر جانے کیا کچھڑی پکڑ رہی ہیں۔۔۔؟“

وہ اپنے آپ میں اُلجھتے ہوئے بول رہی تھی۔ رابعد بھی اُٹھ گئی۔

”میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہی، کھل کر بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے۔۔۔؟“

”اصل معاملہ۔۔۔؟“

وہ شش درج میں رابعد کو دیکھنے لگی۔

”بتاؤ جانے۔۔۔!“

رابعد نے اس کا ہاتھ بلایا تو اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہو گئی۔ پھر پہلے اس نے رابعد سے اماں

کو نہ بتانے کا وعدہ لیا، اس کے بعد کہنے لگی۔

”معاملہ یہ ہے کہ جب سے میں پریکٹس ہوئی ہوں، میری جھٹائی نے یہ کہہ کر کہ مجھے آرام کی ضرورت

ہے، مجھے میرے کمرے تک محدود کر دیا ہے اور کام کے بہانے سے اپنی کہن حنا کو بلا لیا ہے جو وقت بے وقت میرے

کمرے میں خصوصاً وانیال کی موجودگی میں کھسی چلی آتی ہے۔“

”تم نے وانیال سے کہا نہیں۔۔۔؟“

رابعد نے بے مبری سے پوچھا تھا۔

”کہا ہے، بلکہ میری وانیال سے لڑائی بھی ہو چکی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنا کام خود کر سکتی ہوں،

لیکن انہوں نے اُنکا مجھے ڈانٹ دیا۔“

”اور اس روز جو میں تم سے کہا تھا ناں کہ وانیال اور حنا شا پنگ مال پر نظر آئے تھے۔۔۔؟“

رابعد کو فوراً یاد آ گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔! میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میں نے ہی حنا کو بھیجا تھا، جبکہ میرے علم میں ہی نہیں تھا۔“

”تو یہ ہے کہ جب تم نے بتایا تو میں چکرا اُٹھی تھی۔“

”اُف۔۔۔! تم نے مجھے بھی چکرا دیا۔“

رابعد نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر جھکا، پھر تاسف سے کہنے لگی۔

”مجھے تمہاری جھٹائی کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، ان کا ارادہ وانیال کی شادی

حنائے کرنے کا تھا، لیکن شاید اس وقت دانیال نہیں مانا ہوگا۔  
 ”لیکن رابعہ.....! اب تو دانیال کی شادی ہو چکی ہے۔“  
 وہ عاجز ہو کر بولی تھی۔  
 ”حنائی تو نہیں ہوئی۔“  
 رابعہ کے لہجے میں جانے کیا تھا، وہ ہمہ گمی تھی۔

☆—☆—☆

سیما مسلسل کمال حسن کی باتوں میں الجھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ایک انہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ جو ہمیشہ گھریلو معاملات سے خود کو دور رکھتے تھے، انہیں ثانیکہ کا میکے میں رکنا کیوں کل رہا تھا؟ وہ یہ سمجھنے کی کوششیں کر رہی تھی کہ حنائی کی پکار سنائی ہی نہیں دی۔ جب حنائی اس کے قریب بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ اچھل کر اسے گھورنے لگی۔

”آف آپا.....! آپ کسی کا غصہ مجھ پر مت نکالنے بیٹھ جائیے گا۔“

حنائے کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”دیئے آپا.....! ہو کیا ہے؟“

حنائے پھر پوچھا تو وہ فنی میں سر ہلا کر کہنے لگی۔

”مجھے خود نہیں پتا کیا ہوا ہے۔؟ رات تمہارے ڈلہا بھائی پتا نہیں کس بات پر بگڑے ہوئے تھے۔

دانیال سے بھی عجیب لہجے میں بات کر رہے تھے۔

”کیا.....؟ کیا کہہ رہے تھے دانیال سے؟“

حنائے نظر میں چرائے ہوئے ہی پوچھ گئی۔

”بھئی کہہ دینا کیوں ہے؟ اب تم اپنی ذمہ داری ثانیکہ پر ڈالو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، انہیں

ثانیکہ کا میکے جانا کیوں کل رہا ہے؟“

سیما کمال حسن کی نقل اُتارتے ہوئے بتا رہی تھی کہ حنائی بول پڑی۔

”ڈلہا بھائی کو ثانیکہ کا میکے جانا نہیں کل رہا آپا.....! بلکہ میرا بیباں رہنا کل رہا ہے۔“

”تمہارا؟“

سیما حیرت اور ناہنجی میں سے دیکھنے لگی تھی۔

”جی.....! اصل میں رات میں اور دانیال یہاں بیٹھے ہی وی دیکھ رہے تھے کہ.....“

حنائے دانیال کو اتارے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو سیما بھی سنبھل کر دانیال سے مخاطب ہو گئی۔

”خیریت.....؟ تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟“

”بس.....! وہ..... سر میں درد تھا۔ کلینز.....! ایک کپ چائے بھجوا دیں۔“

دانیال کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”میں بتائی ہوں چائے۔“

حنائے فوراً اُٹھ کر کچن کی طرف بھاگی تھی اور پانچ منٹ میں چائے لے کر دانیال کے پیچھے چلی گئی تو سیما نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”یہ لڑکی بتانا یا کھیل بگاڑ دے گی۔ ذرا قتل ہیں اس میں، کچھ دن صبر نہیں کر سکتی۔“

سیما بڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی جہاں کیٹھن کو اتارے دیکھ کر ٹھک کر رک گئی۔

”السلام علیکم بھابی.....!“

ثانیکہ نے سلام کیا تو وہ پیشکش خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”ارے ثانیکہ.....! تم کیسے آئیں؟ میرا مطلب ہے، کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”بھابی.....! وہ رابعہ چھوڑ گئی ہے۔“

ثانیکہ زبردستی مسکرائی تھی۔

”اچھا.....! ہاں۔ رابعہ..... کسی ہے رابعہ.....؟ خوش تو ہے ناں؟“

سیما اس کی بے وقت آمد پر ہلکا گئی تھی۔

”جی.....!“

”جے کہاں رابعہ.....؟ کمال ہے، تم نے اسے باہر ہی کھڑا رکھا ہے۔ جاؤ اندر لے کر آؤ۔ میں بھی مل

لوں اس سے۔“

وہ حنائی کو خبردار کرنے کے لئے کسی طرح ثانیکہ کو ادھر ادھر کرنا چاہتی تھی۔

”بھابی.....! وہ اصل میں رابعہ جلدی میں تھی۔“

”ہائیں.....؟ باہر ہی باہر سے چلی گئی.....؟ تو اچھی بات نہیں ہے۔ تم نے جان کیوں دیا اے؟“

اچھا آؤ میرے کمرے میں، جنہیں اپنی شاپنگ دکھاؤں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو آئی ہوں میں مارکیٹ سے۔ تمہارے

لئے بھی دو سوٹ لائی ہوں، آؤ۔“

”جی.....! آپ چلیں میں یہ ایک رکھ کر آتی ہوں۔“

ثانیکہ بولتے سے کہتے ہوئے ہوئے بیڑھیاں چڑھنے لگی تو اسے سیما کی بڑبڑاہٹ سنائی دی، لیکن اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ لیکن اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ سنانے میں آگئی تھی۔ حنائے اور دانیال بیڈ پر بیٹھے

ہاش کھیل رہے تھے۔

”دانیال! ایہ۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔  
مارے غصے کے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

”تم؟“  
دانیال ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تو حنا نے بھی اس کی تھید کی۔

”غلط وقت پر آ گئی ہوں شاید میں۔۔۔“  
وہ ڈکھے سے بولی، پھر حنا کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

”تمہیں میرے کمرے میں آنے کی ہمت کیسے ہوئی، وہ بھی میری غیر موجودگی میں۔۔۔؟“  
اس کا بس نہیں چل رہا تھا حنا کا منہ نوچ لے۔

”دانیال!“  
حنا نے مدد کے لئے دانیال کو پکارا تو وہ اس پر بگڑنے لگا۔

”ٹائپ!۔۔۔ تیز سے بات کرو۔ حنا کو کمرے میں، میں نے بلا یا تھا۔“  
”کیوں؟“ کیوں بلا یا تھا آپ نے اسے کمرے میں۔۔۔؟ کیا گنتی ہے یہ آپ کی۔۔۔؟

وہ تیزی سے دانیال کی طرف گھومی تھی تو وہ قدرے بولکھا کر حنا کو دیکھنے لگا۔  
”کیا سننا چاہتی ہو تم؟ میں بتاتی ہوں کہ میں دانیال کی کیا گنتی ہوں۔۔۔؟ میں اور دانیال اچھے

دوست ہیں اور بس!“

حنا نے چپا چپا کر کہا اور پھر زکی نہیں، تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو دانیال نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

”منہ کیوں موڑ رہے ہیں دانیال؟ میری طرف دیکھیں۔“  
اس نے دانیال کا بازو دیکھنا پھر ڈکھے سے بولی تھی۔

”میری محبت میں کیا کمی ہے جو آپ اپنی وقار داریاں بدل رہے ہیں۔۔۔؟ بتائیں دانیال! میں لے

تو اپنا سب کچھ آپ کو مان لیا تھا، پھر آپ مجھ سے دامن کیوں پھرارہے ہیں۔۔۔؟“  
”یہ شخص تمہارا وہم ہے ورنہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

دانیال کا لہجہ زور تھا۔  
”میرا وہم ہے، جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ صرف مجھے نہیں، خود کو بھی

دھوکہ دے رہے ہیں دانیال! جس راستے پر آپ چل رہے ہیں، وہ آپ کو پتہ ہی نہیں کہاں لے جائے گا۔۔۔؟“  
”پلیز ٹائپ!“  
وہ ہاتھ اٹھا کر بولا تھا۔

”مت خود کو بلکان کرو، جو تم سمجھ رہی ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔“  
”ٹھیک ہے۔۔۔ امان لوں گی کہ میں غلط سمجھ رہی ہوں، اگر آپ حنا کا اس گھر میں داخلہ بند کر دیں۔“

”شٹ آپ!“

دانیال کو کوئی جواب نہیں سوجھا تو اسے خاموش کر کے نکل گیا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کے پیچھے

ابھرتی رہی، پھر بیڑ پر گرتے ہی اس کے آنسو روانی سے چھلک گئے۔ ایک تو ایسی حالت میں تھی، اس پر شدت گر یہ

لے لے اسے بالکل بڑھال کر دیا تھا۔ شام میں نیچے آئی تو کمال حسن اسے دیکھتے ہی توشیح کا اظہار کرنے لگے۔  
”کیا ہوا ہے ٹائپ۔۔۔؟ تم آئی تو کرو ہو رہی ہو۔۔۔؟“

”کھاتی پتی جو نہیں ہے۔“  
سیما فوراً بولی تھی۔

”یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ دانیال!۔۔۔ تم خیال نہیں کرتے۔۔۔؟ جاؤ چیک آپ کراؤ اس کا۔ ڈاکٹر سے  
پہرہ بوبوک کیوں نہیں لگتی ہے اسے۔۔۔؟“

انہوں نے دانیال کو تیشی انداز میں مخاطب کر کے کہا تو سیما پھر بول پڑی۔  
”ہاں!۔۔۔! میں بھی تو یہی کہتی ہوں، ڈاکٹر سے اس کی ڈائٹ کے بارے میں ضرور پوچھ لیا کرو۔ کافی

کمزور ہو گئی ہے۔“

”جی!“  
دانیال جڑ بڑ ہو کر اسی قدر کہہ بسکا۔

”کیا جی؟۔۔۔؟ ابھی لے کر جاؤ اسے ڈاکٹر کے پاس، اور۔۔۔“  
کمال حسن کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اسے دیکھ کر بولا۔

”چلو۔۔۔!“  
”جاؤ ٹائپ۔۔۔؟ تمہیں خود بھی اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔“

کمال حسن نے اسے نرمی سے ٹوکا تو وہ ڈر سا سر ہلا کر دانیال کے ساتھ چل پڑی۔ تمام راستہ وہ رنڈھا ہٹا

رہا تو اس نے بھی بات نہیں کی۔  
اور پھر کتنے دن گزر گئے۔ دانیال کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ بات کرتی تو جواب دیتا ورنہ خود سے نہیں بولتا

تھا۔ وہ پریشان ضرور تھی، لیکن یہ طہینان بھی تھا کہ اس دن کے بعد سے حنا نہیں آئی تھی، جس سے وہ یہ گھٹنے بھی تھی کہ  
اس کے کہنے پر ہی دانیال نے حنا کا اس گھر میں داخلہ بند کر دیا، اور یہ اس کی خوش گنجی تھی۔  
اس وقت وہ لاؤنج میں کشن کے کورڈ چنچر پر تھی کہ کشن کی تیل بجنے لگی۔ سیما جگن میں تھی، اس نے  
کشن رکھ کر فون اٹھا لیا۔

”ہیلو.....!“

”تم مجھے اپنے کمرے سے نکال سکتی ہو، اس گھر سے نکال سکتی ہو، لیکن دانیال کے دل سے نہیں نکال سکتیں۔“

ادھر اس کی آواز سننے ہی کہا گیا تو وہ بلا ارادہ بولی تھی۔

”کون.....؟“

”دانیال کی پہلی اور آخری چاہت.....!“

”جنا.....؟“

اس کی زبان سے ایسا یہ پہلی تھی۔ ادھر جنا کلکھلا کر ہنسی پھر جتا کر بولی تھی۔

”مجھے پہچاننے کا مطلب جانتی ہو، یعنی تم تسلیم کر رہی ہو کہ دانیال کی پہلی اور آخری چاہت میں ہی

ہوں۔“

اس نے ایک دم فون بچا دیا، پھر بلیٹی تو سیما کو کھڑے دیکھ کر انبان کی بن گئی۔

”کس کا فون تھا.....؟“

”سیما کھوتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔“

”آپ کی بہن کا۔“

اس نے سر سر ہی بتایا، لیکن چہرے پر ناگواری چھیل گئی تھی۔

”پھر فون بند کیوں کر دیا.....؟“

”سیما نے پوچھا تو وہ فوراً بولی تھی۔“

”اس کی زبان کو لگام دینے کے لئے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”سیما تیز ہو گئی تو وہ بھی خود پرتاؤ نہیں رکھ سکی۔“

”اپنی بہن سے پوچھیں، بہت شوق ہے اسے میرے اور دانیال کے درمیان آنے کا۔“

”کیا کب اس کر رہی ہو.....؟ شرم نہیں آتی میری بہن پر انہیں لگاتے ہوئے.....؟“

”سیما آؤت ہو گئی۔“

”میں انہیں لگا رہی، جی کہہ رہی ہوں۔ آپ بھی جانتی ہیں، سب دیکھ رہی ہیں آپ، اور بجائے

اپنی بہن کو سمجھانے کے مجھ پر ناراض ہو رہی ہیں.....؟ آخر کیوں.....؟“

”وہ سوالیہ نشان بن گئی۔“

”کیونکہ تم غلط بات کر رہی ہو۔“

”غلط میں نہیں، آپ ہیں۔“

اس کے برابر سے جواب دینے پر سیما تلملا کر جھنجھکی تھی۔

”ٹانہ.....! اپنی حد میں رہو۔“

”میں اپنی حد میں ہی ہوں۔ باقی سب کو بھی اپنی حدود میں رہنا چاہئے۔“

وہ کہہ کر تیزی سے بیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ سیما کتنی دیر دانت بٹکتی رہی، پھر کچھ سوچ کر دانیال کو آفس

فون کر ڈالا۔

”ہیلو.....!“

دانیال نے تیسری بیل پر فون اٹھایا تو وہ آواز بھر کر اسی قدر بولی تھی۔

”دانیال.....!“

”کون.....؟“

وہ غائبانہ پہچاننا نہیں تھا۔

”دانیال.....؟ میں بات کر رہی ہوں، تمہاری بھابی۔“

اس نے مزید ناک سے یوں شوش کی آواز نکالی جیسے رو رہی ہو، اور ادھر وہ پریشان ہو گیا۔

”بھابی.....! کیا ہوا ہے بھابی.....؟ آپ رو کیوں رہی ہیں.....؟ بتائیں ناں بھابی.....! سب خیریت

تو ہے ناں.....؟“

”ہاں.....! خیریت ہی ہے۔“

وہ اٹھا اٹھا کر اڑا تھا۔

”پھر آپ رو کیوں رہی ہیں.....؟“

”بس..... وہ.....“

وہ شاطر عورت تھی۔

”دیکھو.....! میں تم سے شکایت نہیں کر رہی، بس تم ٹانہ کو آرام سے سمجھا دینا۔“

”کیا مطلب.....؟“

وہ کیا کہتا۔

”بس.....! وہ ابھی ٹانہ سے مجھ سے بہت بدتمیزی کی ہے اور جتنا پر بھی اٹنے کدے گندے لگنے لگے انہیں لگاتے

ہیں۔ مجھے اگر ٹانہ کی ذہنیت کا پتا ہوتا تو میں کبھی اپنی بہن کو گھر نہ بلاتی۔“

وہ مقلوبیت سے بول رہی تھی۔

”جنا کو پتا چل گیا تو اس کے دل پر کیا گزے گی.....؟“



”ارے نہیں بھابی گا!“

وہ فوراً بولتا تھا۔

”آپ پلیز صتا سے کچھ مت کہئے گا۔ میں ٹائیڈ کو سمجھا دوں گا۔“

”ہاں.....! دیکھو آرام سے کھانا، جھگڑا مت کرنا اس سے۔ سمجھ رہے ہوں؟“

”جی.....!“

”اچھا.....!“

سیما فون رکھ کر مسکرائی تھی۔

☆.....☆.....☆

”جہانزیب.....! میں آج امی کے گھر جاؤں گی۔“

صبح ناشتے کی تکمیل پر سب کی موجودگی میں اس نے انہیں مخاطب کر کے کہا تو بس ایک چل کوان کا ہاتھ زکا تھا، لیکن پھر فوراً وہ اسی طرح مصروف ہو گئے اور وہ ان کی لائقہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوبارہ بولیا ہوئی۔

”بہت دن ہو گئے ہیں گئے ہوئے۔ آپ اسی وقت مجھے ساتھ لے کر جائیں گے یا.....“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

انہوں نے کٹائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے غمت کا مظاہرہ کیا۔

”میرا خیال ہے، امی کا گھر آپ کے راستے میں پڑتا ہے۔“

اس نے کہا اور تائید کے لئے اماں کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔

”ٹھیک تو ہے.....! جاتے ہوئے چھوڑتے جانا کئی بار اس کی امی کا فون بھی آچکا ہے اور اس روز تو مجھ

سے شکوہ بھی کر رہی تھیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ ہم نے اسے پابند کر رکھا ہے۔“

پتا نہیں انہیں اپنی کیفیات چھپانے میں اس قدر کمال کیونکر حاصل تھا.....؟ وہ جو انہیں بغور دیکھ رہی

تھی، وہ بھی نہیں جان سکی کہ وہ اندر ہی اندر کیسے توج و تاب کھا رہے تھے..... جبکہ بظاہر اپنا سابقہ دلچسپ برقرار رکھ

کر رہے۔

”چلو.....!“

وہ ان سے پہلے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ جلدی بیک میں چند جوڑے کپڑوں کے رکھے اور

بالوں میں اوپر اوپر سے برش کر کے بیک اٹھاتی ہوئی برآمد میں آ گئی۔ وہ جہانگیر کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس پر اچھتی

نظر ڈال کر جہانگیر سے جانے کیا کہتے ہوئے آگے آگے چل پڑے۔

گاڑی انہوں نے مسلسل ایک ہی رفتار سے چلائی تھی اور گھر کے سامنے ایک جھکے سے روکی تو غالباً کچھ

کہنے سننے سے پہنچ کر خاطر فوراً سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سگائے میں مصروف ہو گئے۔

”واپسی کا پروگرام کچھ یوں ہے کہ جب بھی آپ آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

وہ ان کی طرف دیکھ کر بولی اور پھر اتر کر اندر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے لینے اتنی جلدی نہیں آئیں

گے، اس لئے پہلے ہی سر ملے پر جب چکی نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ یہ پوچھا کہ ابھی رہو گی، تو وہ

کہوت سے بولی۔

”ہاں.....! بہت سارے دن رہوں گی۔“

”آئی بھی تو بہت سارے دنوں بعد ہو۔“

امی نے اسے گلے لگاتے ہوئے شکوہ بھی کر ڈالا۔

”کیا کروں؟.....؟ طبیعت تکمیل کے نہیں دے رہی تھی، اور جہانزیب کہتے، جب تک بھلی چنگی نہیں ہو

ھاؤ گی نہیں جانے دوں گا۔ کیونکہ اس طرح امی کہیں گی، میری بیٹی کا یہ حال کر دیا۔“

اس نے ہنسنے ہوئے روایتی بیویوں والا بھرم رکھا۔

”اب کیا حال ہے تمہارا؟“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کہاں ٹھیک ہو.....؟ اتنی کمزور لگ رہی ہو۔“

چنگی نے ٹوکا۔

”بس.....! تھوڑی کمزور ہے۔“

پھر فوراً موضوع بدل دیا۔

”چھوٹے بھیا کہاں ہیں؟“

”ابھی باہر نکلے ہیں۔“

”کہاں.....؟“

”آج کل نوکری کے چکر میں ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن وہ کپیٹر کا کورس جو کر رہے تھے.....؟“

”وہ بھی کر رہے ہیں اور وہ کیونکہ شام کی کلاسز ہیں اس لئے۔“

”چلو شکر ہے، کسی طرح انہیں احساس تو ہوا، اور بڑے بھیا کے گھر میں سب ٹھیک ہیں.....؟“

”ہاں.....! ابھی کل ہی بھائی آئی تھیں۔ تمہارا نہ صرف پوچھ رہی تھیں بلکہ شکایت بھی کر رہی تھیں کہ

سرا ل تو ایسا بھیا تھا جس کے پیچھے سب کھول گئی تھی۔“

چنگی نے بھائی کے الفاظ و ہرائے پھر ان کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

”وہ بھائی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ حالانکہ تمہارے ساتھ کوئی اتنے زیادہ بکھیرے بھی نہیں ہیں۔“  
 ”بکھیروں کی بات نہیں ہے یار..... اصل میں میرے آنے سے اماں اکیلی ہو جاتی ہیں۔ البتہ جب  
 جہانگیر کی شادی ہو جائے گی، تب بہت سے کہیں آ جا سکو گی۔“  
 وہ پہلے ہی سے یہ ساری باتیں سوچ کر آتی تھی، جبھی روانی سے ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔  
 ”بہر حال، اب آ تو گئی ہوں اور جب تک تم خود جانے کے لئے نہیں کہو گی، نہیں جاؤں گی۔“  
 ”ارے واہ..... میں کیوں جانے کے لئے کہوں گی؟ میں تو چاہتی ہوں تم.....“  
 ”چٹکی.....!“  
 امی نے ٹوک دیا۔  
 ”کم از کم اسے آرام سے بیٹھنے دو۔ تم تو فوراً ہی اس کے سر پر سوار ہو گئی ہو۔“  
 ”سوری.....!“  
 چٹکی نام ہونے کی بجائے بے ساختہ ہنسی ہوئی بولی۔  
 ”بھئی جانیہ! مجھے بالکل یاد نہیں رہتا۔ اب چونکہ تم شادی شدہ ہو، اس لئے تمہارے ساتھ خاص  
 مہمانوں والا سلوک کرنا ہے۔ یعنی پہلے اوپے اسٹول پر بٹھانا ہے، پھر فوراً چائے یا اسکوئش پیش کرنی ہے۔ اس کے  
 بعد.....“

”بس بس.....!“

اس نے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کیا۔

”میں کوئی مہمان نہیں ہوں، البتہ جب جہانگیر صاحبزادہ کے ساتھ ہوں تب ذرا خیال کر لیا کرو۔“

”ارے.....! جہانگیر صاحبزادہ کی باتوں میں نے پوچھا ہی نہیں۔ کیسے ہیں وہ اور آئے کیوں نہیں اندر.....؟“

”بہت عجلت میں تھے، اس لئے باہر ہی سے چلے گئے۔“

”شام میں آئیں گے ناں.....؟“

”نہیں.....!“

”کیوں.....؟“

چٹکی سے پہلے امی نے پوچھا تو وہ سوچ کر بولی۔

”اصل میں انہوں نے عربین بیگ جوائن کر لیا ہے اور بہت جلد ٹرانسفر ہو کر جدہ جانے والے ہیں تو امی

سلسلے میں خاصے مصروف ہیں۔“

”تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”یہ ابھی کی بات ہے۔“

”تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی کیا.....؟“

چٹکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ابھی تو نہیں.....! بعد میں ہو سکتا ہے، بلائیں گے یا شاید نہ بھی بلائیں، ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

وہ خود مطمئن نہیں تھی، لیکن بڑی خوب صورتی سے امی اور چٹکی کو مطمئن کر رہی تھی۔

☆☆☆

خوبصاحب، بیگم کی بات سن کر خاموش ہو گئے تھے۔ بلکہ ان کے چہرے پر سوچ کے ساتھ قدرے  
 لگوملگوری کا تاثر بھی چھلکنے لگا تھا، جسے محسوس کر کے ہی بیگم خوب پوچھنے لگیں۔

”کیا بات ہے میاں.....؟ آپ پریشان کیوں ہو گئے.....؟“

”پریشان.....؟“

خوبصاحب چونک کر بولے۔

”نہیں تو، پریشانی کی بات تو نہیں ہے، بس سوچ رہا تھا، رابعہ آتی ذور چلی جائے گی.....؟“

”ہاں.....!“

بیگم خوبصاحب ”ہاں“ کو لمبا کھینچ کر کہہ گئیں۔

”خوش تو ہے ناں رابعہ.....؟“

”ہاں میاں.....! اللہ کا شکر ہے، مجھے اس کے چہرے پر اطمینان نظر آیا اور خوش بھی تھی۔“

رابعہ کی خوشی بتاتے ہوئے بیگم خوبصاحب خود بھی خوش ہو رہی تھیں کہ اسی وقت رابعہ بھی آ گئی۔

”السلام علیکم.....!“

”ارے.....! ماشاء اللہ.....! بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ خوش رہو، آ باد

رہو۔“

بیگم خوبصاحب، رابعہ کو دیکھ کر کھل گئیں۔

”آپ کیسے ہیں ابا.....؟ اور کس سلسلے میں مجھے یاد کر رہے تھے.....؟“

رابعہ نے خوبصاحب کے پاس بیٹھنے ہوئے پوچھا۔

”وو..... چٹا.....! تمہاری اماں بتا رہی تھیں کہ شیرازا پناہ پزیر بنی ڈینی ٹرانسفر کر رہا ہے.....؟“

خوبصاحب نے بتانے سے زیادہ پوچھا تھا۔

”جی ابا.....! یہی کہہ رہے تھے شیراز کہ وہ پچھلے چھ مہینوں سے اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ آفس

وغیرہ تو تقریباً وہاں سیٹ کر چکے ہیں۔“

خواجه صاحب نے فوراً انہیں خاموش کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ایک نظر سوٹ دیکر کرتی ٹائیپ پر ڈال کر اسی خاموشی سے بیٹھ کر

شوز اتارنے لگا تھا۔

”ارے..... آپ کب آئے؟“

ٹائیپ سوٹ دیکر کرتی ٹائیپ کو اسے دیکھ کر چونک کر بولی تھی۔

”آپ کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“

”حیرت ہے، میں نے تو سنا تھا بیاں شوہر کے بڑے از قدموں کی چاب بھی محسوس کرتی ہیں۔“

اس نے قصداً حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

”اچھا..... اور کیا کیا سنا تھا آپ نے؟“

”بہت کچھ۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”لیکن تم میں کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شوہر کی عزت کا پاس بھی نہیں ہے۔“

”دانیال؟“

وہ ٹھٹک گئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”کیوں؟ شادی کی پہلی رات میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے لئے میرے بھیا اور بھالی ہی

سب سے زیادہ محترم ہیں۔“

اس کے چہرے پر وہ سمجھ کر بولی۔

”اوہ! تو بھالی نہ.....“

”ہاں! بھالی نہ بتایا ہے مجھے کہ تم کتنی بدتمیز اور بدعقل ہو گئی ہو۔“

دانیال نے اس کی بات کرتے ہی سمجھ میں کیا تو وہ زچ ہو کر بولی۔

”تمہیں دانیال! میں بدتمیز اور بدعقل نہیں ہوں۔ مجھے حنا کی باتوں پر غصہ آ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے

بھالی سے بدتمیزی نہیں کی۔“

”حنا کی باتوں پر.....؟“

وہ حنا کے نام پر چونک گیا تھا۔

”اچھی بات ہے، پھر تم لوگوں کا کب تک جانے کا پروگرام ہے؟“

”پتا نہیں لبا.....! ویسے شیراز جلدی کا کہہ رہے تھے۔ میرا پاسپورٹ بن جائے، پھر دیکھیں کب

تک.....“

رابعہ کے انداز میں بہت ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

”اچھا اچھا! پھر تم نے پاسپورٹ بننے دے دیا.....؟“

خواجه صاحب نے سر ہلا کر پوچھا۔

”نہیں.....! ابھی وہیں جا رہی تھی، سوچا پہلے آپ سے پوچھ لوں۔“

رابعہ نے کہا تو خواجه صاحب حیرت کے اظہار کے ساتھ کہنے لگے۔

”ہیں؟ مجھ سے اب کیا پوچھتا ہے بیٹا؟ اب تمہیں ہر کام اپنے شوہر کی مرضی سے کرنا ہے۔“

”جی ابا.....! لیکن میں پاسپورٹ کا نہیں، شوٹی کا آپ سے پوچھتا جا رہی تھی۔“

رابعہ نے سعادت مندی سے کہا تو خواجه صاحب سمجھے نہیں۔

”شوٹی کا.....؟“

”جی.....! وہ شیراز کہہ رہے تھے کہ بچوں کا نام میرے پاسپورٹ پر آنے کا تو میں شیراز کے بچوں کے

ساتھ اپنے بچے کا نام بھی لکھوا دوں.....؟“

رابعہ وضاحت کے ساتھ سوالیہ نشان بن گئی تو خواجه صاحب بے شکل خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔

”کیوں بیٹا.....؟ کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں ہے؟“

”بات بھروسے کی نہیں ہے ابا.....! میں تو آپ کی پریشانی کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اور اماں

شوٹی کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ ٹھک کرنے کا آپ کو۔“

”کوئی ٹھک نہیں کرے گا۔ اس کی صورت تو ہمیں جیسے کا بہانہ مل گیا ہے۔ تم اسے لے جاؤ گی تو ہم کیا

کریں گے؟“

خواجه صاحب نے اتنی عاجزی سے کہا کہ رابعہ خاموش ہو کر ماں کو دیکھنے لگی، جو شوہر کو دیکھتے ہوئے سمجھ

نہیں پا رہی تھیں کہ وہ شوٹی کو اپنے پاس رکھنے پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں.....؟

”ٹھیک ہے ابا.....! اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو.....“

رابعہ، باپ کی عاجزی کے سامنے ہار گئی۔ اپنی امیتا انہیں دان کر کے گلی چلی، جب بیگم خواجه چپ نہیں رہ

سکیں۔

”یہ کیا کیا میاں.....؟“

”ہں!.....! چپ رہو، رابعہ کے حق میں یہی بہتر ہے۔“

”جی.....! جتنا کافون آیا تھا۔ کب رہی تھی“

وہ حتا کی باتیں دہرا رہے جاری تھی کہ سہانے ان دونوں کو پکار لیا۔

”چلو.....! پہلے کھانا کھائیں۔ بسا ڈاننگ پرائنٹا کر رہے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے اس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا۔ ٹانیہ جیسے ناچار اس کے پیچھے ڈاننگ روم میں آئی تھی۔ کمال حسن نے اُٹھتی ہوئی نظر ان دونوں پر ڈالی، پھر اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے سیما کو مخاطب کر کے پوچھنے لگے۔

”یتیم.....! یہ سالن تم نے بنایا ہے۔؟“

”تو اور کون بنائے گا۔؟“

سیما کو جیسے بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”آپ نے کون سے مجھے تو کر رکھ کر دیئے ہوئے ہیں۔؟ صبح سے رات تک سارے کام میں ہی کرتی

ہوں۔“

”کیوں.....؟ کام والی نہیں آتی کیا۔؟“

کمال حسن نے سیما کے بھڑکنے کا کوئی ٹوٹ نہیں لیا، جنور آرام سے پوچھا تھا۔

”کام والی کے سر پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پتا چل جائے گا۔“

کام والی کے سر پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پتا چل جائے گا۔“

سیما کو مزید تیز ہوتے دیکھ کر کمال حسن نے سالن کی ڈش وانا لیل کی طرف بڑھا دی۔

”لو کھو.....! کھانا کھاؤ۔ ورنہ تمہاری بھابی و ماغ کھا جائے گی۔“

”ہاں.....! میں تو ایسی ہی ہوں۔“

سیمانے سلگ کر کچھ ڈش میں ڈال دیا اور اٹھ کر چلی گئی تو وانا لیل نے پوچھا کہ کمال حسن کو دیکھا۔ وہ آرام

سے کھانا کھانے لگے۔ تب وہ اٹھ کر سیما کے پیچھے چلا آیا۔

”بھابی.....! بھابی.....! میں تو۔“

”کچھ نہیں سننا مجھے۔“

سیما تیزی سے اپنے کمرے میں جانے لگی کہ اس نے بھاگ کر راستہ روک لیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھابی.....؟ چتا تو ہے آپ کو بوسا مذاق کرتے ہیں۔“

”یہ مذاق تھا۔؟ بچوں کے سامنے دو کوڑی کا کرکھ دیا اور تم کہتے ہو یہ مذاق ہے۔؟“

سیما بری طرح تھلا رہی تھی۔

”اوہو بھابی.....! اب ہم بچے نہیں ہیں، بڑے ہو گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں مذاق کو۔“

اس نے قصداً اخلوط انداز اختیار کیا، لیکن سیما مزید ترخ کر رہی تھی۔

”تم سمجھتے ہو تمہاری بیوی نہیں سمجھتی، اسے تو آگنا اور بھل جاتی ہے کہ میاں ذلیل کر رہا ہے تو دو چار

باتیں میں بھی سناؤ الوں۔ کوئی حیثیت ابھی نہیں ہے میری۔“

سیمانے آواز بھرا کر تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

”کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی.....! مالک ہیں آپ اس گھر کی اور ہم سب آپ کے غلام۔“

”بس رہتے دو، چاہے مجھے نہیں کیا ہوں۔؟ سارا دن کلوہ کے تیل کی طرح جی رہتی ہوں، پھر بھی اتنی

باتیں سننے کو لگتی ہیں۔“

وہ روئے لگی تھی۔

”بھابی.....! پلیز، کسی میں ہمت نہیں ہے آپ کو کچھ کہنے کی۔ میری اچھی بھابی.....! پلیز، آپ رومیں

نہیں۔ چلیں آئیں کھانا کھائیں۔“

وہ اسے بچوں کی طرح چپکار رہا تھا۔

”نہیں.....! بس مجھے بھوک نہیں ہے، تم جاؤ، کھاؤ۔“

”آپ کے بغیر کیسے کھاؤں۔؟ چلیں ورنہ میں بھی بھوکا سو جاؤں گا۔“

اس کی جھکی کام کر گئی۔

”تم بہت جگ کرتے ہو۔“

”ارے.....! ابھی تو میرا بچہ ہی آنے والا ہے، وہ زیادہ جگ کرے گا آپ کو۔“

وہ کہتے ہوئے سیما کو کندھوں سے تمام کر دیا۔ ڈاننگ روم میں لے آیا تو ٹانیہ جھکی نظروں سے ان

دونوں کو دیکھنے لگی، جبکہ سیمانے پیٹھے ہی فاتحانہ نظروں سے ٹانیہ کو دیکھا تھا، اور وہ نادان سمجھتا ہی نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

رات جس طرح وانا لیل ”بھابی، بھابی“ کر رہا تھا، اس سے ٹانیہ نے پھر حتا کا ذکر نہیں کیا، لیکن وہ سوچ

چکی تھی کہ حتا کی اس دیدہ دلیری کو وانا لیل کے گوش گزار ضرور کرے گی، اور اگر اس نے خوش نہیں لیا، تب وہ اسے

خبردار کر دے گی کہ اب اس معاملے کو وہ خود ہی منٹائے گی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ نیچے آئی تھی کہ سیما کو کہیں جانے

کے لئے تیار دیکھ کر وہ ہلا اور وہ ٹک گئی۔

”ہاں ٹانیہ.....!“

سیما اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

”میں ذرا مایکٹ جاری ہوں، تم پلیز کچن دیکھ لینا۔“

”جی...!“

اس نے انھارے کام لیا۔

”ہاں...! ایسا نہ ہو میں بھی باری آؤں اور پھر مجھے کھانا بھی پکانا پڑے۔“

سینا نے کہا تو وہ گواہی چھپا کر بولی۔

”تمہیں...! میں کرلوں گی سب، آپ اطمینان رکھیں۔“

”اطمینان، ہونہ...! میری زندگی میں اطمینان ہی آئے گا جب...“

سینا سخت سے سر جھٹک کر جانے لیا کہنے جاری تھی کہ کون کی بیل پر اس نے لپک کر فون اٹھالیا تھا۔

جبکہ وہ خود پر ضبط کی سعی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

”ہاں حنا...! میں بس نکل رہی ہوں۔ بیچ جاؤں گی دس منٹ میں۔ ٹھیک ہے...! اور سنو...! تم

نے دانیال کو فون کر دیا ہے ناں؟“

”دانیال...؟“

اس کے کان شاخیں شائیں کرنے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ ضبط کی سعی ترک کرتی، سیماسے خدا

حافظ کہہ کر چلی گی۔

”دانیال...؟ دانیال...؟“

”دانیال کے بغیر تو ان کا کوئی کام نہیں ہوتا۔“

وہ پیر پختے ہوئے کچن میں آئی اور پھر برتنوں کی آغاش شروع ہو گئی۔ وہ بری طرح سلگ رہی تھی۔ جیسے

تیسے کھانا پکا کر فارغ ہوتی تو اس خیال سے دانیال کے آفس فون کر ڈالا کہ ہو سکتا ہے سیماسے نصص اسے سلاگانے کے

لئے دانیال کا نام لیا ہو، لیکن جب اوھر سے یہ کہا گیا کہ دانیال صاحب آدھے گھنٹے پہلے آفس سے جا چکے ہیں، جب

چچ اچ اس کا دامغ ہٹکے سے اڑ گیا تھا۔

”بس دانیال...! اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

اس نے ایک دم فیصلہ کر لیا اور کمرے میں آ کر بیگ میں پہلے اپنی ضروری چیزیں رکھیں، پھر کپڑے نکال

رہی تھی کہ دانیال آ گیا۔

”چائینہ...!“

دانیال نے آتے ہی اسے پکارا تھا۔ وہ الماری میں سرگھسائے کھڑی تھی۔ اس کی پکار سن کر بھی متوجہ نہیں

ہوئی تو وہ کہنے لگا۔

”اس وقت کس کام سے لگی ہو...؟ میں بازار ہوں ناں...!“

اس نے ست انداز میں الماری بند کی پھر اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

”جی فرمائیے...!“

”ارے بھئی...! میں تو عرض کر سکتا ہوں۔ غلام ہوں تمہارا۔“

دانیال نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تو وہ فوراً بولی تھی۔

”میرے نہیں...!“

”تمہارا ہی ہوں اور تمہاری خاطر ہی دوسروں کو خوش کرنے پر مجبور ہوں۔“

دانیال نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”مجبور...؟ کیا مجبوری ہے...؟“

”دیکھو، اگر میں بھائی کی بات نہیں مانوں گا تو وہ سارا وقت تم سے بگڑی رہی ہیں۔“

اس کی لونیجیل پردہ بگڑ گئی۔

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بھائی بگڑتی ہیں تو بگڑتی رہیں، لیکن جو کچھ وہ آپ سے کروا رہی ہیں، وہ

میری برداشت سے باہر ہے۔ سمجھے آپ...؟“

”سگ... کیا... کیا کروا رہی ہیں بھائی مجھ سے...؟“

اس کے دل میں چڑھتا، جب ہی بولھا گیا تھا۔

”یہ...!“

وہ اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ کھینچ کر بولی۔

”یہ آپ اپنی مرضی اور پسند سے تو میرے لئے نہیں لائے ہوں گے۔ حنا نے کہا ہوگا، بیچارے حنائی کے

لئے بھی کچھ لے لو، خوش ہو جائے گی۔“

”بس حنائیہ...! خاموش ہو جاؤ۔“

دانیال نے لا جواب ہو کر ٹوکا تھا۔

”کیوں خاموش ہو جاؤں...؟ آپ کی بھائی باقاعدہ مجھے سنا کر حنا سے کہتی ہیں کہ دانیال کو فون کر دو،

پھر بھی آپ انہیں عرض خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تو کرتے رہیں آپ بھائی اور ان کی بہن کو خوش، میں ہی قائل

ہوں، ہٹ جاتی ہوں آپ کے درمیان سے۔“

”سگ... کیا مطلب ہے تمہارا...؟“

اس نے تیزی سے بڑھ کر اپنا بیگ اٹھالیا اور اس تیزی سے جانے لگی تھی کہ دانیال نے اسے بازو سے

پکڑ کر کھینچ لیا۔

”سگ... کیا کر رہی ہو چائینہ...؟ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو...؟“

”ہاں...! ہو گئی ہوں پاگل، اور مجھے پاگل کرنے والے آپ ہیں۔“

وہ چیخ کر بولی اور اسے دھکیل کر کمرے سے نکل آئی۔  
”جانیہ!“

وہ عقب سے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔  
”خوش ہو جائیں آپ! میں جا رہی ہوں۔“

اس نے لاؤنج میں کھڑی سیما کو تریب ڈک کر کہا، بھرتیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آتے دامیال کو سیما نے روک لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”اسے یقین تھا کہ جہانزیب اتنی جلدی اس کے پاس یا اسے لینے نہیں آئیں گے، اور وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ابھی وہ نہ آئیں۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کی فیور موجودگی میں وہ کیسوی اور غیر جانبداری سے سوچ سکیں گے۔“

اسے یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ اس دوران انہوں نے اسے فون بھی نہیں کیا تھا اور اس سلسلے میں اسے پریشانی صرف اس حد تک تھی کہ اگر ای یا جکی نے اس بات کو محسوس کر کے اس سے پوچھ لیا تو یہ کیا جواب دے گی؟

اس وقت جبکہ ای کسی مہمان خاتون کے ساتھ اور جکی چائے وغیرہ بنانے میں مصروف تھی، تو وہ تنہا بیٹھی یہی سب سوچ رہی تھی۔ کبھی جہانزیب کا گزشتہ روز بے یاد آتا تو امید کی کرن جیگا اٹھتی اور کبھی موجودہ روز بے کسوچی کر مایوسیوں میں گھر لگتی۔ اسی وقت ای بولی آگئے۔ امی کیونکہ ڈرائنگ روم میں تھیں، اس لئے وہ اس کے پاس آ بیٹھے۔

”کیا بات ہے بیٹا؟ تم اکلی کیوں بیٹھی ہو؟“

انہوں نے غالباً یوں ہی بات کرنے کی غرض سے کہا۔

”جکی جائے بنا رہی ہے۔“

”اور تمہاری امی کے پاس کون ہے؟“

”میرا خیال ہے، پڑوس سے کوئی خاتون آئی ہیں۔ آپ کے لئے بھی چائے بنواؤں؟“

وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک لیا۔

”نہیں!... امیرا مطلب ہے، میں نے جکی سے کہہ دیا ہے، وہ لے آئے گی۔“

پھر یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ وہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ جب اچانک مانوس قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا، اور امی وہ اپنا دوہم کمرہ جھک کر سر جھٹک رہی تھی کہ جہانزیب کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر

اسے اپنی بصارت پر بھی شب ہونے لگا۔ بار بار پلکیں پلکیں، لیکن وہ جوں کے توں موجود۔ ایو جی سے مصافحہ کر کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

”بیٹا!... انجکی پتا نہیں کیا کر رہی ہے؟ تم جاؤ، چائے جلدی لے آؤ۔!“

ایو جی نے اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ بے خودی کے عالم میں اٹھ کر بچن میں آگئی۔ دل خوش فہم ہو کر قابو میں نہیں رہا تھا۔ وہ بچن میں آ تو کئی تھی، لیکن یہ یاد نہیں رہا تھا کہ کیوں آئی ہے؟... چپ چاپ جکی کو کیسے لگی۔

”کیا بات ہے جانیہ؟“

جکی اسے گم سم دیکھ کر اچنبے سے پوچھنے لگی تو وہ چونکی، اور اپنی کیفیت چھپانے کو خواہ مخواہ اس پر بگڑنے لگی۔

”کیا کر رہی ہو تم؟... ایو جی نے اتنی دیر پہلے تم سے چائے کا کہا تھا۔“

”ہاں!... اب اس لاری ہوں۔“

”جلدی کرو۔! اور وہاں جہانزیب بھی آئے بیٹھے ہیں۔ صرف ایک کپ مت لے جانا۔“

”اچھا!... اوہ۔ کب آئے جہانزیب بھائی؟“

جکی اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”ابھی!“

”کہیں جھپٹیں لینے تو نہیں آئے؟“

جکی نے جلدی جلدی پلٹنوں میں بسکت اور کھو فیروہ کہتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنی بات یاد کر کے بولی۔

”میرا خیال ہے، میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔“

”لیکن یہ تم نے تو کہا تھا۔“

”میں بے لے کر جا رہی ہوں، تم فوراً چائے لے آؤ۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی اور رے اٹھا کر اندر آگئی۔ ایو جی جہانزیب سے جدہ جانے کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور وہ ان کا جواب سننے کے لئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تقریباً تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔“

وہ بتانے لگے۔

”بس کسی دن میرے ہاتھ میں ٹکٹ تھما دی جائے گی۔“

”جانیہ تو ابھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی ناں؟“

”نہیں!“

اسی وقت جکی چائے لے کر آگئی تو انہوں نے اس کے کہنے سے پہلے ہی ایک کپ اٹھالیا۔ پھر ایک نظر

”بہت غلط کیا ہے اس نے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سیانے فوراً پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”ہاں! تم آرام کرو۔ میں ذرا ٹانیہ کا غصہ خنڈا ہوا جائے، پھر اسے سمجھاؤں گی۔“

وہ سیانے کو بولنے ہوئے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

مگر کوئی غلطی اس کی تھی، لیکن اسے احساس ہی نہیں تھا۔ اٹنا ٹانیہ کی کمزور و انزام ٹھہرا رہا تھا کہ اسے اس طرح

لمبے جانا چاہئے تھا۔

”بھائی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے نہیں نکالا اے، وہ خود گئی ہے، خود ہی آئے گی۔“

وہ پھر سیانے کی باتوں پر ایمان لا کر تنفر سے سوچ رہا تھا کہ سیانے کا تیزی سے بیڑھیاں چڑھتی ہوئی آئی

فی۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

”دانیال! دانیال! وہ۔۔۔“

”کیا ہوا بھائی۔“

اس نے فوراً بڑھ کر سیانے کو تمام لیا۔

”وہ۔۔۔ دانیال! ابھی راجہ کا فون آیا تھا۔“

سیانے نے اپنی سانسیں بحال کرنے کی سعی میں بتایا۔

”پھر۔۔۔ پھر کیا کہا راجہ نے؟“ پتھنجی اس کی بہن۔۔۔ سنا ڈالے جھوٹے سچے قصے۔“

وہ طنز سے بولا تھا۔

”ان باتوں کو چھوڑو دانیال! اس کی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔“

سیانے کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

”کس کی اماں کا؟“

”ٹانیہ کی!“

”کس کی؟“

”اے شک لگا تھا۔“

”کیا کہہ رہی ہیں بھائی۔؟“

”یہی بتایا ہے راجہ نے۔ چلو میں بھی چلتی ہوں۔ جلدی کرو، میں تمہارے بیٹا کو فون کرتی ہوں، وہ

بچوں کو اسکول سے لے لیں گے۔“

اس پر ڈال کر پوچھا۔

”گھر چلتا ہے۔؟“

”جی۔!“

وہ نیچے کہتے، تب بھی اسے جانا تھا۔ کیونکہ وہ خود ان سے کہہ چکی تھی کہ جب بھی آپ آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔

پھر انہی نے بے حد اصرار سے انہیں رات کے کھانے تک روک لیا۔ اس دوران وہ مسلسل ایک خوش گوار احساس میں گھری رہی۔ گو کہ وہ اس سے اسی طرح لاتعلقی رہے، لیکن اس کے لئے فی الحال یہی بہت تھا کہ وہ تیسرے دن ہی اسے اپنے آگے تھے اور اس کا خیال تھا، وہ یوں ہی تو نہیں آئے ہوں گے۔ یقیناً تمام حالات کو سوچنے کے بعد اسے بے قصور سمجھتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ ٹانیہ کے پیچھے جانا چاہتا تھا، اسے روکنا چاہتا تھا، لیکن اس کے بازو پر سیانے کی گرفت مضبوط تھی۔

”بھائی! وہ۔۔۔“

اس نے بے بس انداز میں سیانے کو دیکھا تو وہ اس کا بازو ہلا کر کہنے لگی۔

”پاکل مت بنو۔ غصے میں معاملہ زیادہ بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے میں نے جنہیں روک لیا ہے، اور ٹانیہ

جانے گی کہاں! اپنے سیکے ہی جائے گی ناں۔؟“

”لیکن بھائی۔۔۔ اس طرح میرا مطلب ہے اس کے ماں باپ کیا سمجھیں گے۔؟“

اسے پریشانی نے گھیر لیا۔

”یہ تو ٹانیہ کو سوچنا چاہئے تھا، لیکن غصے میں وہ بھی کیا سوچ سکتی تھی؟ خیر! تم فکر مت کرو۔“

سیانے تسلی دی تو وہ دھڑ بھڑا ہوا گیا۔

”کیسے فکر نہ کروں بھائی۔؟ ٹانیہ کی حالت دیکھی نہیں آپ نے۔؟“

”ہاں! ایسی حالت میں تو اسے خود ہی احتیاط کرنی چاہئے۔“

”آپ بتائیں، میں کیا کروں۔؟“

”موصلاً کو، مردہ، مگر زبردست زندگی اس کی غلامی کرتے رہو گے۔“

سیانے بہت طرے سے اسے سمجھانے لگی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دانیال! جتنے زوم میں ٹانیہ گئی ہے۔ دیکھتے ہیں کتنے دن ماں باپ کے گھر

بیٹھ سکتی ہے۔؟ تم نے نہیں نکالا اے، خود گئی ہے، خود ہی آئے گی۔“

سیما کہتے ہوئے جگت میں چلی گئی، وہ دھانے میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

سیما یہاں بھی اپنی چالاکی سے باز نہیں آئی۔ اس نے دانیال کو غائب سے ملنے ہی نہیں دیا۔ دانیال نے جب کہا، اس نے یہ کہہ روک دیا کہ ابھی اندر بہت عورتیں ہیں، اس کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مزید یہ بھی کہا کہ غائبہ تم اور غصے میں سب کے سامنے اس سے جانے کیا کہہ دے، جبکہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں، غائبہ کو تمہارے پاس لے آؤں۔ آخر میں اسے بھی تلی دے ڈالی، اور یہ تلی تین دن جاری رہی۔ پھر قل خوالی کے بعد وہ اسے گھر کر بیٹھ گئی۔

”میں نے بہت کوشش کی دانیال.....! کہ غائبہ تم سے مل لے، لیکن.....“

اس نے قصداً بات اُدھوری چھوڑی تھی۔

”لیکن کیا بھائی.....؟ بتائیں ناں.....!“

اس کی بے قراری پر وہ اندر ہی اندر بچ و تاب کھا کر بولی۔

”بس.....! جانے دو، تمہارا اور دل برا ہو گا۔“

”پھر بھی، آپ بتائیں بھائی.....! غائبہ نے کیا کہا.....؟“

اس کے اصرار پر سیما نے یوں ظاہر کیا جیسے مجبوراً بتانا پڑ رہا ہو۔

”صرف غائبہ ہی نہیں، رابعہ نے بھی بہت کچھ کہا۔ دونوں بہنوں نے مجھے وہ وہ باتیں سنائیں کہ کیا

بتاؤں.....؟ میں نے سمجھا ابھی کہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے، لیکن.....“

سیما پھر خاموش ہو گئی۔

”کیا کہہ رہی تھیں وہ.....؟“

اس نے پوچھا تو سیما پر جیسے بادل غواستہ بولی تھی۔

”برا بھلا کہہ رہی تھیں کہ جانے کیسے لوگوں میں پھنس گئی غائبہ، اور غائبہ نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اب کبھی

تمہاری شکل نہیں دیکھے گی۔“

”گگ..... کیوں.....؟ کیوں بھائی.....؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے.....؟“

وہ چھٹ پڑنے کو ہو گیا۔

”آرام سے بھائی.....! آرام سے، میں اسی لئے تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی۔“

سیما نے اس سے ہمدردی جنائی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ابھی جاتا ہوں خوبصورت صاحب کے پاس۔“

”پاگل ہو گئے ہو.....؟ قمار نہ ہوا؟ گمراہ لوگوں میں.....؟ بیٹھو یہاں۔“

سیما نے پریشان ہو کر اسے بازو سے کھینچ کر بٹھادیا، پھر کہنے لگے۔

”دو چار دن صبر کرو، پھر جا کر لے آئیں گے غائبہ کو۔“

”ایسے کیسے لے آئیں گے.....؟ پہلے آپ خوبصورت صاحب سے بات کیجئے گا۔“

اس نے کہا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سیما فوری خطرہ منہل جانے پر مطمئن ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ مسلسل روئے جاری تھی۔ آنسو جھمکے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اماں کے مرنے سے زیادہ اس

بات کا ذکر کہ ان کی موت کی ذمہ دار وہ ہے، سیما احساس اسے مسلسل پشیمان کر رہا تھا۔

”اماں میری وجہ سے چلی گئیں۔“

وہ بار بار یہی ڈہرائتی تھی۔ اس وقت رابعہ نے ٹوک دیا۔

”تم ایسا مت سوچو غائبہ.....!“

”کیسے نہ سوچوں.....؟ میں جس طرح آئی تھی، روتی ہوئی، تو مجھے دیکھ کر ہی اماں کا دل بند ہو گیا۔ میں

ہوں ان کی موت کی ذمہ دار۔ میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گی۔“

وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی تھی۔

”بے وقوفی کا ہی تم میں مت کرو۔ زندگی موت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

رابعہ نے دھیرے دھیرے ٹوک کر کہا تو وہ ہتھیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”اچھا دیکھو تم ابھی اماں سے کچھ مت کہنا۔ میرا مطلب ہے، دانیال سے جھگڑے کا ذکر مت کرنا۔“

رابعہ نے پھر نرمی سے کہا تو وہ شاکی ہو کر بولی۔

”دانیال آئے کیوں نہیں.....؟“

”آئے تھے، اندر شاید عورتوں کی وجہ سے نہیں آ سکے۔“

”تو اب تو آنا چاہئے۔ اب تو کوئی نہیں ہے یہاں۔“

اس کا ردھا انداز تھا۔

”آجائیں گے، تم پریشان کیوں ہو رہی ہو.....؟ نہ آئیں تو تم فون کر کے بلا لینا، اور دیکھو، اب تم

بجھداری سے چلو۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں، لیکن اس طرح گھر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مجھ رہی

ہوں.....؟“

رابعہ نے اسے پکڑ کر کھینچا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



”بس! اب رونا بند کرو۔ جاؤ مت دھو، میں اب کے پاس جاتی ہوں، بچارے اکیلے بیٹھے ہیں، اور ہاں! شیراز بھی آنے والے ہیں، پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

راجہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تو اس نے اُنھ کو منہ ہاتھ دھویا، پھر جب راجہ اپنے گھر چلی گئی، تب اس نے دانیال کو فون کیا تو دھر سے سیمانے فون کر لیا۔ یہ کیا تھا۔ اس کی آواز سننے ہی وہ بمشکل خود پر قابو پا کر استحقاق سے بولی تھی۔

”بھائی! امیری دانیال سے بات کرو ایں۔“

”دانیال سے؟“

”سیمانے اچھا بھلا کر لیا تھا۔“

”جی!۔“

”کیا بات کرو گی دانیال سے؟ میرا مطلب ہے، وہ تو تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“

”سیمانے کہا تو وہ پریشان ہو گئی۔“

”کیوں؟“

”یہ تم مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو.....؟ اپنے آپ سے پوچھو۔ میں نے تو رات بھی دانیال سے کہا تھا کہ تمہارے پاس چلا جائے، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”وہ بے صبری دکھا گئی۔“

”لیکن یہ کہہ کر تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”سیما کے شہزادہ انداز پر وہ چیخ پڑی۔“

”جھوٹ بول رہی ہیں آپ! میں آپ کی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ آپ دانیال کو بلائیں، انہیں جو کہنا ہو مجھ سے کہیں۔“

”فکرت کرو، تم سے بھی کہہ دے گا۔“

سیمانے کہہ کر فون بند کر دیا تو اس نے بے اختیار کر ٹیل پر ہاتھ مار کر ”بیلا، بیلا“ کہا پھر فون رکھ کر چلی تو خوبصورت لڑکی اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

”ابا! وہ..... بھائی غلط کہہ رہی ہیں۔“

گھبراہٹ میں اس کے منہ سے یہی نکلا تھا۔ خوبصورت صاحب نے بڑھ کر اس کا سراپہ بننے سے لگا یا پھر اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ بیٹھی اور نرمی سے پوچھنے لگے۔

”کیا مسئلہ ہے بیٹا.....؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ابا!..... میں دانیال کو فون کر رہی تھی، لیکن بھائی دانیال کو مجھ سے بات نہیں کرنے دے

ا۔“

”نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ڈپریشن ظاہر ہو رہا تھا۔“

”کیوں.....؟ وہ کیوں نہیں بات کرنے دے رہیں.....؟“

”خوبصورت صاحب ہنوز نرم تھے۔“

”چاہتے ہیں ابا!..... بس اپنی طرف سے چاہتے ہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ مجھے ان کا اعتبار نہیں ہے ابا!.....“

”میں تو دانیال سے بات کروں گی۔“

”وہ اب بچل گئی تھی۔“

”ہاں تو کر لینا دانیال سے بات، چہریشان کیوں ہو رہی ہو.....؟ یوں بھی اس وقت دانیال آفس میں

ا۔“

”خوبصورت صاحب نے اس کا سر تھک کر کہا کہ تو وہ فورا بولی۔“

”میں آفس فون کرتی ہوں۔“

”ابھی نہیں بیٹا!..... ابھی تم پریشان ہو، غصے میں ہو، دانیال سے بھی اسی طرح بات کرو گی جیسے اس کی

ماہی سے کر رہی تھی۔ شام میں دانیال گھر آ جائے، پھر آرام سے بات کرنا۔ ٹھیک ہے!.....“

خوبصورت صاحب نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ جڑ بڑھ کر ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

واپس کا تمام راستہ جب انہوں نے کوئی بات نہیں کی، جب اسے بڑا عجیب سا لگا۔ دل چاہا کہ، جب مجھ سے بات نہیں کرنی تھی تو لینے کیوں آئے.....؟

لیکن پہلے ہی سر طے پر ٹوکن اچھا نہیں لگا۔ سو جا گھر جا کر پوچھ گئی، لیکن اس کی نوٹ نہیں آئی۔ کیونکہ

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی بات کا جواب مل گیا۔ اماں اسے دیکھ کر جہانزیب سے کہنے لگیں۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ ذہن کو لے کر جلدی آنا، پھر بھی اتنی دیر کر دی.....؟ اب بتاؤ بھلا، یہ کوئی

دقت ہے کہیں جانے کا.....؟“

”بس!.....! اور ہو گئی۔“

وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ اماں کے پاس تخت پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”آپ نے بلایا ہے مجھے.....؟“

”ہاں!.....! چہا گئیر کے رشتے کے لئے جانا تھا۔ ادھر جہانزیب دو چار روز میں جدہ جانے والا ہے۔“

میں نے سوچا کہ اس کے جانے سے پہلے جہانگیر کی مفتی کروں۔ اسی بہانے قریبی عزیزوں سے توجہنازیب مل لے گا، پھر جب سال بھر بعد جھٹی پر آئے گا، جب جہانگیر کی شادی کر دیں گے۔

”ہاں۔۔۔!“

وہ مرجھا گئی تھی، جیسی اس کے منہ سے جھکی تھی آواز نکلی۔

”اب کل ہی چلیں گے۔“

”جی۔۔۔! لیکن کیا اتنی جلدی مفتی کا انتظام ہو جائے گا۔۔۔؟“

”کوئی بہت بڑا انتظام تو نہیں کرنا۔ بس اپنے خاص خاص لوگ ہوں گے۔“

اس نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جہانزیب اطمینان سے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ سامنے پریس کیم کھلا رکھا تھا، جس میں سے کاغذات نکال نکال کر وہ اس جگہ رکھ رہے تھے جہاں اسے سہا تھا۔ اس نے بہت خاموشی سے اپنا بیک الماری میں رکھا، پھر اپنی جگہ خالی ہونے کے انتظار میں صوفے پر جا بیٹھی۔

کافی دیر بعد جب انہوں نے اپنی چیزیں سمیٹ کر سراونچا کیا، جب براہ راست نظراس پر پڑی۔ نیند سے بوجھل آنکھوں کو وہ زبردستی کھولے لیٹھی تھی۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً اٹھے اور لائٹ آف کرنے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

سیدانے اپنی طرف سے ٹانیہ کو جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ ٹانیہ اس کی باتوں کی تصدیق کے لئے دانیال کو فون ضرور کرے گی۔ وہ تو اچھا بڑا آدمی تھا، آفس میں نہیں گیا تو خدا بیک اس کا قصہ یوں کھل چکا ہوتا۔ شاید یہ اس کی قسمت اچھی تھی یا پھر ٹانیہ کی بد قسمتی کہ سیدانے کو مزید موقع مل گیا تھا، اور اپنی اگلی چال سوچتے ہوئے اس نے مکاری سے ردنا شروع کر دیا، اور اسی طرح روتے ہوئے دانیال کے کمرے میں آ گئی تو وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا بھائی۔۔۔؟ آپ رو کیوں رہی ہیں۔۔۔؟“

”میں ٹانیہ کو خود خوشی سے بیاہ لاتی تھی، لیکن اس نے میرا ذرا لالچا نہیں کیا۔ مجھے جھوٹی مکاریا، یہ بھی نہیں سوچا، میں عمر میں اس سے کتنی بڑی ہوں۔“

وہ روتے ہوئے بولے چلی جا رہی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کب ہوا بھائی۔۔۔؟“

دانیال کو اس نئی بات نے مزید پریشان کر دیا تھا۔

”ابھی میں نے اسے فون کیا تھا کہ میں اسے لینے آ رہی ہوں، لیکن جواب میں اس نے مجھے دوکڑی

کر کے رکھ دیا۔ ٹھیک ہے، اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی تو تم اسے الگ گھر لے دو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھائی۔۔۔؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر آئے گی تو اسی گھر میں، ورنہ جیسی رہے وہیں، اور آپ خدا کے لئے روٹا بند کریں۔“

وہ ایک دم فیسے میں آ گیا تھا۔

”مجھے سے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی۔ بہت دل دکھا ہے میرا۔“

سیدانے مزید اشتعال دلانے سے باز نہیں آئی۔

”بس کریں بھائی۔۔۔! اول تو اب میں دکھاؤں گا ان کا۔“

اس نے کہا کہ کمرے میں فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو دانیال۔۔۔؟ کس فون کر رہے ہو۔۔۔؟“

سیدانے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لیتا چلا، لیکن دانیال نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور نمبر پیش کر دیے۔ دوسری طرف خوبصورت صاحب نے فون اٹھا لیا تھا اور ان کی آواز سنتے ہی دانیال غصے سے بولا تھا۔

”کیا سمجھتی ہے آپ کی بیٹی اپنے آپ کو۔۔۔؟ میری ماں جیسی بھائی کے ساتھ بدتمیزی کرے گی اور میں برداشت کر لوں گا۔۔۔؟ ہرگز نہیں۔۔۔؟ ٹانیہ نہیں رہنا چاہتی میری بھائی کے ساتھ تو آپ بٹھائے رکھیں اسے اپنے پاس، میرے گھر میں اب اس کی جگہ نہیں ہے۔“

دانیال۔۔۔!“

سیدانے اظہار اسے ٹوکا۔

”آپ کہہ دیں ٹانیہ سے، میری بھائی کو ٹوکا کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ اب روٹی رہے ساری زندگی۔“

دانیال نے کھٹ سے فون رکھا تب وہ اس پر بگڑ گئی۔

”یہ تم نے کیا کہہ دیا دانیال۔۔۔! پاگل تو نہیں ہو گئے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! ہو گیا ہوں پاگل۔۔۔!“

وہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے ہی نکل گیا تھا۔ سیدانچے آئی تو پہلے دانیال کے جانے کا اطمینان کیا، پھر آرام سے بیڈ پر کھانا کھا کر ڈالا اور چھوٹے ہی بولی تھی۔

”دادو مجھے، میں نے ٹانیہ کا یہ صاف کر دیا ہے۔“

”جج آپ۔۔۔؟“

ادھر حنا خوشی سے بڑ جوش ہو گئی تھی۔

”اور کیا۔۔۔؟ بہت پر پڑنے لگے آئے تھے اس مہینے کے، میں اگر فوراً ایکشن نہ لیتی تو سب اٹنا ہو

سیمانے فخر یہاں کا رٹا نہ جتایا تو حساسہ راہ کر پوچھنے لگی۔

”اچھا..... کیا کر رہی تھی سمنی؟“

”دانیال کو میرے خلاف بیکار رہی تھی، اور مجھ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے کہا، بچو آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا مجھ سے منہ میڑھا کرنے والا۔“

”ابھی کہاں ہے؟“

حناکو سب جاننے کی جلدی تھی۔

”بچی ہے سیکے، اور دانیال نے کہہ دیا ہے اس کے باپ سے کہ بھڑائے رکھیں اپنی بیٹی کو اپنے پاس۔“

سیمانہ بنا کر سختی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا آپا.....! میرا مطلب ہے، ابھی تو اس کی اماں کا انتقال ہوا ہے اور میرا خیال تھا،

دانیال اس کی دلجوئی میں لگا ہوگا۔“

حنانے کہا تو وہ غوت سے بولی۔

”ارے.....! میں نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ خیر.....! اب دلجوئی تم کرو گی دانیال کی،

سبھی.....؟ اور دیکھو۔“

کمال حسن کو آتے دیکھ کر سیمانے بے اختیار رون رکھ دیا اور ان کے سلام کا جواب دے کر پوچھنے لگی۔

”چائے لاؤں آپ کے لئے؟“

”ابھی نہیں.....!“

وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے ڈک کر پوچھنے لگے۔

”دانیال کہاں ہے؟“

”چائیں.....! شاید خواجہ صاحب کی طرف گیا ہو۔ ٹانیہ بھی تو ابھی وہیں ہے۔“

سیمانے حاضر دماغی سے بتایا تو کمال حسن یوں ہی سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”اف.....! انہیں بڑی فکر ہے۔“

سیمانے بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکا۔ پھر کچن کا رخ کیا۔ کھانے کی تیاری کے دوران اس کا ذہن مسلسل

اپنی کامیاب پاننگ کو مزید مستحکم بنانے کی سوچتا رہتا تھا، جب ہی جیسے ہی دانیال آیا تو وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے

میں آتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے دانیال؟“

”آپ نے کیا کہا.....؟ کیا بتایا بھائی کو؟“

دانیال نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

”کچھ نہیں.....! میں نے یہی کہا کہ تم بتا کر نہیں گئے۔“

”ہاں.....! ابھی بھائی کو کچھ مت بتائیے گا۔ ٹانیہ کا پوچھیں تو کہہ دیجئے گا، وہ ابھی وہیں رہے گی۔“

دانیال کہہ کر وادش روم کی طرف بڑھا تھا کہ وہ نکلا کر بولی۔

”سنو.....! وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی کو چاہتا چلنا چاہئے کہ خواجہ صاحب.....“

”بھائی.....! پلیز، مت نام لیں ان لوگوں کا، اور بھائی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دانیال سختی سے کہہ کر وادش روم میں بند ہو گیا اور سیمانہ کو چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سر جھکا گئے دھیرے دھیرے خواجہ صاحب کا سردہاری تھی لیکن آنسو روانی سے چھلک رہے تھے،

جنہیں وہ بار بار صاف کر رہی تھی۔ خواجہ صاحب آنکھیں بند کئے لیٹے تھے، پھر بھی اس کی حرکت انہیں محسوس ہوری

تھی اور اس کے آنسو جیسے ان کے دل پر گر رہے تھے۔ کتنی دیر بعد گلیں سب میں بولے تھے۔

”روٹی کیوں ہو بیٹا.....؟ تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔ مرجاؤں حنا بھوتنا۔“

”ابا.....!“

وہ تڑپ گئی۔

”بس کرو، رو کر اپنی اور میری آزمائشوں کی عمر مت بڑھاؤ۔“

خواجہ صاحب نے اپنی پیشانی پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا تو وہ اسی شدت سے روتے ہوئے

بولی۔

”ابا.....! دانیال ایسے نہیں تھے، انہیں بہکا یا گیا ہے۔“

”اگر اسیا ہے تو پھر اسے خود ہی سمجھنے دو۔ اس کی قسمت میں اگر ٹھوکر کھسی ہے تو میں اور تم اسے ٹھوکر کھانے

سے نہیں بچا سکتے۔“

”کوشش تو کر سکتے ہیں ناں ابا.....!“

وہ فوراً بولی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں.....!“

خواجہ صاحب ماپوسی سے لٹلی میں سر ہلانے لگے۔

”پھر ابا.....! میں کیا کروں۔“

”میر بیٹا.....! صبر، اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ کر صبر کرو گی تو اجر پائے گی۔“

اسے تسلی دیتے ہوئے خواجہ صاحب کے سینے سے آہ خارج ہوئی تھی۔

”میری وجہ سے آپ کا کتنا دل دکھا ہے!۔۔۔!“

اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اب کوشش کرنا ہے آپ کا سر نہ جھکنے دیتا۔“

خواجہ صاحب کے لیے میں بالاکار درو تھا، پھر ترپ گئی۔

”نہیں!۔۔۔! جب تک دانیال اپنے رویے کی آپ سے معافی نہیں مانگیں گے، میں اس کا نام بھی نہیں

لوں گی۔“

”اچھا جاؤ، دیکھا شوہن ناٹھ جائے۔“

خواجہ صاحب نے کہا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی، اور پھر اس نے خواجہ صاحب سے توجہ دیا تھا

کہ وہ دانیال کا نام بھی نہیں لے گی، لیکن دل کا کیا کرتی جس کی ہر دھڑکن میں وہ بے ہوا تھا۔ بظاہر تفتی انجان لیکن

شدت سے اس کی منتظر تھی۔ اس وقت ڈور ٹیلر جینے پر اس نے بھاگ کر گیت کھولا تھا اور آگے راہ کو دیکھ کر وہ مشکل

اپنی کیفیت چھپا کر اس کے ہنسنے لگی تھی۔ پھر اس کے ساتھ اندر آئی تو راہ جیسے سوچ کر اور خاص اسی مقصد سے آئی تھی

کہ خواجہ صاحب کے پاس بیٹھنے ہی کہنے لگی۔

”اہ!۔۔۔! آپ کو دانیال سے ٹانہ کا قصور تو پوچھنا چاہئے تھا۔ ایسا کیا کیا ہے ٹانہ نے جو وہ یوں جھٹے

سے ہی اکھڑ رہا ہے۔۔۔؟“

خواجہ صاحب نے ایک نظر راہ کو دیکھ کر سر جھکا لیا، بولے کچھ نہیں، تو وہ پوچھنے لگی۔

”میں دانیال سے بات کروں!۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔!“

خواجہ صاحب فوراً منع کر کے پھر زنی سے بولے تھے۔

”نہیں بیٹا! ابھی نہیں۔“

”کیوں!۔۔۔؟ ابھی کیوں نہیں۔۔۔؟“

راہ کی جرح پر خواجہ صاحب گہری سانس کھینچ کر کہنے لگے۔

”تمہیں یاد نہیں بیٹا!۔۔۔! تمہارے معاملے میں تمہاری اماں کتنی تھیں، جلدی مت کرو، ورنہ وہ لوگ کہیں

گئے، ہم چاروں بچی کو نہیں کھلا سکتے۔“

”ٹانہ کا معاملہ اور ہے!۔۔۔!“

راہ تنگ پڑ کر بولی تھی۔

”وہاں دانیال کو ٹانہ کے خلاف بہکایا جا رہا ہے۔“

”دانیال کوئی دودھ پیتا کچھ نہیں ہے۔ پڑھا لکھا، سمجھدار آدمی ہے۔ وہ کیوں بہکاوے میں آ رہا ہے۔؟“

اسے نہیں پتا، اس کی بیوی کس حال میں ہے۔۔۔؟ اور ابھی کس سانچے سے گزری ہے۔۔۔؟“

خواجہ صاحب کو غصے میں آتے دیکھ کر راہ خاموش ہو گئی۔ پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اچھا!۔۔۔! یہ بتائیں، اب شوہن کی دیکھ بھال آپ کیسے کریں گے۔۔۔؟ آپ کے لئے تو مسئلہ

”ا۔۔۔!“

”کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب یہ طے ہے کہ شوہن یہیں رہے گا تو اب تم اس کی فکر چھوڑ دو۔ تم بس اپنا گھر

”ا۔۔۔!“

خواجہ صاحب کے دو ٹوک انداز پر راہ پھر خاموش ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆

دانیال، حنا کی زلیف گرہ گیر کا امیر ضرور ہو گیا تھا، لیکن ٹانہ کی اپنی زندگی سے نکلنے کا اس نے سوچا بھی

میں تھا، جب یہ وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ یسا کہ بہکاوے میں آ کر خواجہ صاحب سے بدتمیزی کرنے کے بعد

اب اس کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ خود ٹانہ کے پاس جاتا۔ البتہ سوچنا ضرور تھا۔ اس وقت وہ آفس سے لوٹا تو

یہاں کو دیکھتے ہی بے اختیار پوچھا تھا۔

”بھائی!۔۔۔! ٹانہ کا فون تو نہیں آیا تھا۔۔۔؟“

یہاں تک ضرور لیکن فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔

”نہیں دانیال!۔۔۔! میں نے کتنی بار فون کیا، لیکن ادھر سے کسی نے اٹھا ہی نہیں۔“

”ظاہر ہے، اب کیوں وہ یہاں کا فون اٹھانے لگے۔۔۔؟ میں نے بھی تو حد کر دی۔ مجھے خواجہ صاحب

سے بدتمیزی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“

اس کی پیشینامی پر سماندر ہی اندر تھملا کر بولی تھی۔

”ہاں!۔۔۔! غصے میں تمہیں احساس ہی نہیں ہوا، اس سے بات کر رہے ہو۔ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟“

دانیال نے یوں ہونٹ پیچھے پیچھے جیسے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہو، اور اس سے پہلے کہ وہ

طافی کی بات کرتا، یہاں پہنچا پڑی۔

”اگر تم کہو تو میں چلی جاؤں ٹانہ کے پاس، خواجہ صاحب سے معذرت بھی کر لوں گی۔۔۔؟“

”آپ۔۔۔؟ آپ کیوں معذرت کریں گی۔۔۔؟ غلطی میری ہے، معافی بھی مجھے ہی مانگنی چاہئے۔“

اس نے کہا تو یہاں سیمانڈی گئی۔

”ہاں!۔۔۔! تم بھی مانگ لینا معافی، لیکن پہلے مجھے جانے دو۔ خواجہ صاحب کے موڈ کا بھی پتا چل

جائے گا۔“

”ہوں!“

اس نے چند لمحوں کا سوچا، پھر سہا کو دیکھ کر بولا تھا۔

”تھک ہے بھائی! پہلے آپ چلی جائیں۔“

”اور دیکھو، اب تم خدا کے لئے غم نہ ہو دو۔ اپنے آپ کو سنیا لو۔ ماشاء اللہ! بچے کے باپ ملے

والے ہو۔“

سینا نے چالاکی سے سر زدن کرتے ہوئے کہا تو اس نے مسکرائے پر اکتفا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خواجہ صاحب کو شدید دھچکا لگا تھا۔ اس وقت وہ اپنی پیشین گوئی کے خلاف ثابت ہونے لگے تھے کہ انہی گاڑی میں دانیال کے ساتھ جانی بھی نظر آئی تھی۔ کتنی دیر تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر جیسے سارا معاملہ کروہ اپنا کام بھول کر سیدہ سے راجہ کے پاس آئے تھے۔ گو کہ مسافت طویل تھی، لیکن اتنی جلد بھی نہیں کہ وہ غلط ہو گئے تھے۔ راجہ فوراً ان کے لئے پانی لے آئی تو انہوں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”کہاں سے آ رہے ہیں اب!؟“ اتنے تھکے تھکے لگ رہے ہیں۔ فون کر دیتے، میں گاڑی بھجوا دیتا!

”کہاں سے ان کے پاس بیٹھے ہو کہا تو ان کے ہونٹوں پر دہشت مسکراہٹ چمکی تھی۔

”نہ بیٹا! میری عادتیں خراب مت کرو۔ ایک باگڑی میں بیٹھ گیا تو پھر سفر کہاں کر پاؤں گا۔

”اچھا، آپ آرام سے نہیں، میں آپ کے لئے جوس لاتی ہوں۔“

راجہ اٹھنے لگی، لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں بیٹا! اتنم بیٹھو میرے پاس، میں تم سے ایک شورہ کرنے آیا ہوں۔“

”جی۔۔۔!“

راجہ پوری طرح متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”کوئی پریشانی کی بات ہے اب!۔۔۔“

”نہیں بیٹا۔۔۔!“

خواجہ صاحب کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہوئی تھی، جس سے دل پر پڑا بوجھ،

مرک گیا۔ جب وہ کہنے لگے۔

”بیٹا! میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میری ریٹائرمنٹ میں اب بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔“

لے میں نے سوچا ہے کہ میں اپنا پتہ گھر کراچی کر دوں تو منزل گھر لے لوں۔ ایک حصہ کرایے پر اٹھا دوں گا،

آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا۔“

”خیال تو اچھا ہے اب!۔۔۔ لیکن یہ گھر کیوں بیچتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، اسی کے اوپر بنالیں۔“

راجہ نے تائید کے ساتھ مشورہ دیا تو خواجہ صاحب ہایسی سے بولے تھے۔

”مشکل ہے بیٹا! اوپر بنوانے کے لئے ہمت چاہئے۔ میں کہاں مزدوروں کے پیچھے بھاگوں

گا۔۔۔؟“

”یہ تو ہے۔“

راجہ نے پھر تائید میں سر ہلایا۔

”جتنے میں یہ گھر کے گا بیٹا!۔۔۔ اتنے پیسوں میں کسی نئی کالونی میں اچھا دو منزلہ گھر مل جائے گا۔“

”بالکل مل جائے گا، اور اب!۔۔۔! تائید کا کچھ بنا۔۔۔؟ دانیال آیا۔۔۔؟“

راجہ نے پوچھا تو خواجہ صاحب آنسو سے سر ہلا کر بولے تھے۔

”نہیں بیٹا!۔۔۔! وہ اب نہیں آئے گا، وارا راجا ابھی تو میں اب تائید کو اس کے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔“

”کیوں اب!۔۔۔؟ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“

راجہ پریشان ہوئی تھی۔ جب خواجہ صاحب نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسے بتا دیا۔ آخر میں

کہنے لگے۔

”میں اسی لئے وہ گھر، وہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے سے تائید کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ ڈورنیل پر

اس امید پر بھاگ جاتی ہے کہ شاید دانیال آیا ہوگا۔ اسی طرح ٹیلی فون پر چلتی ہے۔ آس و زاس نے اسے ٹھنڈا کر دیا

ہے۔ میں اپنی بیٹی کو ڈورنیل سے جاؤں گا۔“

خواجہ صاحب کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ راجہ نے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ کہنے سے وہ بھی

قاصر تھی۔

☆ ☆ ☆

شوہن سو گیا تھا۔ تائید نے آرام سے اسے بیڈ پر لٹایا پھر چادر اوڑھائی تھی کہ ڈورنیل بیٹھ گئی۔ وہ اس

خیال سے کہ کہیں تیل کی آواز سے شوہن اٹھ نہ جائے، ہلوا بھائی کی گئی تھی، اور جب گیٹ کھولا تو آگے سے کاکھڑے

دیکھ کر جانے کیوں اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”اندیشہ نہیں آنے دوگی۔۔۔؟“

سیما کے نظریہ انداز پر چونک کر ایک طرف ہٹی تھی۔

”جی آئیے۔۔۔!“

پھر گیت بند کر کے وہ سیما کے لئے ڈرائنگ روم میں آئی اور بیٹے کا اشارہ کیا، جسے نظر انداز کر کے سیما بولی تھی۔

”اے اپنا بولاؤ، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“

”ابا تو کھر نہیں ہیں۔“

اس نے لہجے کو ساٹ بنایا تھا۔

”کہاں گئے ہیں؟“

”آپ کو کیا بات کرنی ہے؟ مجھ سے کریں۔“

اس نے فوراً کہا۔

”تم سے؟“

سیما ہنک آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”سن سکو گی؟“ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟“

”آزما دیکھئے!“

وہ سیما کے سامنے کمر نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

”اچھا؟“

سیما استہزا اپنے ہنسی تھی۔

”مگر تم آرمش میں پوری نہ آتیں تو۔۔۔۔۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

دو تاج ہو گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔! امر نے کو تو صرف دعوے ہوتے ہیں۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔“

”آپ اپنی بات کریں، کیسے آتا ہوا۔۔۔۔۔؟“

اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔

”دانیال کا پیٹام لائی ہوں۔ وہ تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔“

سیما نے انتہائی سفاکی سے اسے زلزلوں کی زد میں دھکیل دیا تھا۔

”نہیں!“

وہ ساری توانائیاں مجتمع کر کے بھی خود کو نہیں سنہلایا، صوفے کا سہارا لیا تھا کہ وہ بیٹھ گئی تھی۔

سیما نے اسی سفاکی سے اسے گرتے ہوئے دیکھا پھر وہاں سے نکل گئی تھی۔

”ابا۔۔۔۔۔!“

اس کے وجود میں دردی نہیں اٹھنے لگی تھی۔ بے پروا مدگار ترپتے ترپتے وہ اندھروں میں ڈوب گئی۔ ابا اس ہوش آیا تو فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔؟ چنبی کرے میں اس کی خالی خالی نظریں، ابا اصرار ہو کر رہی تھیں کہ دروازہ کھلنے پر وہ ادھر دیکھنے لگی۔ رابعہ اور اس کے پیچھے ابا آ رہے تھے۔ اسے پھر بھی کچھ اہل نہیں آیا۔

”مبارک ہو۔۔۔۔۔! اللہ نے تمہیں بہت پیاری بیٹی دی ہے۔“

رابعہ نے قریب آ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ایک ہل میں اس کی نظروں کے سامنے جانے کیا لکھو م کیا تھا۔

”بیٹا۔۔۔۔۔! دانیال کو اطلاع کر دوں۔۔۔۔۔؟“

خوبصاحب نے اس سے پوچھا تو وہ ایک دم خائف ہو کر بولی تھی۔

”نہیں ابا۔۔۔۔۔! نہیں۔۔۔۔۔!“

”کیوں نہیں؟“ اسے پتا چلنا چاہئے کہ وہ بھی بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔“

خوبصاحب کے لہجے میں جانے کیا تھا، وہ ترپ کرکٹ میں سر ہلانے لگی۔

”ابا نہیں۔۔۔۔۔! دانیال کو پتا چلا تو وہ مجھ سے میری بیٹی چھین کر لے جائیں گے۔“

”کیوں چھین کر لے جائے گا۔۔۔۔۔؟“

رابعہ نے فوراً کہا تھا۔

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔! کیوں چھین کر لے جائے گا۔۔۔۔۔؟“

”آپ کو نہیں پتا ابا۔۔۔۔۔! بس، آپ ابھی کسی کو نہ بتائیں۔ آپ کو میری قسم ابا۔۔۔۔۔! آپ کسی کو نہیں

ہیں گے۔“

وہ رونے لگی تو رابعہ نے پریشان ہو کر خوبصاحب کو دیکھا، وہ اپنی جگہ پریشان تھے۔

”فانیہ۔۔۔۔۔! فانیہ۔۔۔۔۔! ارو کیوں رہی ہو۔۔۔۔۔؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا۔۔۔۔۔؟ تاؤ ناں۔۔۔۔۔!“

رابعہ نے اسے پکارتے ہوئے بولی مشکل سے چپ کرایا، پھر رونے کی وجہ پوچھی۔

”صبح دانیال کی بھادج آئی تھیں۔“

وہ کڑک کر بتا رہی تھی۔ رابعہ اور خوبصاحب سناٹے میں کھڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

”آپا۔۔۔۔۔! دانیال تو پیلے کی طرح ہو گیا ہے۔ روڈ، سپاٹ، سارا راستہ مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ میری

افوں کے جواب میں بھی بس ”ہوں، ہاں،“ کرتا رہا۔“

حنا سلگ سلگ کرتا رہی تھی۔ میا کو اس پر غصہ آ گیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے لفٹ لینے کی؟ ابھی تو تمہیں اس کے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ ابھی اس کا ذہن الجھا ہوا ہے۔ تم زیادہ آؤ جاؤ گی تو اس کی الجھن سلجھنے کا خدشہ“

”سچی؟“

”میا آخر میں زنج ہوئی تھی۔“

”تمہیں.....! میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔“

حنا جھنجھلائی۔

”اچھا.....! ابھی تم جاؤ، اور جب تک میں نہ کہوں، مت آنا۔“

میانے زبردستی اسے بھیج دیا، کیونکہ دانیال کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اور وہ جو کچھ ٹائیپ سے کہہ

تھی، تو اسے خدشہ تھا کہ کہیں ٹائیپ نے تقدیر کے لئے دانیال کو فون نہ کر دیا ہو۔ وہ اسی پریشانی میں مگزی

دانیال کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”السلام علیکم.....“

دانیال نے سلام کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہی جو سوچ چکی تھی، بلا ارادہ بولنا شروع ہو گئی تھی۔

”میرا تو خیال تھا قتل ٹھکانے آگئی ہوگی ان لوگوں کی، لیکن نہیں.....! خوبصورت صاحب کا دماغ تو“

آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں، بس اپنی کہتے رہے۔“

”سنگ..... کیا کہتے رہے؟“

وہ جو پہلے ہی الجھا ہوا تھا، مزید الجھ گیا۔

”وہی تمہاری اس روز کی بد تقریر پر مسلسل ملن ملن کرتے رہے، پھر کہنے لگے۔ میری بیٹی کے

کی نہیں ہے، جیسے میں نے راجہ کو یاد دیا، ٹائیپ کو بھی.....“

دانیال کے ہونٹ ہنسنے پر سارا ایک ٹکڑا خاموش ہوئی، پھر کہنے لگی۔

”تو یہ.....! بڑا بول بولتے ہوئے ذرا خدا کا خوف نہیں آیا بڑے میاں کو، اور وہ ٹائیپ، اے گاہ،

نہیں آئی باپ کی ہاں میں ہاں ملائی رہی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، لیکن کیا کرتی؟ میں تو خون کے گھونٹ

گئی۔“

”کیوں؟.....؟ کہہ دیتیں آپ بھی کہ دانیال کو بھی کی نہیں ہے۔ مرنے میں جاؤں گا میں اس کے علم۔“

وہ غصے سے کہہ کر زکا نہیں، تیزی سے بیڑیاں چڑھ گیا تھا۔

”اوہ شکر.....!“

میانے سینے پر ہاتھ رکھ کر سانس کھینچا، پھر فوراً کچن کا رخ کیا اور جب تک کمال حسن آتے، اس نے

ماہل پر لگا دیا تھا۔

”وہ..... ٹائیپ تک سینے رہے گی؟“

کمال حسن نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا تو میا بظاہر سرسری انداز میں بولی تھی۔

”ڈیلیوری تک.....!“

”کیوں؟“

”کیونکہ ان کے ہاں کارواج ہے کہ بیٹی کی پہلی ڈیلیوری سینے میں ہوتی ہے۔“

میانے کمال ہوشیاری سے بات بٹائی تھی۔

”عجب رواج ہے۔ دانیال کی تو پر بڑے لگ جائے گی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔“

کمال حسن نے کہتے ہوئے سانس کی دھڑکی اٹھائی تھی۔

”ہاں.....! کافی ڈسٹرب ہو گیا ہے دانیال۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

کمال حسن نے کہا تو میانے ٹھنک کر پوچھا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”دانیال کو دیکھ رہا ہوں، پریشان پھر رہا ہے۔“

”ہاں.....! حالانکہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ شکر ہے، سب نارمل ہے۔“

میانے اطمینان سے ہو کر کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خوبصورت صاحب نے اسٹیٹ ایجنٹ کی خدمات حاصل کیں تو ان کے سارے کام بہت جلدی ہو گئے تھے۔

ان کی گھر تک کیا اور دوسرا گھر بھی خرید لیا۔ یہ سارا مقدمہ کا مکمل تھا۔ شاید ٹائیپ کی قسمت میں ہی لکھا تھا کہ وہ سازش کی

ایجنٹ چڑھ گئی تھی۔ اس سب سے دُعا چارج ہوئی تو خوبصورت صاحب اسے نئے گھر میں لے آئے تھے۔

”اپا.....؟“

وہ حیران ہوئی۔

”یہ کس کا گھر ہے؟“

”ہمارا ہے، اب یہی ہمارا گھر ہے بیٹا.....! کیسا ہے؟“

خوبصورت صاحب نے نظریں چراتے ہوئے تبا کر پوچھا تھا۔

”اچھا ہے، لیکن بابا! میں بھی نہیں۔“  
وہ اچھے لگتی تھی۔

”اس میں نہ جھنجھنے کی کیا بات ہے بیٹا؟ میں نے اس گھر کے بدلے یہ گھر لے لیا ہے۔“  
خوبصاحب یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔  
”وہ گھر بچہ ڈیا؟“

وہ افسوس سے بولی تھی۔ خوبصاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ماتا ہوں بیٹا! اس گھر سے میری تمہاری سب کم کی یادیں واپس تھیں، لیکن زندگی اس موڑ پر آئی ہے کہ آگے کا سفر طے کرنے کے لئے ان تکلیف دہ یادوں سے چھٹکارا پانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔“  
خوبصاحب کا اپنا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔ ثانیہ نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”جاؤ بیٹا! تم آرام کرو۔“

خوبصاحب کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور وہ اپنے کمرے میں آئی تو شوہنی کو ننگی مشعل ملے  
ساتھ کیلئے دیکھ کر بے ساختہ سسکائی، پھر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

”بتا ہے شوہنی! یہ کون ہے؟“

شوہنی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔ آپ اس کے ساتھ کیلئے گئے ہیں؟“

”کیلئے گا۔“

شوہنی مشتاق ہو گیا تھا۔

”تھک تو نہیں کرو گے؟ اس سے؟“

”نہیں!“

”شباباش!“

اس نے شوہنی کا گال چوما تو وہ پوچھنے لگی۔

”خالہ! بیڈول (Doll) ہے؟“

”ہاں! آپ کی ڈول ہے۔“

”ڈول کا نام کیا ہے؟“

”ڈول کا نام ہے مشعل، کیا نام ہے؟“

اس نے بتا کر پوچھا۔

”مشال!“

شوہنی کی زبان پر نام نہیں چڑھا۔

”مشعل!“

وہ ہنسنے لگی۔

پھر ادھر وہ گھر کو بیٹھ کرنے میں لگی تھی اور ادھر راجہ صاحب گھر سمیٹ کر میاں اور اس کے بچوں کے

ساتھ ڈوبی روانہ ہو گئی۔

جاتے ہوئے وہ بار بار خوبصاحب سے یہی کہہ رہی تھی کہ انہیں شوہنی کو نہیں روکنا چاہئے تھا۔ اب ثانیہ

دو بچوں کو کیسے سنبھالے گی؟

”جیسے تم دو بچے سنبھالو گی۔“

خوبصاحب اطمینان سے بولے تھے۔

☆ ☆ ☆

”میاں رہ بجے، سو جانا چاہئے۔“

کمال حسن نے ریوٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف

جانے لگے تھے کہ وانیال کو آتے دیکھ کر ڈک کر پوچھنے گئے۔

”تم کہاں، سرال سے آ رہے ہو؟“

وانیال نے سیما کو دیکھا اور اس کے نظریں جڑانے پر بولا تھا۔

”میں بھائی! سرال کو میں نے خبر باؤ کہہ دیا ہے، ہمیشہ کے لئے۔“

”کیا مطلب؟“

کمال حسن کے پیشانی پر پل پڑ گئے تھے۔

”مذاق کر رہا ہے۔“

سیما نے پوچھا کہ کہا تو وانیال یک دم دڑو ہو گیا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا بھائی! اچھ کہہ رہا ہوں۔“

”میرا خیال ہے، ثانیہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے، جب ہی اُنکا سیدھا بول رہا ہے۔“

سیما پھر بولنے سے باز نہیں آئی۔

”کیوں وانیال؟“

کمال حسن نے تصدیق کے لئے وانیال کو دیکھا۔

”بھائی کو یہی لگتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔“



دانیال نے کہا تو کمال حسن غصے سے دھاڑے تھے۔

”پھر کیسا ہے؟ بتاؤ مجھے، کیا معاملہ ہے؟ کیوں بھڑا رکھا ہے تم نے ٹانیہ کو سیکے؟“

”میں نے نہیں بھڑایا، اسے خود شوق تھا سیکے پیٹنے کا، بھئی رہے ساری زندگی وہ ہیں۔“

دانیال بھی غصے سے کھتا تیزی سے نکل گیا۔

”دماغ خراب ہے اس کا، میں خود جاؤں گا صبح ٹانیہ کے پاس۔“

کمال حسن کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ پھر صبح آفس جاتے ہوئے وہ پہلے خواجہ

صاحب کے گھر گئے لیکن وہاں تالا لگا ہوا تھا اور شام میں وہ اپنی پرہی تالا دیکھ کر وہ اچھٹے ہیں گھر گئے تھے۔

”خواجہ صاحب لوگ پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں؟“

گھر آتے ہی انہوں نے سیسا سے کہا تو وہ اندری اندر خائف ہو کر بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”میں صبح گیا تھا اور آفس سے واپسی پر بھی، لیکن خواجہ صاحب کے گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔“

انہوں نے بتایا تو سیسا اطمینان سے ہو کر بولی۔

”اچھا! ہو سکتا ہے اپنی بڑی بیٹی رابعہ کے ہاں گئے ہوئے ہوں۔“

”ہوں!“

انہوں نے چند لمبے سوچا، پھر سیسا سے پوچھنے لگے۔

”تمہیں پتا تو ہو گا کہ دانیال اور ٹانیہ کے درمیان کیا جھگڑا چل رہا ہے؟“

”ہاں! لیکن وجہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ دانیال سے پوچھتی ہوں تو وہ مال جاتا ہے، اور ٹانیہ بھی کچھ

نہیں بتاتی۔“

سیسا اب سنہیل کر بول رہی تھی۔

”کیا کہتے ہیں دونوں؟“

کمال حسن کا اس معاملے کو اہمیت دینا سیسا کو بری طرح کھل رہا تھا۔

”دانیال نے تو کھل آپ کے سامنے جو کہا اور ٹانیہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔

اتنا کھمایا میں نے، لیکن وہ تو جیسے خند میں آ گئی ہے۔“

”ایسی ہے تو نہیں خیر، خواجہ صاحب کو اس معاملے کا علم ہے یا وہ بھی میری طرح بے خبر

ہیں؟“

کمال حسن کی سوالیہ نظروں سے سیسا جڑ بڑ ہو کر کہنے لگی۔

”سب خبر سے خواجہ صاحب کو۔ ایک روز تو خون پر دانیال سے جھگڑ رہے تھے۔ میں نے خود سنا تھا۔“

دانیال نے بھی غصے میں انہیں برا بھلا کہہ دیا تھا۔“

”انتہائی مامعقول ہے دانیال۔“

کمال حسن نے افسوس سے کہا، اساتھ ہی متوحش بھی ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆

سیسا پریشان پھر رہی تھی۔ اسے اب اپنی غایت خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ کیونکہ ابھی بھی آفس جاتے

ہوئے کمال حسن کہہ گئے تھے کہ وہ خواجہ صاحب سے مل کر آئے گی۔ سیسا کی کچھ بھی نہیں آیا تو دانیال کے کمرے

میں آگئی اور اسے بے خبر سوئے دیکھ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”دانیال! دانیال! اٹھ جاؤ، دس بج گئے ہیں۔ آفس نہیں جاؤ گے کیا؟“

”نہیں!“

اس نے کسمندی سے جواب دیا۔

”اچھا! اٹھ جاؤ، میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔“

سیسا نے کہا تو اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔

”کھ۔ کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“

”تمہارے بھائی بہت غصے میں آفس گئے ہیں۔“

سیسا اپنے آپ زچ ہو رہی تھی۔

”پھر..... میرا مطلب ہے، آپ سے کچھ کہا بھائی نے؟“

وہ اٹھ بیٹھا۔

”نہیں!“

”پھر آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ ویسے بھی یہ میرا میٹر ہے۔“

اس کے اطمینان پر سیسا جھنجھلا گئی۔

”تمہارا میٹر ہے، لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کم آن بھائی! آپ نے کیا کیا ہے جو آپ ڈر رہی ہیں؟“

”تمہارے بھائی تو مجھ سے پوچھیں گے ناں؟“

”کیا پوچھیں گے آپ سے؟ خیر! جو بھی پوچھیں، آپ کہہ دیجئے گا، آپ کو کچھ پتا نہیں ہے۔

انہیں جو پوچھا ہو، مجھ سے پوچھیں۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو سیسا پوچھنے لگی۔

”اور تم کیا کہو گے؟“

”یہ میرا مسئلہ ہے بھائی! آپ خود ان کو اہمیشن نہ لیں۔“

وہ کہہ کر دوش روم میں بند ہو گیا۔ پھر وہ برائے نام ناشیہ کر کے گھر سے نکل آیا تھا۔ آفس جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ یوں بھی کافی لیٹ ہو گیا تھا۔ لیکن گھر بیٹھ کر بھی کیا کرتا؟ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی آفس کے راستے پر گاڑی ڈالی تھی کہ اسٹاپ پر جتا کھڑی نظر آگئی۔ اس نے گاڑی ۲۱ کے قریب لے جا کر روک دی تو حتا سے دیکھ کر بھی انجان بن ہی تھی۔

”حتا!“

اس نے شیشہ گرا کر پکارا جب بھی وہ منوٹے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”کم آن! میں ڈراپ کروں گا۔“

اس نے کہا تو حتا یوں جیسے بادل نواست بیٹھی ہو۔

”کیا بات ہے؟ ناراض ناراض لگ رہی ہو۔“

اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا تو وہ تنک کر بولی۔

”ہاں! ہوں ناراض۔“

”مجھ سے؟“

اس نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ظاہر ہے، تمہیں ناراض لگ رہی ہوں تو تم سے ہی ہوں گی ناں!۔“

”ارے! میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”وہی جواب میں کر رہی ہوں۔“

اس کے پہیلیاں الجھوانے پر وہ زچ ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کیوں؟ اس روز تم سارا وقت من بھلائے نہیں بیٹھے رہے تھے، میں نے کیا کیا تھا جو مجھ سے بات

نہیں کر رہے تھے؟ اب میں بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔“

حتا کی وضاحت پر وہ گہری سانس کھینچ کر کہنے لگا۔

”سو ری یار! اس روز اصل میں، میں بہت آپ سیٹ تھا تم تو جانتی ہو۔“

”ہاں! مجھے افسوس ہے کہ تمہارا گھر ڈسٹر ب ہو رہا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ آخر تانیہ چاہتی کیا

ہے؟“

حتا نے اظہار ہمدردی جتا کر پوچھا تو وہ بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆☆

تانیہ اور اپنی دانیال کی تصویر دیکھتے ہوئے کھوگی تھی۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا کہ خوبصورت صاحب کی پکارنے سے اسے بولکھلایا۔ جلدی سے الماری کھول کر تصویر نکال کر تانیہ صاحبہ اندر آ گئے۔

”کیا تلاش کر رہی ہو بیٹا۔؟“

”کچھ نہیں ابا! آپ بتائیں، کیا کہہ رہے تھے؟“

وہ الماری بند کر کے نہیں دیکھنے لگی۔

”وہ۔ بیٹا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ابھی مجھے رفیق صاحب ملے تھے ہم نہیں جانتیں، پرانے دوست ہیں میرے۔ خیر۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کا یہاں قریب اسکول ہے، اور میں نے ان سے بات بھی کر لی ہے۔“

اسے خوبصورت صاحب کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

”کیا بات کر لی ہے ابا۔؟“

”ارے بیٹی! اشو و اسکول داخل نہیں کرنا؟ اسی کے لئے بات کی ہے۔“

”اچھا اچھا! ہاں! یہ آپ نے اچھا کیا ابا! میں بھی آپ سے کہنے والی تھی کہ اب شو بی کو

اسکول جانا چاہئے۔“

”بس تو میں کل ہی اس کا ایڈمیشن کرادوں گا ٹھیک ہے۔!“

”جی! آپ کے لئے چائے لاؤں۔؟“

اس نے پوچھا تو خوبصورت صاحب بیٹ پر بیٹھے ہوئے بولے۔

”نہیں! بس پانی چلا دو۔“

”ابھی لائی۔“

وہ جلدی سے پانی لے آئی تو خوبصورت صاحب پانی پی کر کہنے لگے۔

”کچھ چاہئے تو بتا دو۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔“

”ابھی تو آئے ہیں ابا! آپ پھر کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے نواکھا۔

”ایک جگہ جاب کی بات کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے، انہوں نے بلا لیا ہے۔ انشا اللہ جہی تاریخ سے جو اس

کروں گا۔“

خوبصورت صاحب نے بتایا تو وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہے تو خوشی کی بات ابا! لیکن مجھے افسوس بھی ہوتا ہے۔“  
”افسوس کیوں؟“

خوبص صاحب نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”کیونکہ ہماری وجہ سے آپ کو اس عمر میں بھی جاب کرنی پڑی ہے۔ میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔“

اس کی دل فشلی محسوس کر کے بھی خوبص صاحب ناراض ہونے لگے۔

”خانیہ! اب یہ بات کی ہے، آئندہ کرتا کہ اللہ نے مجھے کی قابل سمجھا ہے، جب ہی مجھ پر تمہاری اور بچوں کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ یہ تمہارا اور بچوں کا نصیب ہے جو مجھے اس عمر میں بھی جاب مل گئی ہے، سمجھی تم؟“

”جی۔۔۔۔۔!“

اس نے سر جھکا لیا تو خوبص صاحب نرم پڑ کر گویا ہوئے۔

”بیٹا! ایک بات یاد رکھو۔ رب کی رضا میں رہنے میں ہی ہماری عافیت ہے۔ وہ مالک ہے،

اپنے بندوں کو ہر طرح سے آزما رہا ہے۔ دے کر بھی، لے کر بھی، اور جو اس کی آزمائش پر پورا نہیں اُترتا تو اس کے لئے آزمائش سزا بن جاتی ہے۔“

”مجھے معاف کر دیں ابا! میں نے آپ کا دل دکھایا۔“

وہ رد پڑی۔

”ارے نہیں بیٹا!۔۔۔۔۔!“

خوبص صاحب نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”میرا کوئی دل نہیں دکھا، ہاں، اگر تم روؤ گی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ چلو! غصہ نہ پھڑکھڑاؤ، اور دیکھو مجھے بھی دیکراؤ تم نے۔“

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں مڑگئی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر خوبص صاحب کو گیت تک چھوڑ کر اندر آئی تو کتنی دیر ادھر سے ادھر پھرتی پھری۔ دونوں بچے سو رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسے شدت سے احساس ہوا کہ دونوں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شفقتوں سے محروم ہیں۔

”ابائے ٹھیک کہا تھا۔ دانیال کو پتا چلنا چاہئے کہ وہ بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔“

اس نے سوچا اور لائی میں آکر دانیال کا نمبر ڈال کر تے ہوئے پھر اسے جھٹکا لگا تھا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں ابا!۔۔۔۔۔! جب تک دانیال اپنی غلطی پر مامور ہو کر آپ سے معافی نہیں مانگیں گے، میں ان کا نام بھی نہیں لوں گی۔“

اپنا وعدہ یاد آتے ہی اس نے ریسیدور واپس رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ان دنوں مکالم حسن کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے دیکھتے ہی خانیہ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ اس لیے اسے یاد وہ گھر آتا ہی رہے تھا یا آتے ہی اسے اپنے کمرے کا رخ کرتا تو پھر اگلی صبح مکالم حسن کے آفس جانے کے بعد ہی پہنچے تھا۔ اس وقت وہ آفس سے لوٹا تو سیما کے ساتھ حنا کو بیٹھے دیکھ کر بھی نہیں رکا اور سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔

اصل میں دو پہر سے ہی اس کے سر میں درد رہا تھا۔ ٹیبلٹ لینے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا، تو اب وہ آرام نہ کر پا رہا تھا۔ عموماً وہ اس وقت شاور لیتا تھا، لیکن اس وقت ہمت نہیں ہوئی۔ کپڑے بھی نہیں بدلے، جو تے موزے اتار کر لیٹا تو کچھ دیر میں سو بھی گیا تھا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے غامد دیکھ کر سوچا، دو بارہ سو جائے، لیکن بھوک نے نیند اُڑا دی تھی۔

”شٹ۔۔۔۔۔!“

وہ خاصا بد مزہ ہوا کہ اب جانے کب تک جاگنا پڑے گا۔۔۔۔۔! اپنی بے وقت نیند کو کوستے ہوئے اس نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، پھر کھانے کے لئے پیچھے آیا اور سیدھا کچن کی طرف بڑھا تھا کہ حنا کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

”سچ آیا!۔۔۔۔۔! آپ نے تو کمال کر دیا۔ دانیال تو اب خانیہ کا نام بھی نہیں سنا چکا تھا۔“

حنا کی آواز میں خوشی کی کھٹک تھی۔ وہ ابھی ٹھٹھکا نہیں تھا کہ سیما کی آواز آنے لگی۔

”اچھا! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“

”اوہو! کیا مسئلہ کڑا ہو گیا ہے؟“

حنا جھنجھلائی تھی۔

”تمہارے ڈیڑھ لہجائی تک بات پہنچ گئی ہے اور وہ اپنے طور پر خانیہ کو مٹا کر لانے کا سوچ رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ میرا مطلب ہے، جب دانیال نہیں چاہے تو پھر ڈیڑھ لہجائی کو کیا ضرورت ہے؟۔۔۔۔۔! آپ روکیں انہیں۔“

حنا کی بات پر وہ اب محتاط اور ہوشیار ہو گیا تھا۔

”کوشش تو کر رہی ہوں، لیکن دوسری کوئی بات ہی نہیں رہے اور چارے ہیں صبح شام خوبص صاحب کے گھر۔ وہ تو شکر ہے کہ خوبص صاحب نہیں مل رہے۔ پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں؟ گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔“

”جلیس اچھا ہے۔“

حتا کی بے نیازی پر سیانے دانت پیسے تھے۔

”لیکن کب تک؟ آخر کو لوٹ کر آئیں گے اور جو کمال کی خواہ صاحب سے ملاقات ہوگی، بھرتو

مجھو سارا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے آپا۔! ایسی خوف ناک باتیں نہ کریں۔“

”تو کیا کروں؟ تم سے زیادہ مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ میں نے تمہارے دلہا بھائی سے یہاں تک

کہہ دیا ہے کہ تین طلاق مانگ رہی ہے، اور دیکھو دانیال نے میری بات کا یقین کر لیا، لیکن۔۔۔“

”اُف خدا!۔۔۔“

دانیال کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ بھوک کی شدت اسے نیچے لے آئی تھی، انہی

بیروں واپس بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم سن من بھر کے ہو رہے تھے۔ مشکل اپنے کمرے میں آتے ہی وہ

یوں اوندھے منہ بیڈ پر گر تھا جیسے بڑی زور کی شوگر لگی ہو، اور شوگر تو لگی تھی۔

”یا اللہ۔۔۔! میں نے ہمیشہ بھائی کو ماں کا دلہن دیا اور انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا۔۔۔ اتنی گھٹاؤنی

سازش؟۔۔۔ تباہ کر دیا مجھے، کیسے سامنا کروں گا تباہ اور خواہ صاحب کا۔۔۔؟“

اس کے دماغ میں غصے میں اٹھنے لگی تھیں اور نظروں کے سامنے وہ منظر آنا لیا جب تانیہ نے کہا تھا۔

”ذرا تمیز نہیں ہے، اتنا ہی نہیں پتا، کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دی جانی ہے۔“

”یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو؟۔۔۔“

اس نے سمجھ کر بھی پوچھا تھا۔

”حتا کے بارے میں جو ابھی منہ اٹھانے چلی آئی تھی۔“

”کمال ہے، ایک تو وہ تمہارا خیال کر رہی ہے۔“

”میرا نہیں، آپ کا۔“

”اُف۔۔۔!“

اس نے دونوں باتوں کی انگلیوں سے اپنی کپٹیاں دبا لیں۔ بھر سر کو زور زور سے جھٹکے دینے، لیکن

جانے کیا کچھ یاد آتا چلا جا رہا تھا۔ بہت پریشان ہو کر اس نے نگلیوں میں سر گھسا کر سونے کی کوشش کی، لیکن اب نیند

کہاں آئی تھی؟۔۔۔ پوری رات وہ کانٹوں پر لوٹتا رہا تھا۔ سردی سے پھٹا جا رہا تھا۔ فجر کی آذان ہوئی، جب اس نے

بستر چھوڑ دیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی، پھر نیچے پٹن میں آکر چائے بنائی اور منگ لے کر کچن سے نکلا تھا کہ سامنے سے

آئی ہوئی سیانے سے دیکھ کر حیرت سے بولی گی۔

”ارے۔۔۔! تم اتنی جلدی کیسے اُٹھ گئے۔۔۔؟“

”بس۔۔۔! آنکھ کھل گئی، بلکہ آنکھیں کھل گئیں۔“

اس کا بتانا شاید سیانے محسوس ہی نہیں کیا، ملاحظہ ہوئی تھی۔

”آنکھیں کھل گئیں۔۔۔؟“

”آپ بس کیوں رہی ہیں۔“

اس نے پھر ٹوکا۔

”تمہاری حالت پر، مجنوں لگ رہے ہو۔ کہیں پھر سے تو عشق نہیں ہو گیا۔۔۔؟“

سیانے اسے چھیڑا تھا۔

”کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“

اس نے کہہ کر جانے کا سب لیا تھا۔

”اچھا۔۔۔! کون ہے۔۔۔؟“

سیانے اشتیاق سے پوچھا۔

”تاؤں گا۔“

وہ کہہ کر نہ نکلیں، اپنے کمرے میں آکر اس نے چائے پی۔ پھر اُجالا پھیلنے تک وہ گزشتہ باتیں ذہن

سے جھٹک کر اپنا گانا ادا سوچتا رہا۔ گوکہ ایک یوں دل دم سے تانیہ پر خواہ صاحب کے سامنے جا کھڑے ہونا بہت

مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے بہت باندھ لی، اور بظاہر آفس کے لئے تیار ہو کر نکلا تو پہلے خواہ صاحب کے گیٹ پر گاڑی

روکی اور اترتے ہی اسے دھچکا لگا تھا۔

گیٹ پر مکان برائے فروخت کا بورڈ لگا تھا۔ اسے حیرت سے زیادہ پریشانی نے گھیر لیا۔ کتنی دیر وہ غیر

یقینی سے بورڈ پر نظریں جمائے کھڑا رہا، پھر ادھر ادھر کے کچھ لوگوں سے خواہ صاحب کے بارے میں پوچھا تو سب

نے ایک ہی جواب دیا کہ خواہ صاحب کوئی میڈن بھر پہلے یہ گھر بیچ کر چلے گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

پھر وہ سارا دن خواہ صاحب کی تلاش میں بھٹکتا رہا تھا۔ ان کے آفس بھی گیا جہاں سے ان کے رہنا

ہونے کی خبر ملی اور وہاں ان کے پرانے گھر کا ایڈریس تھا۔ اس کی پریشانی بدھتی جا رہی تھی۔ پھر آخری اُمید اسے

راہبہ یاد آئی تو اس نے فوراً گاڑی اس کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ لیکن جب وہاں موجود چوکیدار نے بتایا کہ سب

لوگ وہی شفت ہو گئے ہیں تو اس کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

”سب لوگ۔۔۔؟ گھر والوں میں کون کون۔۔۔؟“

اس نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

”بابا۔۔۔! پورا خاندان گیا ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ آپ کدھر سے آیا ہے؟۔۔۔ صاب کا رشتہ

دار ہے کیا۔۔۔؟“

چوکیدار نے مذہب بنا کر پوچھا۔

”ہاں..... اودھ..... خیر! تم بتاؤ، صاب کا کوئی خبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں صاب.....! ہم ملازم آدمی ہیں۔“

چوکیدار نے اس کی مایوسی میں آخری کھل ٹھوک دی تھی۔

☆ ☆ ☆

اوپر کے پورشن میں کرایے دار آنے سے ٹانہ کافی بھل گئی تھی۔ بیک کھل تھا، ایک ہی بیٹی تھی، شعل کے برابر۔ چند دنوں میں ٹانہ کی فوزیہ کے ساتھ دوستی ہو گئی تو فارغ وقت میں کبھی وہ فوزیہ کے پاس تو کبھی فوزیہ اس کے پاس آ جاتی تھی۔ اس وقت فوزیہ نے ہاتھوں کے دوران اپنا کپ پوچھا تھا۔

”تمہارا میاں کہاں گیا ہوا ہے؟“

”میرے میاں باہر ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے، ملک سے باہر۔“

وہ پیلے سے یہ جواب سوچ چکی تھی۔

”پھر تو تم بھی اس کے پاس چلی جاؤ گی۔“

فوزیہ نہ کہا تو وہ بھیکی سکر اہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”نہیں.....! اتنی جلدی جانا تو ممکن نہیں ہے۔“

”ہاں.....! فلیکس کو بلانا آسان نہیں ہوتا۔ کتنا عرصہ ہوا ہے تمہارے میاں کو گمے ہوئے؟“

”میری کوئی تین چار مہینے۔“

”پھر تو واقعی ابھی تمہارا جانا ناممکن نہیں ہے۔“

”ہوں.....! تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے۔“

وہ اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر فوزیہ کی بیٹی کو پیار کرنے لگی۔

”مجھے تو تمہارے بھی ماشا اللہ بہت پیارے ہیں۔“

فوزیہ نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”بچے نہیں، میری بھی ایک ہی بیٹی ہے۔“

”اور یہ بیٹا۔“

فوزیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ اپنی جلد بازی پر اندر ہی اندر جھجھلائی، پھر کہنے لگی۔

”میری بہن کا بیٹا ہے۔ اسل میں ابا اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ یہ بھی ابا کے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اس لئے یہ ہمارے پاس ہے۔“

”اچھا اچھا.....! اور تمہاری بہن کہاں رہتی ہے؟ کبھی دیکھا نہیں اسے۔“

”وہ وہیں بیٹھی ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دے کر بات کا رخ فوزیہ کی طرف موڑ دیا۔

”تمہاری سرال سیتیں ہے، میرا مطلب ہے، اسی شہر میں؟“

”نہیں.....! میرا سرال لاہور میں ہے۔ میری شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ بس چار مہینے میں سرال

لاہور آیا، پھر اپنے میاں کو وہاں سے نکال کر لے آئی۔“

فوزیہ خود ہی ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”بھئی.....! مجھ سے نہیں سرال بیلوں کے نافذ سے برداشت ہوتے۔ چار مہینے بہت مشکل سے گزارے

میں نے۔ تم نے بھی اچھا کیا اپنے ابا کے پاس آ گئیں، ورنہ تمہارے میاں کی بہاری کمانی سرال لے آتے۔“

وہ فزونی سکرانی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیما کتنی دیر سے بار بار خلیہ صاحب کا نمبر ڈائل کر رہی تھی، یعنی ان کے پرانے گھر کا، اور ادھر مسلسل

لہائی تھی لیکن کوئی ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔

”لگتا ہے ابھی تک آئے نہیں خلیہ صاحب لوگ۔“

سیمانے آخر مایوسی سے ریسیور کر کہا تو حنا چوک کر پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ آپ خلیہ صاحب کے ہاں فون کر رہی تھیں؟“

”ہاں.....! دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ آئے کر نہیں؟“

پھر سوچے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”ٹانہ اسنے دن تو باہر نکل نہیں رہ سکتی، پھر کہاں ہوگی؟“

”کہیں ہی ہوا پا.....! ہمیں کیا؟“ اچھا ہے، خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئی۔“

حنانے سر جھٹک کر کہا تو سیمانے تیش سے بولی۔

”اور جو کسی دن اچانک آگئی تو؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس اپنے میاں کو قابو میں رکھیں، وہ نہ ٹانہ کی سائڈ لینے کھڑے ہو جائیں۔“

”اور داناں۔“

سیمانے سوچتے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”داناں میرے قابو میں آچکا ہے۔“

چوکیدار نے منہ بنا کر پوچھا۔

”ہاں! وہ! خیر! تم بتاؤ، صاحب کا کوئی نمبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں صاحب! ہم ملازم آدمی ہیں۔“

چوکیدار نے اس کی بایوسی میں آخری کل ٹھونک دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اچھا اچھا! اور تمہاری بہن کہاں رہتی ہے؟ کبھی دیکھا نہیں اسے۔“

”وہ بڑی میں ہوتی ہے۔“

اس نے جواب دے کر بات کا رخ فوریہ کی طرف موڑ دیا۔

”تمہاری سسرال کہیں ہے، میرا مطلب ہے، اسی شہر میں؟“

”نہیں! میرا سسرال لاہور میں ہے۔ میری شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ بس چار بیٹے میں سسرال

لہارے، پھر اپنے میاں کو وہاں سے نکال کر لے آئی۔“

فوریہ خود ہی ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”کبھی! اچھے سے نہیں سسرالوں کے نافذ کرے برداشت ہوتے۔ چار بیٹے مشکل سے گزارے

لہ میں نے تم نے بھی اچھا کیا اپنے ابا کے پاس آگئیں، ورنہ تمہارے میاں کی بیماری کمانی سسرالی لے آؤتے۔“

وہ زبردستی سر کرائی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیا کتنی دیر سے بار بار خواجہ صاحب کا نمبر ڈائل کر رہی تھی، یعنی ان کے پرانے گھر کا، اور ادھر مسلسل

لہ جاتی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

”گھٹا ہے ابھی تک آئے نہیں خواجہ صاحب لوگ۔“

سیا نے آخر بایوسی سے ریسیور رکھ کر کہا تو حنا چوہے کی۔

”کیا مطلب؟ آپ خواجہ صاحب کے ہاں فون کر رہی تھیں؟“

”ہاں! اور دیکھا چاہتی تھی کہ وہ لوگ آئے کہ نہیں۔“

پھر سوچتے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”فانیہ سنے دن تو ہاتھ نہیں رہ سکتی، پھر کہاں ہوگی۔“

”کہیں بھی ہوا پاپا! ہمیں کیا! اچھا ہے، خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ گئی۔“

حنانے سر جھٹک کر کہا تو سیا تشویش سے بولی۔

”اور جو کسی دن اچانک آگئی تو؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ بس اپنے میاں کو کاہوں میں رکھیں۔ وہ نہ فانیہ کی سائیل لینے کھڑے ہو جائیں۔“

”اور دانیال؟“

سیا نے سوچتے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”دانیال میرے قابو میں آچکا ہے۔“

ادھر کے پورشن میں کرایے دار آنے سے فانیہ کافی پہل گئی تھی۔ بیک کپل تھا، ایک ہی بیٹی تھی، شعال کے برابر۔ چند دنوں میں فانیہ کی فوریہ کے ساتھ دوستی ہو گئی تو فارغ وقت میں بھی وہ فوریہ کے پاس تو کبھی فوریہ اس کے پاس آ جاتی تھی۔ اس وقت فوریہ نے باتوں کے دوران اچانک پوچھا تھا۔

”تمہارا میاں کہاں گیا ہوا ہے؟“

”میرے میاں باہر رہتے ہیں، میرا مطلب ہے، ملک سے باہر۔“

وہ پہلے سے یہ جواب سوچ چکی تھی۔

”پھر تو تم بھی اس کے پاس چلی جاؤ گی۔“

فوریہ نے نہ کہا تو وہ پھٹکی سکرابٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”نہیں! اتنی جلدی جانا تو ممکن نہیں ہے۔“

”ہاں! اٹھلی کو بلانا آسان نہیں ہوتا! کتنا عرصہ ہوا ہے تمہارے میاں کو گئے ہوئے۔“

”جی کوئی تین چار مہینے۔“

”پھر تو واقعی ابھی تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔“

”ہوں! تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے۔“

وہ اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر فوریہ کی ہونٹوں پر ہانک کر بولی تھی۔

”بچے تو تمہارے بھی ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں۔“

فوریہ نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”بچے نہیں، میری بھی ایک ہی بچی ہے۔“

”اور یہ بیٹا؟“

فوریہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ اپنی جلد بازی پر اندر بھٹکائی، پھر کہنے لگی۔

”یہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ اصل میں ابا اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ یہ بھی ابا کے بغیر نہیں رہتا تھا۔“

اس لئے یہ ہمارے پاس ہے۔“

دانیال نے بیٹھے ہی بلا ارادہ پوچھ لیا۔

”بھائی! نہیں ہیں گھر پر۔“

”نہیں! تمہاری بھائی، جنا اور بچوں کے ساتھ قریبی مارکیٹ تک گئی ہیں۔“

انہوں نے بتایا تو وہ خاموش ہو رہا۔

”ہاں!۔“

کمال حسن بغور اس کا جائزہ لے کر گویا ہوئے۔

”میں تم سے یہ پوچھتا چاہ رہا تھا کہ تمہارے اور ثانیہ کے درمیان کیا جھگڑا ہے۔“

وہ فوراً کچھ نہیں بول سکا تو کمال حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بتاؤ دانیال! ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تم دونوں ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”کچھ نہیں بھائی! بس غلط فہمی کی بنا پر معاملہ چھیدہ ہو گیا ہے۔“

وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

”کیسی غلط فہمی۔“

”میں نہیں بتا سکتا بھائی! بس میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

اس کی دل گرفتگی کمال حسن کو شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جب تک تم اصل بات نہیں بتاؤ گے، میں کیسے اس معاملے کو سلجھا

سکا۔“

”رہنے دیں بھائی! میرا معاملہ سلجھا لیں گے تو آپ کا معاملہ کھڑائی میں پڑ جائے گا۔“

”کیا مطلب۔“

کمال حسن نے فوراً ٹوکا کہ اور وہ بتانا نہیں چاہتا تھا، جب ہی ہونٹ بھینچ گیا۔

”دانیال بیٹا! مجھ کو سمجھ پر، بھائی ہوں تمہارا۔“

کمال حسن نے اتنی شفقت سے کہا کہ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رو

ا۔

”بھائی! میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

وہ سیسا اور حتیٰ سازشوں کے بارے میں بتانا شروع ہوا تو پھر بولنا چلا گیا۔ کمال حسن انتہائی شاکہ اندر

دل میں بیٹھے تھے۔

”وعدہ کریں بھائی! آپ بھائی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ کو میری قسم بھائی!۔“

وہ خود ٹوٹ گیا تھا، لیکن بھائی کو لکھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب تک کمال حسن سے وعدہ نہیں لے لیا،

جتنا ترائی تھی تب ہی دانیال کو آتے دیکھ کر سیانورا سنبھل کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم کہاں سے آرہے ہو دانیال؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟ صبح بھی ست لگ رہا

تھے۔“

”اوہو آہا! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ آفس میں دل نہیں لگا ہوگا، آگیا۔ کمال

دانیال۔“

جتانے دلر باندا ز میں تصدیق چاہی تھی۔

”جی! یہی بات ہے۔“

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”سن لیا یہی بات ہے۔“

جتانے پھر اتر کر سیما سے کہا تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

”اچھا چلیں، جلدی سے کھانا گادیں، ورنہ وہ جھوکا ہی سو جائے گا۔“

”چلیں!۔“

جتاناس کے ساتھ کچن میں آگئی اور ابھی سیما کھانا گرم کر رہی تھی کہ گاڑی کی آواز سن کر وہ اچھٹے میں گر

کر پڑی۔

”یہ دانیال پھر کہاں چلا گیا؟۔“

”میں دیکھتی ہوں۔“

جتانورا بھائی کی کٹی تھی، لیکن پھر مزہ لکائے ہوئے آئی تو سیما نے اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے چولہا بند کر

دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمال حسن فی دی وی فریجے کی ہیڈ لائن سن رہے تھے۔ جب دانیال آیا اور غالباً ان سے کٹر کر نکل

چاہتا تھا کہ انہوں نے فوراً سے پکار لیا۔

”دانیال!۔“

”جی!۔“

دانیال نے ذک کر کچھ خائف نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”اوجھڑو بیٹھو! اچھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”جی!۔“





وہ چپ چاپ کھڑی انہیں اپنا سوچ کیس تیار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور منتظر بھی تھی کہ وہ اپنی کسی کے بارے میں اس سے پوچھیں گے، لیکن وہ خود ہی سوچ کر الماری کی طرف بڑھتے اور مطلوب چیز تلاش کر کے اس کیس میں رکھ دیتے۔ جہاں تک یہ منگنی انتہائی سادگی سے ہو جاتی تھی اور ان کی واپسی پر ہی ایک سال بعد اس کی شادی پروگرام تھا۔ وہ یوں ہی کچھ دیر تک ضبط کئے کھڑی رہی، دیکھتی رہی، لیکن جیسے ہی یہ خیال آیا کہ اگر یہ اسی طرح چپ چاپ چلے گئے تو وہ مزید ایک سال تک اسی طرح اس ورناس کی کیفیت میں گھبری رہے گی، اور اسی اذیت و نجات کی خاطر ہی وہ آگے بڑھی اور ہاتھ مار کر سوچ کیس بند کر دیا، اور وہ جو الماری کی طرف بڑھ رہے تھے وہاں پلٹ کر دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

”آخر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیا کر رہا ہوں میں؟“

انہوں نے ناگواری سے اٹھاسی سے پوچھا تو وہ دبے لہجے میں چیخ پڑی۔

”گویا آپ جانتے ہی نہیں کہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ مجھے ایک مسلسل عذاب میں مبتلا کر کے، کتنے اطمینان سے ہیں۔ سچ بولنے کی اگر یہ سزا ہے تو مجھے منظور نہیں جہاں زیب! آپ جانے سے پہلے میرے بارے میں فیصلہ کر کے جائیں۔“

”کیا فیصلہ؟“

وہ اٹھانے لگی۔

”اٹھانے مت نہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”ہاں!“

وہ سوچ کیس پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی، پھر اچانک اس سے پوچھنے لگی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں؟“

اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور نظریں ان پر جما کر اسی طرح کھڑی رہی۔

”میرا مطلب ہے، اس عرصے میں میرے روتے سے مایوس ہو کر تم نے اپنے بارے میں کچھ تو ۲۲

ہوگا؟“

”جی۔“

وہ سچ ہو کر طعنے بولی۔

”اس تمام عرصے میں، میں صرف یہ سوچتی رہی ہوں کہ آپ پر اعتماد کر کے میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے، مجھے پہلے آپ کے طرف کو آ زما نا چاہئے تھا، لیکن نہیں۔! میں جا بجا تھی، کوئی مرد اتنے طرف والا نہیں ہوتا،

بل کی ذرا سی غلطی کو نظر انداز کر سکے۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے میں نے سوچ لیا کہ شاید آپ کچھ مختلف ہوں۔“ وہ حیران ہو کر اسے بولتے دیکھ اور سن رہے تھے، جس کا ضبط اچانک جواب دے گیا تھا۔ خود اپنی طرف سے نظریں چمکان کر ان کی ذات کو نشا نہ بناتے ہوئے بولی۔

”ایک بات بتائیں، آپ سر دو لوگ بیویوں کی گزشتہ زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟“

”کیا نہیں رکھنی چاہئے؟“

”نہیں!۔۔۔ اور میں صرف اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے کہوں گی کہ میں جب تک اپنے والدین کے گھر میں تھی تو اس وقت تک میری زندگی پر صرف میرا دور میرے والدین کا اختیار تھا اور اپنی اس وقت کی تمام لالچوں اور کوتاہیوں کے لئے میں جواب دہ بھی اپنے والدین کے سامنے تھی۔ آپ کا نہ کوئی حق تھا، نہ اختیار، کیونکہ آپ تو مجھے جانتے تک نہیں تھے، پھر کوئی میری غلطی کا حساب مانگتے ہیں؟“

وہ کچھ بھر سانس لینے لگی، پھر کہنے لگی۔

”البتہ آپ کی زوجیت میں آنے کے بعد سے میں اپنی معمولی سی غلطی کے لئے بھی آپ کے سامنے جا رہی ہوں، اور اب آپ بتائیں، یہاں آنے کے بعد مجھے سے کیا گناہ مرد ہوا؟“ میری محبت میں آپ نے کی

اُلی یا خدمت میں؟ یا میں آپ کے ساتھ وقتا داری نہیں؟“

وہ خاموش ہو کر جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی اور انہیں بولے پر آمادہ نہ پا کر تلخ ہنسی کے ساتھ

اُلی۔

”چہ چہ۔۔۔ خوب۔۔۔! یعنی مرد تو اپنی گزشتہ زندگی کی رنگینیاں مڑے لے کر اور فخر سے بتاتا ہے،

اور بیوی کے بارے میں سوچ کتنی مختلف ہو جاتی ہے؟“

”میں نے کبھی تمہیں رنگین داستان نہیں سنائی۔“

وہ ہلکے بولے۔

”زود ہی سب سے متعلق تو سنائی ہیں، اور آپ اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ آپ کا واحد دوست

ہے۔“

”اسے میرا دوست مت کہو۔“

وہ غور بولے تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ محض اس خیال سے کہ وہ اس کے بارے میں مزید کچھ کہیں، تاکہ وہ جان سکے کہ اس کی حقیقت جاننے کے بعد وہ اس سے ملے بھی ہیں یا نہیں؟ اور وہ پتا نہیں بتانا نہیں چاہتے تھے یا کیا تھا کہ اس قدر کہہ کر خاموش ہوئے ہی، رُخ مڑ بیٹھا، اور اس نے سوچا، جب بات شروع ہوئی تھی تو اسے درمیان میں چھوڑنا حماقت ہے۔ وہ قدم بڑھا کر ان کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”میرے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“ میرا مطلب ہے، اس عرصے میں آپ نے کچھ تو سوچا

”ہاں! لیکن میں تمہارے بارے میں نہیں، بلکہ زوہیب کے متعلق سوچتا رہا ہوں، اور اب تم حیران ہوں کہ اس نے میری عزت سے کھیلنا کیسے گوارہ کر لیا.....؟“

”میں صرف اپنے بارے میں منتا چاہتی ہوں۔“

وہ ٹوک کر بولی۔

”تم سے میں کیا کہوں.....؟ میں جانتا ہوں تم زیادہ قصور دار نہیں ہو، پھر بھی مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ یعنی اتنا صدمہ تم اس کے فریب میں رہیں۔ بہر حال، یہ موضوع میرے لئے خاصا تکلیف دہ ہے۔ میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“

وہ جو خود اندر ہی اندر جزبہ زور ہی تھی، اس نے شکر کیا کہ انہوں نے خود ہی موضوع ختم کر دیا۔ درز دہ، نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

”جب آپ مجھے بہت زیادہ قصور دار نہیں سمجھتے تو پھر اسے زیادہ خفا کیوں ہیں.....؟ میری ذات سے اتنی لاشعری کیوں.....؟“

”اور کیا کر سکتا ہوں میں.....؟ جب تم سامنے آتی ہو تو میرا ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔ جیسی میں تم سے نظریں چرا لیتا ہوں۔“

انہوں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ افسردگی سے سسکائی۔

”شاید آپ کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔ بہر حال، اب تو آپ جارہے ہیں، اور وہاں میں نہیں ہوں گی۔“

اپنی بات کہہ کر وہ پلٹنے لگی تو انہوں نے اس کی کلائی تھام لی۔

”کہاں نہیں ہوگی.....؟“

”آپ کے سامنے، آپ کے آس پاس۔“

اس کا لہجہ بھگ گیا۔

”دل میں جو ہو، اس کا کیا کروں.....؟“

”جہانزیب!.....“

اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی نہ ہی انداز میں وارفتگی، بس لہجے کی چٹائیوں کا ہلکا سا لمس انہوں میں لہرا رہا تھا اور اس کے لئے یہی بہت تھا۔ وہ ان کے سامنے کھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔

”بس! مجھے دل میں ہی رہنے دیں۔“

”دل میں تو ہو، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

وہ انہیں خود سے اچھٹے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”چنانچہ میں کیا چاہتا ہوں.....؟ جب تم سامنے آتی ہو تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے اور جب نظروں سے اوجھل ہوتی ہو تو میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں.....؟“

انہوں نے سادگی سے پوچھا تو وہ جو یہ ایمان حاصل کر چکی تھی کہ وہ تو اس سے متنفر ہیں اور نہ ہی کوئی انتہائی قدم اٹھائیں گے، ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بھیگی سی شوق مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب ویسے بھی آپ مجھ سے ڈر جا رہے ہیں، وہاں تمہائی میں جب مجھے دیکھنے کو دل چاہے تو میرا تصور کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیجئے گا، پھر جیسے ہی مجھ پر غصہ آئے تو فوراً آنکھیں کھول کر.....“

”الحوال پڑھ لیا کروں۔“

وہ برکت ہوئے اور خود ہی بے ساختہ ہنسنے لگی تو وہ انہیں گھورنے لگی۔

”بہت خراب ہیں آپ.....؟“

”اسی لئے جنہیں یہاں سے نکال رہا ہوں۔ چلو اپنا سامان باندھو۔“

وہ ہنسی روک کر رعب سے بولے۔

”کیا مطلب.....؟“

وہ ایک دم کھڑی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

”بس! اب تم یہاں نہیں رہو گی۔“

”کیا.....؟“

اس کی ساری شوقی بل میں ہوا ہو گئی۔

”جلدی کرو، وقت کم ہے۔“

انہوں نے غلٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنا سوچا کیس کھولا اور اسے الماری کی طرف دھکیل دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے.....؟ الماری کا پٹ تھام کر چپ چاپ انہیں دیکھنے لگی۔ اسی وقت ماں اونچی آواز میں بولتی ہوئی ان کے کمرے میں آ گئیں اور اتنے ہی ان سے کہنے لگیں۔

”میں تو کہتی ہوں، ابھی ڈھن کو نہیں رہتے دو۔ خیر سے بچہ ہو جائے، پھر بلا لینا۔“

”یہ اماں کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے ان کی آواز آئی۔

”نہیں اماں! یہ میرے ساتھ جائے گی۔“

”آپ کے ساتھ؟“

”وہ فوراً آگے بڑھ آئی۔“

”کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”انہوں نے اس کی توجہ آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔“

”نہیں!“

وہ گزشتہ سارے دنوں کی کدورتیں بھلا کر مسکرائی اور اماں کی موجودگی کی وجہ سے مزید کچھ کہہ تو نہیں سکی، پھر بھی الماری کی طرف بڑبڑتے ہوئے شوشی سے بھرپور رسکراہٹ ان کی نذر کر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حتا یو نیورٹی سے سیدھی ادھر ہی آگئی تھی۔ آگے سیرادانت کچکا کچکا کر ”دانیال، دانیال“ کا ورد کر رہی تھی۔ حتا نے چند لمبے ڈک کر اسے دیکھا بلکہ سنا، پھر قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا آپ؟“ یہ ”دانیال، دانیال“ کیا کر رہی ہیں۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے میرا، جب ہی دانیال، دانیال کر رہی ہوں۔“

سیرا نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا تو حتا بجائے خائف ہونے کے ہنسنے لگی۔

”بندر کو دانپنڈ، زہر لگ رہی ہے مجھے تمہاری ہنسی۔“

سیرا نے مزید غصہ دکھایا تو حتا چکر بولی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ؟ کسی کا غصہ مجھ پر کیوں نکال رہی ہیں؟“

”تو اور کس پر نکالوں؟ تمہارے لئے ہی میں نے اسے پتھر چلائے اور نتیجہ صفر!“

”کیوں صفر؟ کیا ٹانیہ واپس آ رہی ہے؟“

حتا نے فوراً پوچھا۔

”وہ تو نہیں آ رہی، دانیال جا رہا ہے اس کے پیچھے، وہ بھی ذہنی۔“

سیرا کی تلملاہٹ عروں پر تھی۔

”ذہنی؟“

حتا کبھی نہیں۔

”ہاں! یہی کہہ رہا تھا دانیال کہ ٹانیہ ذہنی چلی گئی ہے اور اب میں بھی یہاں نہیں رہوں گا۔“

”سب کو اس سے۔ دانیال نے کہا اور آپ نے مان لیا۔؟ وہ نبہ! کہیں نہیں جائے گا دانیال۔“

حتا نے سر جھٹک کر کہا تو سیرا اُٹھتے ہوئے بولی۔

”آئے تو خود ہی پوچھ لینا۔“

”کہاں گیا ہے؟“

”پتا نہیں! نکلا تو آفس ٹائم پر تھا، اب پتا نہیں آفس گیا ہے یا کہیں اور۔؟“

سیرا کہہ کر کچن میں چلی گئی اور حتا اپنے دماغ کو فضول سوچوں میں الجھا تا چاہتی تھی، اس لئے بچوں

کے کمرے میں آ کر سو گئی تھی۔

پھر اسی دو پہر نہیں ڈھل چکی تھی جب سیرا نے آکر اسے اُٹھانے کے ساتھ دانیال کے آنے کا بتایا تو وہ جلدی

سے منہ ہاتھ دھو کر بیڑھیاں بچلا گئیں ہوئے دانیال کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی تھی۔

”دانیال! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“

”کیا سن لیا۔؟“

وہ بریف کیس سے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہی کہ تم باہر جا رہے ہو۔؟“

اس نے قصداً تشویش ظاہر کی تھی۔

”کوشش کر رہا ہوں، دُعا کرو۔“

وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”میری دُعاؤں میں اثر ہوتا تو میں یوں تمہارے پیچھے بھاگ رہی ہوتی۔؟“

اس کی افسردگی پر دانیال نے ہنسنے سے گریز کیا۔

”تمہیں میرا یقین نہیں ہے دانیال! تو پوچھو خدا سے، میں نے کتنا مانگا ہے تمہیں اس سے۔“

”تم جھوٹی ہو۔“

وہ سبک کر گیا ہوا تھا۔

”تم نے مجھے خدا سے نہیں مانگا، بلکہ اپنے حسن اور اداؤں سے چھیننے کی کوشش کی، اور اس حسین جال

میں، میں تقریباً پچیس پچاکا ٹان، لیکن ٹانیہ کی محبت نے مجھے بچنے لیا۔“

”ٹانیہ تم سے محبت نہیں کرتی دانیال!۔“

وہ ناگواری سے زور دے کر کہنے لگی۔

”اگر اسے تم سے محبت ہوتی تو کبھی تمہیں چھوڑ کر نہ جاتی۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟“

”اب تو سمجھ میں آ رہا ہے کہ ٹانیہ کیوں چلی گئی۔؟“

وہ چپکا کر بولا تھا۔

”کیونکہ.....“

”بس.....!“

دانیال نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

”اچھا ہوگا کہ تم اپنے مقام پر رہو۔ مجھے اور تانیا کو دیکس مت کرو۔“

”تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے دانیال! جو تم ایسے لی بی ہو کر رہو ہو۔“

وہ رو ہانسی ہو گئی تھی۔

”تم جاؤ پلیز.....! اور آئندہ بنا دستک دیئے میرے کمرے میں مت آنا۔“

دانیال نے کہہ کر رُخ موڑ لیا تو وہ چند لمبے غیر یقینی سے اس کی پشت کو دیکھتی رہی، پھر سیسا کے پاس آتے ہی اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولی تھی۔

”آپا! وہ تو جج جا رہا ہے۔ اس کے دل میں پھر سے تانیا کی محبت جاگ گئی ہے۔ وہ جا رہا ہے تانیا کے پاس۔“

”تو تم رو کیوں رہی ہو.....؟ تمہیں تو خود بہت بھروسہ تھا، دانیال کہیں نہیں جائے گا۔ اس وقت یہی کہا تھا نا تم نے؟“

سیسا نے تپ کر اسے لڑا۔

”آپا! اب طنز کر کے مزید نہ میرا دل جلا گئیں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں.....؟ کیسے روکوں اسے.....؟“

وہ تعصیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

”میں کیا بتاؤں.....؟ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ اچانک پانسا کیسے پلٹ گیا.....؟“

”کیسے چلنا.....؟ کیوں چلنا.....؟ ان باتوں کو چھوڑو آپا! آپ بس دانیال کو روکیں۔ وہ اگر چلا گیا تو میرا کیا ہوگا.....؟ اب خدا کے لئے یہ مت کہہ دیجئے گا کہ آپ میرے لئے دانیال سے اچھا لڑکا ڈھونڈ لیگی۔“

میں شادی کروں گی تو صرف دانیال سے، ورنہ کسی سے نہیں۔“

وہ کہہ کر پھر رونے لگی تو سناؤ جج ہو گئی۔

”اچھا.....! تم روتو مت۔ کون سا دانیال ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے.....؟ ایک آدھ سال میں آ جائے گا واپس دیکھ کھا کر۔“

”بس.....! اب مجھے جھوٹی آس مت دلائیں۔“

وہ کسی طرح نہیں بھل رہی تھی۔

”تمہیں تو خیر میں نے پہلے بھی کہا تھا، دانیال کا خیال چھوڑ دو۔ سرناب کے پر نہیں لگے اس میں۔ لیکن

تمہیں ہی شد ہو گئی تھی۔ خیر.....! اچھا ہے جو وہ جا رہا ہے، ورنہ اسے یہاں سے نکالنے کے لئے مجھے پھر سے مغز ماری کرنی پڑتی۔“

سیسا نے کہا تو وہ اُچھل کر بولی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟“

”تو اور کیا اسے میں صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہی تھی.....؟ جب وہ تمہارا نہیں ہوا تو.....“

”تانیا کا بھی نہیں ہونا چاہئے۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”تانیا کا تو خیر کبھی نہیں ہونے دوں گی اسے۔“

سیسا کے زوم پر حنا کو اطمینان ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”بیچھے ابا.....! یہ آپ کی اچھی ڈیوٹی ہے۔“

تانیا نے شونی کا اسکول بیک خواجہ صاحب کو تھما دئے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”ہاں بیٹا.....! اس ڈیوٹی نے مجھے پھر سے جوان کر دیا ہے۔ چلو بیٹا شونی.....! خالہ کو اللہ حافظ کہو۔“

”اللہ حافظ خالہ.....!“

شونی نے اسے ہاتھ ملا کر کہا۔

”اللہ حافظ بیٹا.....!“

اس نے جبکہ کر شونی کا سر جو ما، پھر اسے خواجہ صاحب کی انگلی پکڑے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اچانک

مشعال کا خیال آیا تو تیزی سے کمرے میں آ گئی۔ مشعال بچکے کو کچھ خوش ہو رہی تھی۔

”مگر یارانی.....!“

وہ مشعال کے پاس بیٹھ گئی، پھر اس کا انصافا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”تمہارا بچا پاپا کو پتا ہی نہیں ہے کہ تم اس دنیا میں آ چکی ہو۔ شاید وہ سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔“

مشعال کی شکل رونے والی ہو جاتی تو اس نے ایک دم اسے اٹھائی۔

”ارے ارے.....! میں ہوں ناں.....! پاپا کو پرواہ نہیں ہے تو کیا ہو.....؟ ممی کی جان ہوتی.....! چلو

تمہیں دکھاؤں تمہارے بابا کیسے ہیں.....؟“

وہ مشعال کو لئے ہوئے اُٹھی اور الماری میں سے اپنی اور دانیال کی تصویر نکال کر اسے دکھاتے ہوئے

بولی۔

”دیکھو، یہ تمہارے پاپا ہیں۔ ظالم، سنگ دل اور پتا نہیں کیا کیا۔“  
مشعال ایک دم رونے لگی تو اسے ہنسی آگئی۔

”اچھا نہیں نہیں..... تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں، اچھے ہیں جب ہی تو دوسروں کو اپنی طرح سمجھ کر اٹ گئے۔“

اس کی اپنی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ مشعال کو سینے سے لگا کر اسے چپ کرانے لگی۔ تب ہی خوبصورت صاحب آکر پوچھنے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے اسے؟ کیوں اتنا رورہی ہے؟“

”پتا نہیں اب!“

وہ نظریں چرا گئی۔

”بھوک تو نہیں ہے؟“

”نہیں..... ابھی منٹ منٹ پہلے فیڈر پلائی تھی۔ لیجئے، آپ پکڑیں اسے، میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“

وہ مشعال کو خوبصورت صاحب کی ہاتھوں میں ڈال کر جلدی سے کچن میں آگئی اور چائے بناتے ہوئے خود کو سرزنش کرنے لگی۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ اتنی سی بچی سے کیسی باتیں کر رہی تھی؟“

اس نے سر جھٹکا، پھر ناشتے کی ٹرے لے کر خوبصورت صاحب کے پاس آگئی۔

”تم ناشتہ نہیں کرو گی؟“

خوبصورت صاحب نے ایک آدمی کا ناشتہ دیکھ کر پوچھا۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا ہے، پھر کروں گی۔“

اس نے مشعال کو ان کی گود سے لیٹے ہوئے کہا۔ پھر جانے لگی کہ خوبصورت صاحب نے پکارا۔

”ٹائیہ..... میرے پاس بیٹھو۔“

”جی۔“

وہ بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ خوبصورت صاحب نے ہراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالا، پھر چائے کا پپ لے کر اسے دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا اب؟“

وہ ان کے دیکھنے سے کچھ الجھ گئی تھی۔

”تم بتاؤ بیٹا..... کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟“

خوبصورت صاحب نے پوچھا اور اس کے کئی میں سر ہلانے پر کہنے لگے۔

”میں تمہارا باپ ہوں ٹائیہ..... تمہارا دکھ کچھ پہچانتا ہوں۔ اندر کچھ دنوں سے تمہیں بے کلاں اور اُداس

دیکھ رہا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“

خوبصورت صاحب کے نرم شفقت لہجے نے پھر اس کی آنکھیں میلی کر دیں۔

”کوئی بات نہیں ہے اب..... اس ایسے ہی کبھی بھی دل گمراہ لگتا ہے۔“

”کہیں آنا جانا بھی تو نہیں ہے تمہارا۔ خود کو اتنا پابند مت کرو بیٹا..... اگر دم گھٹنے لگے۔ آس پڑوس میں

اچھے لوگ ہیں، ان سے ملا جلا کرو۔“

خوبصورت صاحب نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”جی..... اویسے تو یہ ہے اچھی دوستی ہو گئی ہے میری۔“

”ہاں..... دن میں اس کے پاس چلی جایا کرو۔ وہ بھی تو آتی ہے۔“

”جی..... اصل میں اب..... بچوں اور پھر گھر کے کاموں میں میرا کہیں جانا نہیں ہو پاتا۔“

اس کی معذوری سمجھتے ہوئے خوبصورت صاحب نے اثبات میں سر ہلایا، پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ

کھڑے ہوئے۔

”اچھا بیٹا..... میں چلتا ہوں، گیٹ بند کرلو۔“

”جی..... اللہ حافظ اب!“

وہ گیٹ بند کر کے واپس آئی تو مشعال کو جھولے میں ڈال کر دھیرے دھیرے جھولا جھلاتے ہوئے اسے

اپنی بچی پرتس آگے لگا، جس کے نصیب میں جانے باپ کی شفقتیں تھیں بھی کر نہیں۔

”کتنے ظالم ہوتے ہیں مرد۔“

وہ سوچنے لگی۔

”شوہنیک کے باپ نے بھی تو لیٹ کر اسے نہیں پوچھا۔ حالانکہ وہ اسے دیکھ چکا ہے، اور میری مشعال کے

باپ نے تو اسے دیکھا ہی نہیں، پھر اسے کیا احساس ہو گا بھلا.....؟“

”نہیں..... مجھے اسے احساس دلانا چاہئے۔“

اس کی ذہنی ریزنگ ہو چکی تھی اور پھر اس نے کچھ نہیں سوچا۔ مشعال کے سوتے ہی اس نے پہلے دانیال کے

آفس کے نمبر پر فون کیا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ دانیال ایک مہینہ پہلے وہاں ریڑائن دے کر جا چکے ہیں۔ وہ ماہیوں

ہونے کے ساتھ کوفت میں چلا ہو گئی۔ کوفت میں یوں اسے گھر کا نمبر ڈائل کرنا تھا۔ اس نے خود کو باز رکھنے کی

کوشش نہیں کی اور فوراً گھر کا نمبر ملا ڈالا تو ادھر سے سیمیا کی آواز آئی تھی۔

”بیٹو.....!“

وہ بری طرح جھنجھالی، پھر بھی ضبط سے بولی تھی۔

”میں ٹانیہ بات کر رہی ہوں۔“

”ٹانیہ؟“

سیما کے لیے میں حد درجہ ناگواری سٹ آئی تھی۔

”جی.....! مجھے دانیال سے بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا تو سیما مسخرا نہ انداز میں بولی تھی۔

”دانیال اب یہاں کہاں؟ وہ تو شادی کرتے ہی حنا کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔“

”جی؟“

وہ یک لخت زنگیوں کی زد میں آ گئی تھی۔

”بھئی.....! اب وہ تمہاری خاطر جوگ تو نہیں لے سکتا تھا۔ ایسی حور پر تو نہیں تم جی.....“

اس نے کرڈیل پر ہاتھ رکھ کر سیما کی آواز بند کی تھی، لیکن پھر بھی اس کی ساتیں بچ رہی تھیں۔

”وہ تو شادی کرتے ہی حنا کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔“

”نہیں نہیں.....! دانیال ایسا نہیں کر سکتے۔“

وہ اس شدت سے روئی کہ اگر کوئی سامنے ہوتا تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا، لیکن کوئی نہیں تھا۔ یہ دروازے تھا

جھپٹنا تھا، شاید ساری عمر۔

☆.....☆.....☆

وقت کسی درد پر غور نہیں ہے۔ اس کا کام گزرتا ہے، گزرتا چلا جاتا ہے۔ دن، مہینے، سال، کتنے سال

بیت گئے۔ خوجہ صاحب بالکل ریتا زور ہو کر کھر بیٹھ گئے تھے۔ ٹانیہ نے اسکول اور کالجنگ میں پڑھا کر شوبی اور مشعل

کو پڑھایا تھا، اور اب تو اس کی بہت بھی جواب دے گئی تھی۔ اکثر بیار رہنے لگی تھی، جس سے اسکول کی جاب چلی

گئی۔ شوبی ماسٹر کر تھا اور مشعل نے اسی سال گر بیویشن کیا تھا اور اس وقت وہ ایک جگہ انٹرویو دے کر آئی تھی کہ

ٹانیہ کو بیڑے سے نیچے کرتے دیکھ کر اس نے بھاگ کر اسے تھا تھا۔

”کیا ہوا امی؟“

”کچھ نہیں بیٹا۔“

ٹانیہ مٹیوٹی ہو کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”کیا اس لگی تھی، پانی لینے آئے تھی؟“

”کیا ضرورت تھی آپ کو آٹھنے کی؟ پانی چاہئے تھا تو شوبی کو پکار لیتیں۔ نکما بیٹھا تو ہے گھر۔“

ناراضی سے بولتے ہوئے مشعل نے اسے سیدھا ہٹھایا، پھر کہنے لگی۔

”نانا بابا آجائیں، میں ان سے کہوں گی، آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔“

”نہیں بیٹا.....! اب اسے کچھ مت کہنا۔ وہ بچپارے کہاں سے کریں گے؟“

ٹانیہ نے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا۔

”چلیں، بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ میری جاب ہو جائے، پھر میں خود آپ کو اسپیشلسٹ کو

دکھاؤں گی۔“

اس نے خوجہ صاحب کا احساس کرتے ہوئے کہا تو ٹانیہ پوچھنے لگی۔

”ابھی جہاں انٹرویو کے لئے لگی تھی، تو کیا ہوا؟“

”مجھ سے پوچھیں خالہ.....! کیا ہوا ہوگا؟“

شوبی، ٹانیہ کی بات سننے ہوئے آیا تھا، اس سے پہلے بول پڑا۔

”اس کی سی وی دیکھ کر سر پیٹ لیا ہوگا انہوں نے۔ کیوں مشعل.....! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں

میں؟“

”جی نہیں۔“

وہ گل کر تھکے لیے جھپٹتی تھی۔

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے جاب مل گئی ہے۔“

”کیا؟“

شوبی ناممکن انداز میں ٹانیہ میں سر ہلانے لگا۔

”جج کہہ رہی ہو مشعل؟“

ٹانیہ نے پوچھا تو وہ کوشش سے خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

”جی امی.....! میں جج کہہ رہی ہوں۔ میری جاب ہو گئی ہے، اور مجھے کل سے ہی جوائن کرنی ہے۔“

”اچھا۔“

ٹانیہ کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی امی؟“

اس نے پوچھا تو شوبی پھر بول پڑا۔

”بس.....! اب یہ اموشن ہو جائیں گی۔ بیٹا تمہارے ابا یہاں ہوتے تو تمہیں اتنی مشقت نہ کرتی

پڑتی، ہونہ۔“

”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اس کے چپٹے پر شوہلی اسے چڑاتا ہوا ہلکا گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے جانے لگی، لیکن ٹائیہ نے اس کا ہاتھ

پکڑ لیا۔

”ایسا کیوں ہے امی؟“

وہ روہانی ہو گئی۔

”تنگ کرتا ہے بیٹا! تمہیں تمہاس کی باتوں کا برا نہ مانا کرو۔“

ٹائیہ نے اسے پکڑتے ہوئے کہا تو وہ روٹھے انداز میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

ٹائیہ نے فوراً پوچھا۔

”پکن، آپ کے لئے سوپ بنا کر لاتی ہوں۔“

اس نے ٹائیہ کی خاطر فوراً اپنا موڈ ٹھیک کیا، لیکن پھر پکن میں آتے ہی وہ اپنے آپ میں الجھنے لگی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے؟ شوہلی کے چڑانے پر اس نے کہہ تو دیا تھا کہ اس کی جاب ہو گئی ہے اور کل سے جوائن بھی کر رہی ہے، لیکن وہاں وہ ہابی بھر کر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ جس پوسٹ کے لئے وہ گئی تھی، اس کے لئے ایک تو اس کی تعلیم کم تھی، دوسرے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا، اور اس نے اسے دوسری جاب آفر کر دی تھی اور اس کے لئے وہ تیار نہیں تھی۔ سوچتے پر بھی اسے مناسب ٹھیک رہا تھا کہ وہ اس کی آفر قبول کرے۔

ٹائیہ کے لئے سوپ چڑھا تے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الجھ رہا تھا کہ شوہلی کے موہا بل فون پر تیز فون سے وہ مزید جھنجھلا گئی۔ ٹون مسلسل بج رہی تھی اور شوہلی پتا نہیں کیاں تھا؟ وہ چل رہا تھا وہیں اس کے شوہلی کے کمرے میں آئی اور اسے کتاب پر نظر پڑا۔ جمائے دیکھ کر سلگ گئی۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے بہرہ ہو۔

”شوہلی! کس کا فون ہے؟ ریسپونڈ کیوں نہیں کرتے؟“

وہ جتنی تیز ہو کر بولی، وہ وہی قدر راغمینان سے بولا تھا۔

”کیونکہ مجھے بات نہیں کرنی۔“

”تو تیل آف کر دو۔ خواہ مخواہ شور مچا رہا ہے۔“

وہ کہتے ہوئے آگے آئی اور جھپٹ کر موہا بل اٹھایا اور آف کرنا چاہتی تھی کہ راہبہ کا نمبر دیکھ کر بے سارا

ہوئی تھی۔

”ارے! یہ تو راہبہ خالہ ہیں۔“

”السلام علیکم راہبہ خالہ! ایکسی ہیں آپ؟“

اس نے فوراً کال ٹی تھی۔

”جی خالہ! اسب ٹھیک ہیں۔ امی، نانا، اور شوہلی بس ابھی کسی کام سے نکلا ہے۔“

اس نے شوہلی کو گھورے ہوئے بتایا تھا۔

”ارے نہیں راہبہ خالہ! بس اتفاق ہی ہے کہ جب آپ کا فون آتا ہے، شوہلی موجود نہیں ہوگا۔ وہ

ملا کیوں آپ سے بات نہیں کرنا چاہے گا۔؟ اتفاق تو آپ کو یاد کرتا ہے۔

جی خالہ! میں کہہ دوں گی شوہلی سے۔ وہ ضرور آپ کو فون کر لے گا۔

”اوکے! اللہ حافظ۔!“

وہ سیل آف کر کے شوہلی کو گھورنے لگی۔

”ہو گئی بات۔؟ اب جاؤ یہاں سے۔“

”تمہیں تو میں کسی دن شوٹ کر دوں گی۔“

وہ سیل اس کے آگے پیچھ کر واپس پکن میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو رات دس بجے ہی لائٹ آف کر کے ٹائیہ کے پاس آ کر لیٹی تو ٹائیہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

”تم اتنی جلدی سو رہی ہو؟“

”جلدی سوؤں گی امی! تو صبح جلدی اٹھوں گی۔ آفس جاتا ہے ناں۔!“

اس نے کہا تو ٹائیہ خاموش ہو رہی۔

”ارے ہاں امی۔!“

وہ اچانک یاد آنے پر کہنے لگی۔

”میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ راہبہ خالہ کا فون آیا تھا۔ آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔“

”وعلیکم السلام! شوہلی سے بات ہوئی راہبہ کی؟“

ٹائیہ نے فوراً پوچھا تو وہ سلگ کر بولی۔

”نہیں! میرا دل چاہ رہا تھا موہا بل شوہلی کے سر پر دے ماروں۔ بیچاری راہبہ خالہ کتنا بڑبڑتی ہیں،

کسی طرح اس کی آواز سن لیں۔ جی امی! اگر میرے پاپا کا فون آجائے تو میں خوشی سے چھلانگیں مارتی

مہر دوں۔“

”تم اپنے پاپا کو میس کرتی ہو؟“

ٹائیہ کی آواز کہیں دُور سے آئی لگی تھی۔ وہ قدرے خائف ہوئی، پھر ٹائیہ کا ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر بولی۔

”زیادہ نہیں امی! بس کبھی کبھی۔“

ٹائیہ نے اس کی پیشانی چومی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر صبح آفس جاتے ہوئے وہ خاصی شش و پنج میں تھی۔ تمام راستہ دل ہی کہتا رہا کہ اسے واپس لوٹ چاہئے۔ لیکن جب اس کی مجبوری تھی، جب ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ آفس پہنچ گئی اور سیدھی باس علی احمد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تو انہوں نے قدرے غیر یقینی سے اسے دیکھا، پھر مسکرا کر بولے۔

”وعلیکم السلام! چلو میں تمہیں تمہارا روم دکھا دوں۔“

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ پھر ایک روم میں داخل ہو کر وہ بولے تھے۔

”یہ میرے بیٹے شامان کا روم ہے اور اب تمہارا بھی۔“

وہ اندر سے بہت گھبرائی تھی اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔

”وہ تمہاری سیٹ ہے۔“

علی احمد کو نے میں رکھی ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

”شامان کو تمہارا یہاں بیٹھنا ناگوار تو گزرے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں یہاں سے نکل جائے

کہے، لیکن تمہیں اس کی بات نہیں مانتی۔“

”جی۔۔۔!“

اور وہ گھبرا گئی۔

”ہوں۔۔۔!“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کہنے لگے۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھو۔ میں نے ساری بات تمہیں سمجھا دی ہے، اور ہاں۔۔۔! تم اس کمپیوٹر پر ہاتھ صاف کر سکتی ہو۔“

”لیکن سر! مجھے تو کمپیوٹر آتی میں اگر یہ مجھے سے خراب ہو گیا تو۔۔۔؟“

وہ گھبراہٹ میں سمجھ نہیں پاری تھی، کیا کہے؟

”نو پراBLEM! اور آجائے گا۔ اوکے۔! وٹس یو بیسٹ!“

وہ مسکرا کر اسے حوصلہ دے کر چلے گئے۔ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھنے ہی اس نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔

کمپیوٹر آن کیا تھا کہ شامان علی خاصے لا پر وہ انداز میں سیدھا اپنی ٹیبل کی طرف بڑھا تھا، لیکن جب بیٹھنے لگا تب اس پر نظر پڑے ہی اس کی پیشانی پر پل پڑ گئے تھے۔

”آپ۔۔۔ آپ یہاں کی کمری ہیں۔۔۔؟“

انتہائی ناگوار سی کہا گیا۔

”کام۔۔۔!“

وہ جی کڑا کر کہہ بولی۔

”آئی مین، میں کل ہی اپنا ٹکٹ ہوئی ہوں۔ آج میرا پہلا دن ہے۔“

”میں نے یہ نہیں پوچھا، آپ کا پہلا دن ہے یا آخری۔ میرے روم میں آپ کو کس نے بٹایا

؟۔۔۔“

اس کے غصے سے وہ خائف ہو گئی۔

”وہ۔۔۔ باس۔۔۔ باس نے۔ آپ بے شک ان سے پوچھ لیں۔“

اس کی بات سنتے ہی وہ دانت پیستے ہوئے تیزی سے چلا گیا تو وہ دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ بولی۔

”مائی گاڈ! یہ تو شربی سے بھی برا ہے۔“

وہ غصے میں جھنجھلا یا ہوا باس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا تھا۔

”ڈیڈ! میرے روم میں وہ لڑکی کیا کر رہی ہے۔۔۔؟“

”لڑکی۔۔۔؟ اوہ مشعل! اسے میں نے اپنا ٹکٹ کیا ہے۔“

علی احمد نے اطمینان سے بتایا تو وہ مزید جھنجھلا گیا۔

”اوہ ہو ڈیڈ! میں یہ ٹکٹس پوچھ رہا ہوں۔“

”ریٹیکس! ریٹیکس شامی! اس کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کا روم تیار ہو جائے، پھر وہ وہاں

آفت ہو جائے گی۔“

علی احمد نے نرمی سے اسے ٹھنڈا کر کے کی کوشش کی۔

”تو آپ اسے کچھ دن بعد بائیں، جب اس کا روم تیار ہو جائے گا۔“

اس کے ضدی انداز پر علی احمد ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”بیٹا۔۔۔! تمہیں کیا پراBLEM ہے۔۔۔! وہ اپنا کام کرے گی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔! پھر میں کچھ دن بعد آؤں گا۔“

وہ کہہ کر جانے لگا کہ علی احمد جتنی سے پکار کر بولے۔

”شامان! یہ گھر نہیں ہے جہاں ہر بات میں تمہاری پسند نا پسند کا خیال رکھا جائے۔ مشعل وہیں

ہماری اور تم کام میں اس کی ہیلپ بھی کرو گے۔ انڈرا سینڈ۔۔۔!“

وہ خائف نہیں ہوا، ناراضی سے ان کے روم سے نکلا تو پھر آفس سے ہی نکل آیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے سارہ کو فون کیا اور اس کی فیورٹ جگہ بتائی کہ یہ کڑو دھوپ دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

”کیا بات ہے۔۔۔؟ آج تم آفس نہیں گئے۔۔۔؟“

سارہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ برا سامنے ہٹا کر بولا۔

”صمیمیتاً، لیکن دل نہیں لگا۔“



”دل نہ لگنے کی وجہ؟“

سارہ نے اتر آکر اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”تم؟ جو جواسوں پر چھائی رہتی ہو۔“

”پھر تم اپنی ہی ڈیٹی سے بات کیوں نہیں کرتے؟“

سارہ نے فوراً کہا تو وہ سانس کھینچ کر بولا۔

”کر چکا ہوں بابا! کر چکا ہوں۔ میں انہیں تمہارے بارے میں بتا چکا ہوں۔“

”پھر کب آ رہے ہیں وہ تمہارا پر پوزلے نہ کر؟“

”آجائیں گے، جلدی کیا ہے؟“

وہ کہہ کر خود ہی جھنجھلا گیا تھا۔

”یار! کوئی اور بات کرو ناں! میرا پیٹل ہی موڑ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہو تمہارے موڑ کو؟“

”کچھ نہیں! چلو کہیں اور چلتے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو سارہ نے نہ کھنکھنے کے انداز میں کندھے اُچکائے تھے۔

☆ ☆ ☆

شوہنی میٹ سے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ ایسا لگتا تھا جیسے ساری دنیا سے خفا ہو۔ مگر میٹ دھوپ کا بھی احساس نہیں تھا۔ جب ہی اوپر بالکونی سے فوزیہ کی بیٹی روہنی اسے پکار کر پوچھنے لگی۔

”سنو! ایک کام کرو گے۔“

”کیوں؟ تو کہوں کیا تمہارا؟“

وہ کاٹ کھائے نو دوڑا تھا۔

”تو کہہ کر کیا بات ہے؟ کسی کام کرنے سے اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔“

روہنی اسے چھیڑ کر محظوظ ہوتی تھی۔ شوہنی سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ پھر اسے متوجہ کر کے

بولی۔

”سنو! کچھ نیکیاں مکالمہ، درنہ میاں کی طرح وہاں بھی اسی طرح مایوس کھڑے ہو گے۔“

”تم؟“

شوہنی نے نیچے سے پھر اٹھا کر اسے کھینچ مارا، لیکن وہ اسے اٹھوٹھا دکھاتے ہوئے بھاگ گئی۔

”اسٹوپ!“

وہ دانت پیٹتا اندر آ کر لاؤنج میں بیٹھا تو دوسرے کمرے سے ثانیہ اور خولجہ صاحب کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ ثانیہ کہہ رہی تھی۔

”کہنے والے تو یہی کہیں گے ناں ابا! کہ شوہنی کی تربیت میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے۔ رابعہ بھی

میں الزام دے گی۔“

”کیوں؟ رابعہ کیوں ہمیں الزام دے گی؟ اس پتا نہیں ہے شوہنی کے باپ اور چچا کیسے

.....؟“

خولجہ صاحب نے کہا تو شوہنی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”خون رنگ دکھاتا ہے تو ساری تربیت دھری رہ جاتی ہے۔ بے حسی اور ہٹ دھرمی شوہنی کو درٹے میں

لہے۔ میرا تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نہ زیادہ سوچا کرو۔“

”کیسے نہ سوچوں ابا! شوہنی کو میں نے صرف جمن ٹینس دیا، پالا تو اپنی اولاد کی طرح ہے۔ اس کی

اولاد خراب ہوگی تو سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہوگی۔“

ثنانیہ کی آواز میں ڈکھ تھا۔

”میں جانتا ہوں بیٹا! لیکن میں کیا کروں؟ میری تو وہ بات ہی جس منتا۔ اُٹنا اور غصے میں آ جاتا

.....؟“

خولجہ صاحب کے لیے میں بے بسی شوہنی کو محسوس ہوئی تھی۔

”ہاں! آپ کچھ کچھ نہ کہا کریں اس سے۔“

ثنانیہ فوراً بولی تھی۔

”کیا وقت آ گیا ہے؟ بچوں سے بھی ڈر کر بات کرنی پڑتی ہے۔ ہا۔۔۔!“

خولجہ صاحب نے آدھ بھری، پھر کہنے لگے۔

”مجھے الزام دیتا ہے شوہنی کہ اس کی ماں کو میں نے اس سے دُور کیا ہے۔ ہاں! کیا ہے، بھٹائے رکھتا

.....؟“

”بس کریں ابا! آپ نہ شوہنی کی باتوں کو دل پر لیا کریں۔“

ثنانیہ کے لیے میں اس کے لئے نفی شفقت تھی، وہ بے اختیار اٹھا تھا لیکن اندر جانے کی بجائے باہر نکل

.....

☆ ☆ ☆

مشعل کو آفس جوائن کے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے دن کے بعد پھر شامان نے اسے کچھ نہیں کہا تھا،

بلکہ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ جبکہ وہ اسے نہ صرف دیکھتی بلکہ نوٹس بھی کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کام کرتا، پھر فون پر جانے لے گئی۔ اس کے بعد جلّت میں اٹھ کر چلا جاتا۔ اس وقت وہ فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

”بس یار!... اس منٹ میں نکلتا ہوں یہاں سے۔“

وہ اسے دیکھتے ہوئے پورے دھیان سے اس کی باتیں سننے لگی تھی۔

”کم آن سارو!... کہا تو ہے، سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔“

نہیں!... کچھ خاص نہیں، بس تم تیار رہنا۔

ہاں!... جہاں تم کوئی۔

اوکے.....“

شامان نے سئل فون کان سے ہٹایا، تب اس پر نظر پڑی اور اسے اپنی طرف دیکھنے پا کر بگڑ گیا تھا۔

”تم کیا سن رہی ہو.....؟ اپنے کام سے کام کر رکھا کرو۔“

”اُف!“

وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ جلدی سے اپنا بیگ لے کر اس سے پہلے ہی آفس سے نکل آئی تھی۔ مگر

آتے ہی اس کا دل جاکسی کوئے میں چھپ کر خوب روئے۔ لیکن یہ خیال کہ کسی کے پوچھنے پر کیا جواب دے گی،

اسے رونے بھی نہیں دے رہا تھا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر جین میں آئی تو وہاں پائے کو کھڑے دیکھ کر بگڑ گئی۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں امی؟... کیا پھر بیمار پڑھئے؟ ارادہ ہے؟... چھوڑیں یہ سب، میں کر لوں

گی۔“

”جیٹا!... تم خود بھی ہوئی آئی ہو۔“

”کوئی نہیں سمجھی ہوئی، آپ چلیں، اندر چلیں۔“

اس نے کہتے ہوئے چوہا بنا بند کر دیا۔

”جیٹا!... بیٹھے بیٹھے کر تھک گئی ہوں۔ بس دو چار روٹی ڈال لوں پھر.....“

”بالکل نہیں!... انا ابا آجائیں پھر میں روٹی ڈال دوں گی۔“

وہ زبردستی ٹائیڈ کو کھینچتے ہوئے اندر لے آئی۔

”سنو!“

ٹائیڈ اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔

”تم آفس میں پریشان تو نہیں ہوتی؟“

”نہیں تو، مگر کیوں؟“

وہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

”تمہارے انا ابا پریشان ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں، چنانچہ تم کام کر پاؤ گی کہ نہیں؟“

ٹائیڈ نے بتایا تو وہ ہنس پڑی۔

”انا ابا تو بس ابھی تک مجھے پتی ہی سمجھتے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں، میں گریجویشن کر چکی ہوں۔“

”پتا ہے انہیں۔“

ٹائیڈ اس کا گال ٹھیک کر مسکرائی تھی۔

”اچھا!... آپ آرام سے بیٹھیں، میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔ جب سے آفس جوائن کیا ہے، روٹی

سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”ہاں!... اوہ بھی شکایت کر رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے!... میں جا رہی ہوں۔“

وہ جلّت میں کہتے ہوئے بیڑھیں پھلا کر آئی تو پہلے فون پر سے ملاقات ہو گئی۔

”السلام علیکم آنتی!“

”ولیکم السلام!... بڑے دنوں بعد آئی ہو۔ امی کیسی ہیں؟“

فون پر سے جواب کے ساتھ سوال کر دیئے۔

”امی اب کافی بہتر ہیں۔“

اس نے روٹی کی کٹلاں میں ادھر ادھر نظر میں دوڑاتے ہوئے جواب دیا تو فون پر کچھ کر بولی۔

”روٹی کرے میں ہے، وہ ہیں چلی جاؤ۔“

”جی!“

وہ سر ہلاتی ہوئی روٹی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر ہلکی گئی۔

”بڑی نواب ہو تم!... اسی انتظار میں رہتی ہو کہ میں تمہارے پاس آؤں، تم نہیں آسکتیں کیا؟“

”نہیں!... تمہارے گھر میں وہ جو بھالور جتا ہے نا، اسے میرا آنا پسند نہیں ہے۔“

روٹی نے کہا تو وہ سمجھ کر بولی۔

”شوٹی کا تو دماغ خراب ہے۔“

”اچھا چھوڑو!... ایہ بتاؤ، تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟... مزہ آ رہا ہے؟“

روٹی نے پوچھا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

”کیسا مزہ آ رہا ہے یار!... یہ بھی کوئی جاب ہے؟“

”کیا مطلب؟“

روٹی نے کٹھن سے پردہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”تاؤ ناں کیا ہوا ہے؟“

روہی نے اس کا ہاتھ ہلا کر اسرار کیا تو وہ شش و پنج میں گھر کر بولی۔

”پہلے وعدہ کرو، کسی کو تاؤ کی نہیں، میرا مطلب ہے، میری جاب کی نوعیت..... بس مجبوری سے کر رہی ہوں، ورنہ.....“

”اوہ.....! میں کس کو تاؤں گی؟ چلو پھر بھی وعدہ کرتی ہوں۔“

روہی کو جانے کی جلدی تھی، پورا نوک کر وعدہ کر لیا تو قدرے زک کردہ کہنے لگی۔

”اصل میں میرے پاس ڈگری کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ کوئی کورس نہ تھی، اس لئے پہلے تو مجھے رجسٹرڈ کر دیا گیا، لیکن پھر باس نے مجھے ایک اور جاب آفر کی، اور کہا کہ اس دوران میں انٹرنشیل کام بھی کیے سکتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، تم اصل بات تاؤ۔ کیا جاب آفر کی باس نے؟“

روہی کے بے سمجھری پر وہ دلی سے تانے لگی۔

”باس کا ایک بیٹا ہے اور وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ شاید اس سے شاید بھی کرنا چاہتا ہے، لیکن باس

نہیں چاہتے، اور انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کے بیٹے کو اس لڑکی کے چنگل سے نکالوں۔“

”اُہ.....!“

روہی ہنسنے لگی تو وہ دانت پیس کر بولی۔

”ہنس کیوں رہی ہو.....؟“

”تو اور کیا کروں؟ مزے کی جاب ہے۔ ویسے باس کا بیٹا ہے کیسا؟“

روہی نے معظوظ ہو کر پوچھا تو وہ چڑھ کر بولی۔

”شوبی سے بھی بڑا.....“

”خیر.....! شوبی اتنا برا تو نہیں ہے۔“

اس نے اپنی پریشانی میں روہی کی بات محسوس نہیں کی، اور پوچھنے لگی۔

”تم تاؤ، اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتی ہوں.....؟“

”کچھ نہیں.....! آرام سے انٹرنشیل کام سنبھالو، پھر جو بھی ہو جائے گا، پھر کہیں اور اپلائی کر دیتا۔“

روہی نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر شور و دیا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اس نے سارہ کو خوب شاپنگ کرائی تھی۔ پھر چائے زمر کے بعد گھر لوٹا تو اسے علی احمد اپنی بیوی زویہ کے

ماٹھ جیسے اس کے انتظار میں ہی بیٹھے تھے، دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“

”جی..... وہ..... ایک دوست آرہا تھا لندن سے، اسے ریسید کرنے چلا گیا تھا۔“

وہ اندر سے خائف ہو گیا تھا۔

”کون سا دوست؟“

علی احمد کے مشکوک انداز پر وہ جزبہ ہو کر بولا۔

”آپ نہیں جانتے اسے۔“

”اچھا.....! کوئی نیا دوست ہے کیا.....؟“

مزید ترجہ پر وہ چڑھ گیا۔

”ڈیڈ.....! میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں.....؟“

”یہ میں نے کب کہا.....؟ میں تو پوچھ رہا ہوں، کوئی نیا دوست ہے جسے میں نہیں جانتا.....؟“

علی احمد شاید اسے بحث سے باز نہیں دیتے تھے، جب ہی زویہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھانا لگوائی ہوں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

وہ ناراضی سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے وہ سارہ کے ساتھ جتنا خوش تھا، اب اسی قدر

اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہوتا ہے کہ زویہ کے آنے پر ایک دم اٹھ بیٹھتا ہے۔

”شادی بیٹا.....! تمہیں اپنے ڈیڈ سے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا۔“

زویہ نے آتے ہی نرمی سے ٹوکا، لیکن وہ تلخ ہو رہا تھا۔

”سچ بول کر مجھے کون سا تھمفل جائے گا.....؟ یوں بھی ڈیڈی سب جانتے ہیں، پھر مجھے سے سوال کیوں

کرتے ہیں.....؟ کہاں جا رہے ہو.....؟ کہاں سے آرہے ہو.....؟ ممی.....! میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔“

”بچے نہیں ہوتو پھر مجھتے کیوں نہیں.....؟“

زویہ زچ ہوئی تھی۔

”سب سمجھتا ہوں، آپ لوگ بتائیں کیا سمجھنا چاہتے ہیں مجھے.....؟ ڈیڈی نے بچپن میں مجھے اپنی انگلی

تھامی تو پھر بھول ہی گئے کہ میری اپنی بھی کوئی سوچ ہو سکتی ہے۔ وہ جانتے ہیں میں ساری زندگی ان کی انگلی تھام کر

چلا رہوں، تو اب میں ان کے اشاروں پر نہیں چل سکتا۔ مجھے اپنی زندگی جینیے دیں۔“

وہ انتہائی شامی ہو کر بول رہا تھا۔

”ضرور جیو، اپنی زندگی جیو، لیکن پہلے صبح راستے کا تھمن تو کرو۔ تم تو بھوک رہے ہو۔“

زویہ نے کہا تو وہ سر پیلے ہو۔

”میں جھٹک رہا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔! تم نے اپنے لئے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے، اس کا بیک گراؤ نہ جانتے ہو۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔! اور میں جانتا بھی نہیں چاہتا۔“

اس کی ہتھ دھری پر زویہ کو غصہ آ گیا۔

”تو پھر تم بھی سن لو۔ تمہارے ڈیڑی اور میرے لئے بھی سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس گھری بہ وہی بن سکتی ہے جس کی پچھلی سات پشتوں میں کسی گندے خون کی آمیزش نہ ہو۔“

”مام۔۔۔! ایسا کچھ نہیں ہے۔ سارہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”شٹ آپ۔۔۔!“

زویہ سر جھٹک کر چلی گئی تو اس نے سارے کام غصے میں کئے تھے، یعنی جو تے اُٹا کر پھینکے، کپڑے بدلے، پھر منہ سر لپیٹ کر سو گیا تھا، اور اگلے دن وہ کسی موزوں آفس آیا تھا کہ مشعال کو اپنی پچھلا تلاش کرتے دیکھ کر مزید گڑ گیا۔

”آپ میری پھیل پر کیا کر رہی ہیں۔۔۔؟“

”سر۔۔۔! وہ۔۔۔۔۔ سر۔۔۔! یہ فالتیں میں نے سوچا۔۔۔“

وہ اس افتاد پر پریشان ہو گئی تھی۔

”دیکھیں مَس۔۔۔!“

وہ دارنگ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہنے لگا۔

”آپ اپنے دماغ کو زحمت نہ دیں تو اچھا ہے، کم از کم میرے معاملات میں۔ نہیں یہاں سے۔۔۔“

”جی۔۔۔؟“

وہ خائف ہو کر اپنی سینٹ پر آ بیٹھی۔ پھر کن اکیوں سے اسے دیکھا، وہ لیپ ٹاپ میں مصروف ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد لازم چائے کی ٹرے لے کر آیا تو مشعال نے فوراً اٹھ کر اس سے ٹرے لے لی اور اسے جانے کا اشارہ کر کے ٹرے شامان کی پھیل پر رکھی۔ پھر کپ سیدھے کر کے پوچھنے لگی۔

”سر۔۔۔! شکر تھی لیں گے۔۔۔؟“

”ایک چمچ۔۔۔!“

شامان نے بلا ارادہ اسے دیکھا تھا۔ مشعال نے کپ میں چائے بنا کر پھر اسے متوجہ کیا۔

”سر۔۔۔! چائے۔۔۔“

وہ متوجہ نہیں ہوا، تب کہنے لگی۔

”سر۔۔۔! آپ کے آنے سے پہلے آپ کے لئے فون آیا تھا۔“

اس نے ابھی بھی فون نہیں لیا تو وہ مزید گیا ہوئی۔

”سر۔۔۔! سارہ کا فون تھا، کہہ رہی تھیں، آپ اپنا پتل فون آن رکھا کریں۔“

سارہ کے نام پر جیسے اس نے فوراً دیکھا تھا، پھر فوراً جب سے اپنا پتل فون نکال کر آن کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”خالہ۔۔۔!“

شونہ کپڑے تہہ کرتی ٹائیڈ کو پکار کر پوچھنے لگا۔

”اس دن ٹانا بکایا کہہ رہے تھے؟ میرا مطلب ہے، میرے باپ اور چچا کے بارے میں۔۔۔؟“

”جب تم سن چکے ہو تو پھر کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟“

ٹائیڈ اندر سے خشکی ضرور تھی، لیکن اس پر ناگواری جتناہی۔

”ہاں۔۔۔! سن لیا تھا میں نے، پھر بھی آپ بتائیں مجھے۔“

شونہ نے بدتمیزی سے کہا۔

”مجھے نہیں پتا، جو پوچھنا ہوا ہے باپ سے پوچھو۔“

ٹائیڈ نے سر جھٹک کر تہہ کئے ہوئے کپڑے الماری میں رکھے، پھر پلٹ کر شونہ سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ روٹی کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”السلام علیکم آئی۔۔۔!“

”وعلیکم السلام۔۔۔! کیا حال ہے بیٹا۔۔۔؟ امی کسی ہیں۔۔۔؟“

ٹائیڈ نے کوشش سے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”جی ٹھیک ہیں۔ امی نے آپ کے لئے یہ آلو کے پرائے بھیجے ہیں۔“

روٹی پلٹ ٹائیڈ کی طرف بڑھا تو بے مزید گویا ہوئی۔

”یہ صرف آپ کے لئے ہیں آئی۔۔۔! آپ ہی کھائیے گا، کسی اور کو مت کھائیے گا۔“

”کوئی اور کھانا بھی نہیں سہڑے ہوئے پرائے۔“

وہ روٹی کا اشارہ سمجھ کر سگ کر بولا تھا۔

”شونہ۔۔۔!“

ٹائیڈ نے اسے ٹوکا تو روٹی فوراً بولی تھی۔

”ارے نہیں آئی۔۔۔! میں نے برا نہیں مانا۔“

”اچھا تم بیٹھو، میں ٹیبلٹیں لے کر آتی ہوں۔“

ٹائیپہ کہتے ہوئے چلی گئی تو روٹی اس کی طرف گھوم کر بولی۔

”یہ تم ہر وقت انگارے کیوں چباتے ہو؟ آرام سے، پیار سے بات نہیں کر سکتے؟“

وہ ہونٹ پیچھے کر کے گھورنے لگا، یوں جیسے کچا چا جائے گا، اور وہ ڈرا خانف نہیں ہوئی۔

”جتنا مرضی گھور لو، میری صحت پر اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ اُنکا تہباری اپنی آنکھیں پیچھتی ہو جائیں گی،

ایسے!“

روٹی نے اپنی آنکھیں پیچھتی کیں تو وہ تھلا کر اٹھا تھا اور اس سے پہلے کس پر جھپٹا، وہ بھاگ گئی۔

”بد تیز!“

وہ منہ ہی منہ میں اسے گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس کے اندر اُلّا وُد بک رہا تھا۔ ٹائیپہ نے اس کی

بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ کہہ کر دامن بچا لیا کہ اپنے باپ سے پوچھو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، باپ سے کہا

پوچھتے۔؟ اب تک تو وہ اپنی ماں کو قصور وار سمجھتا رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس لئے وہ اس سے بات

بھی نہیں کرتا تھا۔

بہر حال اس دن خاصی تنگ و دو کے بعد وہ اپنے باپ کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اسی

وقت اسے فون کر ڈالا۔

”شعبہ بات کر رہا ہوں، شولی۔“

اس نے کال ریسیو ہوتے ہی کہا تو دوسرے چوٹک کر پوچھا گیا۔

”شولی؟“

”لگتا ہے، ماہو سال کی گردش نے آپ کے ذہن سے میرا نام مٹا دیا ہے۔“

اس کے طنز پر ادھر عباد بے چین ہوئے تھے۔

”نہیں نہیں! کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔؟ تم؟ تم کہاں ہو۔؟ مجھے بتاؤ، میں ابھی تمہارے

پاس آتا ہوں۔“

”جی نہیں! آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی دن خود حاضر ہو جاؤں گا۔“

وہ روڈ لی بولا تھا۔

”کسی کیوں بیٹا؟ ابھی آ جاؤ۔۔۔!“

بے قراری سے کہا گیا۔

”ابھی؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں ہاں! ابھی آ جاؤ، کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”مسئلہ تو اب ہوگا۔“

اس نے کہہ کر سیل آف کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شامان مسلسل سارہ کو فون پر منانے میں لگا ہوا تھا۔

”بی بی سارہ! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔

اچھا! تم براش کیوں ہو رہی ہو؟ چلو غصہ تھوک دو۔

اوکے بابا۔! میں، اسے شام میں آ جاؤں گا۔

ابھی نہیں! ابھی تو۔۔۔“

ادھر سے فون بند ہو گیا تو اس نے زنج ہو کر اپنے سیل فون کو دیکھا۔ پھر بار بار سارہ کا نمبر دیکھا، لیکن

سارہ نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ تب وہ بے چین ہو گیا اور علی احمد کی وارنٹک کے باوجود سارہ کے پاس جانے کو

تیار ہو گیا۔ دروازے تک پہنچا تھا کہ مشعال نے ایک دم پکار لیا۔

”سر۔۔۔!“

اس نے زک کر دیکھا تو مشعال نے جلدی سے گلدان میں سے گلاب کا پھول نکال کر اس کی طرف بڑھا

دیا۔

”سر۔۔۔! آئی مین، آپ اپنی دوست کو گلاب دیں گے تو وہ نورمان جائیں گی۔“

”شیڈر۔۔۔؟“

اس نے مشعال کے ہاتھ سے گلاب لیتے ہوئے کہا۔

”شیڈر۔۔۔!“

”جھیک پو۔۔۔!“

وہ ہلکے سے سکرایا، پھر جاتے جاتے زک کر پوچھنے لگا۔

”وہ۔۔۔ کیا نام ہے آپ کا۔۔۔؟“

”مشعال۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔ جس مشعال! اڈیڈی اگر میرا پوچھیں تو کہیں گے، میں سائنٹ پر گیا ہوں، اوکے!۔۔۔!“

وہ کہہ کر باہر نکل آیا، اور پندرہ منٹ میں ہی وہ سارہ کے پاس تھا۔

”ہائے!“

وہ سارہ کے رونے پر غصے چہرے پر نظر کیا جھا کر بولا۔

”کم آن یار! آتو گیا ہوں۔“

”بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔“

سارہ تنک کر بولی تھی۔

”اوہو! اچھا دیکھو۔“

اس نے ایک دم یاد آئے پر کوٹ کی جب سے گلاب نکال کر سارہ کے سامنے کیا تو وہ جیسے لہجے میں

بولی۔

”یہ کیا ہے؟“

”گلاب ہے، گلاب۔! میری محبت کا حسین تحفہ۔“

اس نے جتنی محبت سے کہا، سارہ اسی قدر حقارت سے بولی تھی۔

”حسین تحفہ؟ اب یہ میری اوقات ہے؟... راہ چلتے چھوٹو توڑ کے مجھے جیش کرو گے۔؟ محبت کا

حسین تحفہ؟... ہا۔! نہیں چاہئیں مجھے ایسے حسین تحفے۔“

سارہ نے ہل میں گلاب منسل کر اس کے سامنے پھینک دیا تو وہ افسوس اور حیرت میں گھر گیا۔

”محبت کسی تحفے کی محتاج نہیں ہوتی شامی!۔“

سارہ نے فوراً پیئٹر ابدلاتھا۔

”میں جانتی ہوں تم میرے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لاتے ہو، لیکن مجھے یہ سب نہیں چاہئے۔ میں

صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔“

”میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت، ہر ہل میرے ساتھ ہو۔“

اس نے کہا تو سارہ راز پوچھنے لگی۔

”مجھ پر یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”نہیں! کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اصل میں میرے ڈیلی ڈرا پرانے خیالات کے ہیں۔ انہیں

باپردہ، سلیقہ مند اور مورخانہ داری میں ماہر بہو چاہئے۔“

اس نے بتایا تو سارہ چیخ پڑی۔

”کیا؟ تمہارا مطلب ہے، اب میں برقع اوڑھنا شروع کر دوں؟ اور کمر میں دو پتہ کس کر

سارے گھر میں جھانڈو لگا دوں؟“

”نہیں نہیں!۔! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

وہ شہنشاہی کرتا۔

”پھر کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“

”مطلب، مجھے ڈیلی ڈرا کے خیالات بدلنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

اس نے بات بنائی تھی۔

”کچھ وقت؟... قائم رہنا اپنی بات پر۔ زیادہ وقت نہیں ہونا چاہئے، ورنہ میری مہاجھے کسی اور کے

بازو زخمت کر دیں گی۔“

سارہ نے کچھ وقت پر زور دے کر کہا تو وہ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر پوچھنے لگا۔

”تم ہو جاؤ گی کسی اور کے ساتھ زخمت؟...؟“

”کبھی نہیں!۔!۔“

سارہ کے کلک کلکانے پر اس کی رُئی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ اگلا وقت طے کر کے وہ

دہلی افس آ یا تو علی احمد اس کے روم سے نکل رہے تھے۔

وہ پریشان ہو کر دوسری سمت بڑھا تھا کہ انہوں نے پکار لیا۔

”شامی!۔!۔“

”جی ڈیل!۔!۔“

اس نے اطراف میں نظر ڈالی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اس کے خیال میں ڈانٹ پڑنے والی تھی۔

”شام میں سرفراز والوں کی میٹنگ ہے، تم پہنچ جانا۔“

علی احمد نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

”پہنچ جاؤں گا ڈیل!۔!۔“

”بھولنا مت!۔!۔“

علی احمد کہتے ہوئے اپنے روم میں چلے گئے تو وہ شکر کرتے ہوئے اپنے روم میں آتے ہی مشعال سے

اپنے

”آپ نے ڈیل سے کیا کہا تھا۔؟“

”کچھ نہیں سر!۔! میں نے کہا کہ آپ ابھی باہر گئے ہیں۔“

”تھینک گاڈ!۔! اینڈ تھینک یو!۔!۔“

وہ مسکرا کر اپنی ٹیبل کی طرف جاتے جاتے پھر پلٹ آیا اور جب سے مسلے ہوئے گلاب کی پتیوں نکال کر

مشعال کے سامنے ٹیبل پر ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

”سوری مس!۔! سارہ ایسی محبت پر یقین نہیں رکھتی جو چٹکیوں میں مسل دی جائے۔“

مشعال کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ دھیرے سے کچھ بولی بھی جسے سن کر بھی وہ اُن کی کر کے اپنی ٹیبل کی

طرف بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شوہن اپنے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی پھیلی ہاتھوں کو بیکسر نظر انداز کئے انتہائی چستی ہوئی نظر سے انہیں دیکھ جا رہا تھا۔

”سنا بیٹا! میں بہت تڑپا ہوں تمہارے لئے، ایک بار میرے سینے سے لگ جاؤ۔“

عباد نے کہا وہ لٹی میں سر ہلا کر بولا تھا۔

”پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔ آپ نے میری ماں کو طلاق کیوں دی تھی؟“

”وہ میں..... میں مجبور تھا بیٹا۔“

عباد بڑا گھٹے گئے۔

”آپ مجبور تھے؟“

شوہن کے چہرے طفرے انہیں لا جواب کر دیا۔

”تیس عباد صاحب..... میں اصل حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔“

”اصل حقیقت؟ بیٹا۔“

”مت کہیں مجھے بیٹا۔“

شوہن بد لحاظ ہو رہا تھا۔

”میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔“

”اب اسات کو شوہن! میں مانتا ہوں، میں تمہارا گھبراہٹوں۔ میں نے ظلم کیا تم پر تمہاری ماں، لیکن اس کے بعد یقین کرو، میں خود کسی چین سے نہیں رہا۔ اپنا گھر میں نے خود اجاڑا تھا۔ تمہاری ماں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے تمہیں جو بتایا ہوگا، وہی سچ ہے۔“

عباد بہت عاجزی سے بول رہے تھے۔

”میری ماں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

اس کے لیے میں ماں کے لئے بھی ناراض تھی، جسے محسوس کر کے عباد پوچھنے لگے۔

”پھر تم مجھ سے بدگمان کیوں ہو؟“

”صرف آپ سے نہیں، میں اپنی ماں سے بھی بدگمان ہوں۔ آپ دونوں خود غرض تھے۔ اپنی الگ دنیاؤں میں مگن ہو گئے۔ میرا کسی کو خیال نہیں آیا۔ جب ایسے ہی لاوارثوں کی طرح مجھے چھوڑ دینا تھا تو پھر پیدا کیا تھا؟“

اس کے اندر غبار بھرا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟ تمہاری ماں.....“

عباد جیسے کچھ کہہ بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔

”جیسے آپ میری ماں کہہ رہے ہیں، وہ اپنے دوسرے شوہر کے بیچ پال کر ثواب کما رہی ہے، اور آپ

یقیناً اپنے بچوں میں مگن ہوں گے۔“

شوہن نے نغوت سے سر جھکا تھا۔

”نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہے۔ قدرت نے مجھے میرے کئے کی سزا دی ہے شاید کہ پھر مجھے اولاد کی نعمت

بخشی ہی نہیں۔“

عباد اعتراف کر کے تادم نظر آنے لگے تھے۔ شوہن کے چہرے پر ایک لحظہ کو طفریہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ پھر

وہ سر جھٹک کر جانے لگا کہ عباد تیزی سے اس کے سامنے آگئے اور زبردستی اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے لیا، تو پہلے اس

نے جیسے کوئی رافزارنٹ پاکران کے سینے میں منہ چھپایا تھا، لیکن پھر اسے لگا جیسے یہاں سے فرار ممکن ہی نہیں ہے۔

”اوپو! اوپو! اوپو!“

وہ بہت ٹوٹ کر رو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

مشعال صبح کے لئے اپنا سونٹ پر بس کرتے ہوئے اپنی ہی کسی سوچ میں تھی کہ ٹائیڈ کی آواز سن کر چونک کر پوچھنے لگی۔

”کچھ کہہ رہی ہیں امی؟“

”ہاں! میں کہہ رہی ہوں۔ شوہن ابھی تک نہیں آیا، پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے؟ تمہارے نانا اب

پریشان ہو رہے تھے۔“

ٹائیڈ کے لیے میں بھی تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

”خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں نانا اب اور آپ بھی۔ شوہن بچہ نہیں ہے، آجائے گا۔“

اس نے استری کا پلگ نکالتے ہوئے کہا، پھر ٹائیڈ کی تشویش محسوس کر کے اس کا دھیان بنانے کی غرض

سے بولی تھی۔

”دیسے امی! مجھے لگ رہا ہے، شوہن کسی لڑکی کے پکڑ میں آ گیا ہے۔“

”شوہن نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟“

ٹائیڈ نے فوراً پوچھا تو وہ شپٹا گئی۔

”نہیں! کہا تو نہیں ہے، لیکن“

”بس!“

”انیس نے اسے ٹوک دیا۔“

”اپنے آپ فضول باتیں نہ فرض کر لیا کرو۔“

”چلیں، آپ فرض کر لیں، اگر ایسا ہوا تو“

”مشعال!“

”انیس جتنی سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شوبی کے آنے پر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگی۔“

”کہاں چلے گئے تھے؟“

”دیکھیں خالد! میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں؟“

شوبی نے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں پکڑے شاپنگ بیگ اوپر اٹھا کر کہا تو ثانیہ کے

ساتھ مشعال کے چہرے پر بھی حیرت پھیل گئی تھی۔

”خالد! یہ آپ کے لئے ساڑھی اور یہ سوٹ، اس میں آپ کی شال ہے اور یہ ٹانا ابا کا سوٹ۔ یہ

مشعال! تمہارے لئے، اس میں تمہارے سوٹ ہیں۔“

وہ ایک ایک شاپنگ بیگ دکھا کر رکھ رہا تھا۔

”شوبی بیٹا! یہ سب کہاں سے آئے؟“

”انیس نے حیرت میں گھر سے پوچھا تو شوبی لا پرواہی سے بولا۔“

”بازار سے!“

”بازار سے تو آئے ہیں، لیکن پیسے... پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“

”آگے کہیں سے بھی، آپ آم کھانے سے مطلب رکھیں خالد! بیڑ گھنٹے کھڑی ہوں گی تو سر میں

چاندی اتر آئے گی۔“

شوبی اسی بے نیازی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ جو حیرت میں کھڑی تھی، ثانیہ کے دیکھنے پر یک

دم حرکت میں آگئی اور تمام شاپنگ بیگ اٹھا کر تیزی سے شوبی کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تمام بیگز

اس کے سامنے پھینک کر بولی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو تمہاری ان چیزوں سے میں، امی اور ٹانا بابر خوش ہو جائیں گے۔“

”میں کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لایا۔“

”پھر؟“

وہ تیسری نظر سے دیکھنے لگی۔

”ضرورت کی چیزیں ہیں، اگر لے آیا ہوں تو کون سی قیامت آگئی ہے؟“

شوبی کو غصہ آ گیا تھا۔

”قیامت چیزوں سے نہیں، اس بات سے آئی ہے کہ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“

اس نے کہا تو شوبی مزید چڑ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، چوری کی ہے میں نے یا ڈاکو ڈالا ہے؟“

”اگر تم سچ نہیں بتاؤ گے تو ہم یہی سمجھیں گے۔“

وہ ڈرا سے رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔ شوبی خاموش ہو گیا تو وہ اسے بھیجیڑنے لگی۔

”بتاؤ شوبی! امی بہت پریشان ہو رہی ہیں اور صبح جب ٹانا بابر کو چٹیلے گا تو وہ امی سے زیادہ پریشان

ہوں گے۔“

”تو سچائی سن کر کون سا خوش ہو جائیں گے؟“

شوبی عاجز ہو گیا تھا۔

”نہ ہوں خوش، لیکن انہیں یہ اطمینان تو ہو جائے گا کہ تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بتاؤ شوبی! چلو،

میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

اس نے مسکراتے انداز اختیار کیا تو وہ چڑ کر بولا۔

”ہنا بھی دوں تو مجھے فرق نہیں پڑے گا۔ میں اپنے ابا کے پاس گیا تھا۔“

”کسک... کیا...؟ تمہارے ابا؟“

وہ بے ساختہ جیٹی تھی۔

”ہاں! ادا دیا جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابا نے اگر مجھے پیسے دیے ہیں تو کوئی احسان نہیں کیا۔

بھرا حق ہے ان پر۔“

”ٹھیک ہے تمہارا حق ہے، ہمارا نہیں۔“

وہ کہہ کر چلی گئی کہ شوبی اس کے سامنے آ گیا۔

”ایک بات بتاؤ شوبی! اگر تمہارے ابا تمہارے سامنے آ جائیں تو کیا تم ان سے مزہ موز لوگی؟“

”ہاں نہیں!“

وہ اسے دیکھ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی، پھر اس نے ثانیہ کو تو مطمئن کر دیا، لیکن خود ڈسٹرب

ہو گئی تھی۔



لگے۔

”کیا بات ہے بھئی؟“

”وہ... علی! میں آپ کو شادی کا بتانا چاہتی ہوں۔ بہت اموشل ہو رہا ہے۔ مرنے مرنے کی آواز سن رہی ہے۔“

زوبیہ بتاتے ہوئے رو پائی ہوئی، پھر بھی علی احمد نے نہ سنے۔

”اچھا...!“

”علی! پلیز اس بات کو مذاق میں نہ لیں۔ خدا خواستہ شادی نے اگر اپنے ساتھ کچھ کر لیا تو...؟“

اس نے کہا تو علی احمد ایک دم سخت ہو گئے۔

”کچھ نہیں کر سکا وہ، مجھ سے نہیں اموشل بلکہ میل کر رہا ہے۔ تم اس کی دھمکیوں میں مت آؤ۔“

”پھر میں کیا کروں؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“

اس کی بے بسی پر علی احمد مزید جھجھکا گئے۔

”کیا سمجھ نہیں آ رہی؟“ ”نہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر شادی تمہیں زیادہ فورس کرے تو

میرے کو، مجھ سے بات کرے، میں اس کے مزاج ٹھکانے لگا دوں گا۔“

”فارگ ڈسک علی! میں دنگ فساد نہیں چاہتی۔“

”پھر کیا چاہتی ہو؟“

”آپ پیار سے شادی کو سمجھائیں اور اگر اس کی بات بھی سن لیں تو...“

”نہیں!“

علی احمد نے فوراً انگلی اٹھائی تھی۔

”مجھے اس کی کوئی بات نہیں سننی اور ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”ایسا کیسے چلے گا علی؟“

وہ عاجز ہو کر بولی۔ علی احمد نے کوئی جواب نہیں دیا، اٹھ کر چلے گئے تو وہ کچھ بچ کر رو پڑی۔

☆ ☆ ☆

شامان کی خدمت سے زوبیہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرنے؟ شامان اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اب وہ اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی، جلدی اس کی شادی ہو اور پھر اس کے بچوں سے گھر میں رونق ہو۔ اسل میں وہ تنہا ہی رہے بھی گھبرا گئی تھی۔

بہر حال اس وقت اس نے شامان کو اس کی خدمت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ اٹا اسے سمجھانے لگا۔

”آپ سمجھتی کیوں نہیں کی؟ سارہ کے گھر والے اسے میرے انتظار میں بٹھائے نہیں رکھیں گے۔

اس کی شادی کہیں اور کر دیں گے، اور آپ سن لیں، اگر سارہ کی کہیں اور شادی ہوگی تو پھر میں کبھی شادی نہیں کروں گا مگر کبھی نہیں۔“

”شادی؟“

زوبیہ نے تڑپ کر فو کا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟“

”ہاں! ہو گیا ہوں پاگل، اور آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ میں جیوں یا مروں۔“

شامان نے مزید اسے تڑپا دیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا؟“ ”میں تمہارے دشمن۔“

”بس رہتے دیں می! جب آپ کو اور ڈیڑی کو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ جو بھی

ہو۔ میں کچھ کر رہا ہوں، مجھے سارہ نے نفی تو میں مر جاؤں گا۔“

”اللہ نہ کرے۔ مجھے بتاؤ، کہاں رہتی ہے سارہ؟“ ”میں اس کے گھر جاؤں گی۔ تمہارے ڈیڑی نہیں

مانتے نہ مانیں۔ میں تمہاری سارہ سے شادی کر اؤں گی۔“

زوبیہ مانتا سے مجبور ہو گئی تھی۔

”میں کچھ کر رہی ہوں بیٹا! میرے اختیار کرو۔“

”ایسے نہیں کی! پہلے آپ ڈیڑی کو مانتا میں، پھر آپ دونوں میرا پر پوزل لے کر جائیں گے اور یہ

کام جلدی ہوتا چاہیے۔“

شامان نے اپنی خوشی ظاہر نہیں ہونے دی، ہنوز زروشا انداز اختیار کئے رکھا تو زوبیہ اس کا گال تھپک کر

بولی۔

”میں بھی تو جلدی تمہاری شادی کرنا چاہتی تھی، اور میں ابھی تمہارے ڈیڑی سے بات کرتی ہوں۔“

”صرف بات نہیں کرنی ہے کی! انہیں مانتا بھی ہے۔“

اس نے کہا تو زوبیہ انتہا میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ علی احمد فوراً پر کسی سے

بات کر رہے تھے۔ زوبیہ خاموشی سے بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جب وہ فارغ ہوئے تو اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر

ناشتے پر علی احمد نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی کہ وہ آفس ٹائم میں جب چاہے اٹھ کر ادھر اٹھ جاتا ہے، اور آفیس میں انہوں نے دارنگ دہی کی کردہ آئندہ اس کی ایسی حرکت نظر انداز نہیں کریں گے۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہا تھا اور پھر ناشتہ کئے بغیر ان سے پہلے ہی آفس کے لئے نکل آیا تھا۔ وہ لوہا فاکر ضرور اس کی می نے سارہ کی بات کی ہوگی، جس کا غصہ انہوں نے اس طرح نکالا تھا۔

بہر حال اسے یہ سب منظور تھا، لیکن سارہ سے دستبرداری منظور نہیں تھی۔ جب ہی ساری باتیں اکیلی سے جھجک کر وہ آفس میں داخل ہوتے ہی رُک گیا اور بے ساختہ نظریں اور گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ طرف گلاب کے پھول سے تھے اور دیوار پر پتی برتھ ڈے کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوش گوار تاثر تھا کہ مشعال سامنے آکر بولی تھی۔

”پتی برتھ ڈے سر۔۔۔!“

وہ چونک کر مشعال کو دیکھتے ہی ایک دم بگڑ گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔؟“

مشعال نے بوکھلا کر اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو دیکھا تو وہ ان سب کی طرف رخ موڑ کر غصے

بولے۔

”کس نے کیا ہے یہ سب؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کس نے کیا ہے یہ سب۔۔۔؟“

”سر۔۔۔ اوہ۔۔۔ میں۔۔۔“

مشعال کے حلق میں لفظ اُٹک گئے۔

”آپ؟“

وہ فوراً اس کی طرف گھوما تھا۔

”آپ یہاں کام کرنے آئی ہیں یا چلک مٹانے؟ اپنے ساتھ باقی لوگوں کا بھی وقت خراب کر لی

ہیں آپ۔۔۔؟“

”آئی ایم سوری۔۔۔!“

”سٹ آپ۔۔۔! جائیں آپ لوگ اپنی اپنی سیٹ پر۔“

سب لوگ مرجھائے ہوئے چلے گئے۔

”بائیں یہ سب۔“

وہ مشعال سے کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اس کے موبائل کی ٹون بجنے لگی۔ اس نے جب سے موبائل

نکلایا اور اسکرین پر سارہ کا نام دیکھتے ہی کال ریسیڈ کی تھی۔

”جنتا۔۔۔! ابھی ابھی آفس پہنچا ہوں۔“

اس کا موڈ یکدم سخت خوش گوار ہو گیا تھا۔ سارہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی نظریں باہر ارادہ مشعال

دیکھ رہی تھیں جو خلوص سے سچائے گئے جگہ سے سمیٹ رہی تھی۔ پھر وہ سب لے کر درم سے نکل گئی اور جب انہیں

آکر اپنی سیٹ پر بیٹھی تو اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ شامان نے نہ اس کا جانا محسوس کیا اور نہ آنا وہ اب سارہ

منار تھا۔

”یار۔۔۔! شام کو کھانا، اس وقت آفس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

اچھا پلیز۔۔۔! ناراض مت ہو۔

ٹھیک ہے بابا۔۔۔! ٹھیک ہے۔“

دوہیل آف کر کے سوچنے لگا کہ اب علی احمد سے کیا بہانہ کرے؟ ابھی صبح ہی تو انہوں نے اسے وارننگ دی تھی۔ سوچتے ہوئے اس کی نظر مشعال پر پڑی تو اچانک اسے بہانہ سوچ نہ گیا۔ فوٹو اُٹھا، لیکن پھر سنبھل کر مشعال کی ٹیبل پر آکر کھینچ لگا۔

”بس مشعال۔۔۔! آئی ایم سوری۔۔۔! مجھے انہیں کرنا چاہئے تھا۔“

مشعال نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”مشعال۔۔۔! پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ آئی ایم رینگی ویری سوری۔۔۔! ام۔۔۔ میں نے آپ کو بہت

ہرٹ کیا۔ یقین کریں، میں بہت کئی گنا کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو۔۔۔“

اس کے دیکھنے پر ایک لحظہ رُک کر بولے۔

”میرا مطلب ہے، چلیں۔۔۔! ہاں بس چلیں۔“

”سر۔۔۔! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بالکل نہیں سمجھ رہی۔“

وہ واقعی اس کی آخری بات نہیں سمجھتی تھی۔

”میں سمجھاتا ہوں، سب سمجھاتا ہوں۔ آپ آئیے پلیز۔۔۔!“

اس کے اصرار پر مشعال ابھی بھی نہ سمجھنے کے انداز میں اُٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی، اور جب آفس

سے نکل کر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو مزید اُلجھ گئی۔

”سر۔۔۔! آپ۔۔۔“

”دینیٹس پلیز۔۔۔!“

وہ اسے سمجھنے اور بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے ہی فوراً دروازہ بند کیا اور خود

ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہی گاڑی اشارت کر کے چمکنے سے آگے بڑھادی۔

”سر۔۔۔! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

مشعال پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا تو وہ روپائی بھی ہو گئی۔

”سر۔۔۔! پلیز، آپ مجھے یہی اتار دیں۔ میں نہیں نہیں جاؤں گی۔ پلیز سر۔۔۔! گاڑی روکیں۔“

”ریٹکس مشعال۔۔۔! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ میں آپ کو نہیں بھگا کر نہیں لے جا رہا۔“

اس کے دھیرج سے کہنے پر وہ جھٹکائی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اصل میں میری دوست سارہ مجھے برتھ ڈے وٹ کرنا چاہتی ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔“

اس نے بتاتا تو وہ اُلجھ گئی۔

”سر.....! میں..... میرا مطلب ہے، آپ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں؟“

”کیونکہ میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔ خیر.....! اب میں اس لئے آپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں تاکہ اپنے رویے کی تلافی کر سکوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

وہ اس کی بات سن کر بڑبڑا ہوتی تھی۔

”لیکن مجھے ضرورت تھی، اور ہاں.....! ڈیڈی کو پتا نہیں چاہئے کہ ہم کہاں گئے تھے۔؟“

اس نے کہا، تب سارا معاملہ سمجھ کر مشعال کا دل چاہا، صاف منع کر دے کہ وہ علی احمد سے غلط بیانی نہیں کرے گی، لیکن اس وقت وہ اس کے رحم و کرم پر تھی، اس لئے ہونٹ سمجھ کر ششے سے باہر دیکھنے لگی، اور جب گاڑی رکی تب اس نے یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کہاں آگئی ہے؟؟ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ شامان نے اسے ایک ٹیکل پر بٹھایا اور خود سارو کے پاس دوسری ٹیکل پر آگیا، جہاں سارو اس کے لئے ایک سجانے بیٹھی تھی۔

”ایمان سے تم بہت جگہ کرتی ہو۔“

اس نے کہا تو سارو کھٹکھٹا کر بولی۔

”مزہ آتا ہے تمہیں جگہ کر کے۔“

”اچھا چلو، اب جلدی سے ایک گاڑی میں آفس میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“

اس کے کہتے ہوئے چھری اٹھا کر سارو کی طرف بڑھائی تو وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے شامی.....؟ ہر تھوڑے تمہاری ہے۔“

”اوہاں.....! یہ لو۔“

اس نے ایک پر چھری چلا دی، پھر سارو کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ پھر جلدی کرتے کرتے بھی اسے وہاں سے نکلنے میں غامضی دیر ہو گئی تھی، اور ابھی راستے میں ہی تھا کہ علی احمد کا فون آگیا۔

”ڈیڈی کا فون ہے۔“

اس نے پہلے ساتھ بیٹھی مشعال کو مطلع کیا، پھر فون رسیو کیا تھا۔

”جی ڈیڈی.....!“

”کہاں ہو تم؟“

علی احمد نے فوراً پوچھا تو وہ اطمینان سے بولا۔

”بس.....! ابھی آ رہا ہوں ڈیڈی.....!“

”آؤ رہے ہو، گئے کہاں تھے۔؟“

انہوں نے غصے سے کہا تھا۔

”وہ..... ڈیڈی.....! مشعال کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔“

اس کے جھوٹ پر وہ سلگ کر اسے دیکھنے لگی۔

”مشعال کو ڈاکٹر کے پاس..... کیا ہوا ہے مشعال کو.....؟“

علی احمد کے لہجے میں اب قدرے تشویش تھی۔

”پتا نہیں ڈیڈی.....! آفس میں پکڑا کر گر گئی تھیں۔“

وہ بتاتے ہوئے مشعال کو دیکھ کر مسکرایا، لیکن وہ سناٹے میں بیٹھی تھی۔

”اوہ.....! کوئی سیریس بات ہو نہیں ہے.....؟ ابھی کہاں ہے مشعال.....؟“

”میرے ساتھ ہے۔ لیجئے، آپ خود بات کر لیں۔“

اس نے کنبہ کر زبردستی موبائل مشعال کو ہاتھ دیا تو وہ بولکھائی اور اس کے اشارے پر موبائل کان سے لگا کر

بولی۔

”جی سر.....!“

”کیا ہوا ہے مشعال.....؟ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ بڑبڑا کر بولی۔

”اب بہتر ہے سر.....!“

”اچھا ٹھیک ہے.....! ابھی تم آرام کرو، آئی مین، شامی سے کہو کہ تمہیں گھر چھوڑ دے۔“

علی احمد نے کنبہ کر فون بند کر دیا تو وہ ناراضی سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا.....؟“

”آپ کے ڈیڈی کہہ رہے ہیں، مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔“

”ارے.....! یہ ابھی بات ہے۔“

وہ ہنسا تھا۔

☆.....☆.....☆

کانیہ کو شوبلی پر غصہ آ رہا تھا کہ ماں سے تو بات نہیں کرتا اور باپ سے ملنے چلا گیا۔ مزید پوچھنا تو درکنار،

بتا کر بھی نہیں گیا۔

”ابا ٹھیک کہتے ہیں، اپنے باپ چچا پر گیا ہے۔“

وہ بڑی کاٹتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شوبی آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دو ستانہ انداز میں بولا۔

”لائے خالہ.....! میں کاٹ دوں۔“

”نہیں.....! بس رہنے دو۔ میں کاٹ تو رہی ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر بغیر بولی تھی۔

”چلیں، میں مڑ پھیل دیتا ہوں۔“

شوبی بڑی کی باسکٹ اپ طرف کھینچ کر مڑ پھیلنے لگا۔ جبکہ نظریں چابی پر جمیں، جو خود کو بہت مصروف ظاہر

کر رہی تھی۔

”خالہ.....! آپ مجھ سے ناراض ہیں کیا.....؟“

شوبی نے پوچھا تو اس نے انحصار سے کام لیا۔

”نہیں.....!“

”پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟“

”کیا بات کروں؟ تم سنتے ہو کوئی بات.....؟“

وہ شاکی ہوئی۔

”کیوں نہیں سنتا.....؟ سب سنوں گا، آپ کہیں تو.....!“

”کیا کہوں.....؟ تم بتاؤ، کیا سننا چاہتے ہو.....؟“

وہ براہ راست شوبی کو دیکھنے لگی۔

”وہی بات جس پر آپ کو غصہ آ رہا ہے، لیکن آپ ظاہر نہیں کر رہیں۔“

شوبی نے کہا تو دوسرے جھک کر بولی۔

”فضول باتیں مت کرو۔ کام کا وقت ہے، مجھے کام کرنے دو۔ ابھی ابا آ جائیں گے، کھانا نہیں پکا ہو گا تو

بھوکے سو جائیں گے۔“

شوبی کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر پوچھنے لگا۔

”آپ اس لئے ناراض ہیں خالہ.....! کہ میں ابو کے پاس گیا تھا.....؟“

وہ کچھ نہیں بولی، بڑی کی باسکٹ اٹھا کر کچن میں آگئی تو شوبی اس کی پیچھے چلا آیا۔

”بتائیں خالہ.....! اگر آپ نہیں چاہتیں تو منع کر دیں، میں آئندہ ابو سے نہیں ملوں گا۔“

”کیوں.....؟ میں کیوں منع کروں.....؟“

وہ تنک کر بولی تھی۔

”آپ منع کر سکتی ہیں مجھے، کیونکہ آپ میرے لئے میری ماں سے بڑھ کر ہیں۔ میں بچ کبہر ہا ہوں

خالہ.....! میرے لئے پہلے آپ اور نانا بائیں۔ میں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی آپ کی گود میں آ گیا تھا، تو کیا آپ

کو اپنی بات پر پھر ورنہ نہیں ہے.....؟“

شوبی جذباتی ہو گیا تھا تو اس نے بے اختیار اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”شوبی.....!“

”میں آپ کا بیٹا ہوں خالہ.....! آپ نہیں چاہتیں تو میں پھر ابا سے کبھی نہیں ملوں گا۔“

”ارے نہیں بیٹا.....! میں کیوں نہیں چاہوں گی.....؟ خون کے رشتے بھی کبھی ٹوٹتے ہیں بھلا.....؟ تم

اپنے ابو سے ضرور ملو، لیکن پہلے اپنے نانا ابا سے پوچھ لو۔ ان کا مان بڑھ جائے گا۔“

اس نے کہا تو شوبی پوچھنے لگا۔

”نانا مانع تو نہیں کریں گے.....؟“

”نہیں.....! وہ کیوں منع کریں گے.....؟“

”اچھا چلیں، اب آپ اندر چلیں، مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“

شوبی یک دم مشتاق ہو گیا تھا۔

”ہاں.....! تم چلو، میں کھانا بنا کر آتی ہوں۔“

”جلدی آئے گا۔“

شوبی کہہ کر کچن سے نکل گیا تو اس نے جلدی سے بڑی چڑھا دی اور ساتھ ساتھ روٹیاں بھی ڈال لیں۔

پھر خواجہ صاحب کے آتے ہی دسترخوان بچھا دیا۔ خواجہ صاحب کے ساتھ شوبی بھی اچھڑو کر دسترخوان پر آکر بیٹھا تو

وہ کہنے لگی۔

”ابا.....! شوبی امتحان دے لے، پھر راجہ سے ملنے ڈنئی جائے گا۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو یا شوبی.....؟“

خواجہ صاحب پوچھتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھنے لگے۔

”ایک ہی بات ہے نانا ابا.....! خالہ چاہتی ہیں، میں اسی سے مل آؤں تو مل آؤں گا۔“

شوبی نے کہا تو خواجہ صاحب تعجب سے بولے تھے۔

”یعنی تمہارا ابا دل نہیں چاہتا مان سے ملنے کو.....؟“

”چاہتا ہے نانا ابا.....! بس یہ ہے کہ میں آپ سے ڈور نہیں ہونا چاہتا۔ آپ کہہ دیجئے گا اسی سے، مجھے

زیادہ دن اپنے پاس نہ روکیں۔“

شوبی نے اعتراف کے ساتھ کہا۔

”ہاں ہاں.....! راجہ تمہیں مجبور نہیں کرے گی، جتنے دن تم رہ سکو۔“

ٹانیہ غورابولی، جب ہی مشعال نے آنکھیں کھلی تو شوبی نے اسے دیکھتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

”ارے.....! آج تم جلدی آگئی؟“

”ہاں بس!“

مشعال کا کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟“

ٹانیہ اسے دیکھتے ہی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

”جی امی! بس صبح سے سر میں درد تھا، کوئی کام ہی نہیں ہو سکا، جب ہی آگئی۔“

”اچھا آؤ، کھانا کھاؤ.....!“

”ابھی بھوک نہیں ہے، پہلے تھوڑی دیر سوؤں گی۔“

مشعال کہتے ہوئے کمرے میں چلی گئی تو ٹانیہ پریشانی سے خوب صاحب کو دیکھنے لگی۔

”دیکھو، کیا بات ہے.....؟“

خوب صاحب نے کہا تو شوبی بول پڑا۔

”ادوہو نا نا! پہلے خالہ کو کھانا تو کھانے دیں۔“

”بس.....! میں نے کھالیا۔“

وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے میں آئی اور مشعال کو تختے میں منہ چھپائے لیٹے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔

”مشعال.....! کیا بات ہے بیٹا.....! کیا زیادہ روبرو رہا ہے؟“

”ہوں!“

”تو بیٹا.....! ٹیبلٹ لے لو، چائے بنا دوں؟“

ٹانیہ نے اس کے منہ پر سے ٹکیر ہٹا کر پوچھا تو وہ تنگ پڑ کر بولی۔

”نہیں امی! میں نے آفس میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لی تھی۔“

”چلو، پھر سو جاؤ۔ تھوڑی دیر سوؤں تو دریں آرام آ جائے گا۔“

ٹانیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چوٹی، پھر جانے لگی کہ مشعال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں امی؟ میرے پاس بیٹھ جائیں ناں۔“

وہ دراز سا مسکرائی، پھر بیٹھ کر مشعال کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مشعال نے آنکھیں بند کر

لیں۔

”مشعال.....!“

قدرے دک کر کسی خیال کے تحت اس نے مشعال کو پکارا تھا۔

”جی امی!“

”بیٹا! تمہیں آفس میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے ناں؟“

اس نے پوچھا تو مشعال اُلٹا پوچھنے لگی۔

”کیسی پرابلم امی؟“

”جی امی! کوئی کوہنہ ہے، کوئی ٹھک کرے تو.....“

وہ مشعال کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں امی!.....! مجھے کوئی ٹھک نہیں کرتا، بلکہ کسی کو بھی کوئی ٹھک نہیں کرتا۔ آفس کا ماحول بہت اچھا

ہے۔ سب لڑکیاں بہت خوش ہیں۔“

مشعال نے بتایا تو وہ لڑکیوں کا سن کر اطمینان سے ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے جب سے سارہ نے یہ بتایا تھا کہ اس کے لئے ایک دو بہت اچھے پرنسز آتے ہیں تو وہ بہت

پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی ماما اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتیں، اس لئے وہ ان پرنسز پر غور

کر رہی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر وہ پھر یہی باتیں کر رہی تھی۔ اس کا دماغ محکوم کیا تھا، جب ہی سیل آف کرتے

ہی وہ زوہیہ کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔

”ممی!.....! آپ نے ڈیڑی سے سارہ کی بات کی تھی؟“

”نہیں بیٹا!.....! ابھی میں ان کا سوڈا دیکھ رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے کافی آپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ شاید

کوئی آفیشل پرابلم ہو۔“

زوہیہ نے مبالغہ آرائی کی تھی، وہ جڑ گیا۔

”آفس میں کوئی پرابلم نہیں ہے ممی!.....! سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”تجربہ کیا ہے، آفس میں کتنے کب ہو؟.....! تمہارے ڈیڑی بتا رہے تھے، زیادہ آفس میں بیٹھتے ہو،

پھر کہیں غائب ہو جاتے ہو۔ کہاں جاتے ہو.....؟“

زوہیہ نے جتنا ہے ہوئے پوچھا۔

”کہاں جاؤں گا.....! آفس ہی کے کام سے جانا ہوتا ہے۔ ڈیڑی کو سب پتا ہے۔ خیر.....! آپ یہ

بتائیں، آپ کو میری شادی کرنی ہے کہ نہیں؟“

اس کی ہٹ دھرمی پر زوہیہ پر جڑ ہو کر بولی۔

”کیوں نہیں؟ میں تو آج ہی تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں، تم ہی ہنجیو نہیں ہوتے۔“

”میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔۔۔؟ آپ کہا کیا جا رہی تھی میں؟“  
وہ جھٹکا کر بولا تھا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم پہلے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔ تمہارے ڈیڑی تمہاری شادی پر اسی وقت رضا مند ہوں گے جب انہیں آفس میں تمہاری کارکردگی نظر آئے گی۔“  
زوہیہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری می! میں ڈیڑی کے معیار پر شاید کبھی پورا نہیں آ سکتا۔۔۔“  
”کیوں نہیں؟ تم کوشش تو کرو۔ ابھی بھی دیکھو تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تم آفس سے لیٹ ہو رہے ہو۔ تمہارے ڈیڑی کب کے چپکے ہیں۔“

زوہیہ نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی تو وہ ناراضی سے سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔ اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔ آفس جانے کا بالکل دل نہیں چاہا، لیکن اب اس کے ڈیڑی کچھ زیادہ جرح کرنے لگے تھے۔ پھر سارہ کوپانے کے لئے اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اندر ہی اندر تملاتے ہوئے وہ بلی اسپینے سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا کہ ایک جگہ اسٹاپ پر مشعال کو کھڑے دیکھ کر اس نے گاڑی اس کے قریب روک دی اور پیشہ گرا کر اسے نام سے پکارا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”آئیے! میں آفس ہی جا رہا ہوں۔“  
اس نے کہا تو وہ شوش و شیش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
”کم آن گرل!“

اس نے پھر کہا جب وہ جیسے مجبوراً بیٹھی تھی۔  
”آپ آفس ہی جا رہی ہیں ناں؟“  
اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”جی سر! آج میں کچھ لیٹ ہو گئی ہوں۔“  
وہ لیٹ ہونے پر خائف تھی۔  
”ہوتا ہے، کبھی کبھی!“

اس نے بے نیازی سے کہہ کر گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی اور دس منٹ میں ہی آفس پہنچ گیا۔ مشعال تصدأ اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ اس نے دھیان نہیں دیا، بلکہ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے وہ مقرر کیا اسے بھول ہی گیا تھا۔ وہ تو جب مشعال نے اچانک اس کا بازو دھما، جب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا، لیکن مشعال اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس کا دھیان نہ جانے کہاں تھا، اور نہ جانے کیا ہوا تھا اسے، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ جبکہ اس کے بازو پر مشعال کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے احساس میں

گھبر گیا اور بے اختیار اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
”کیا بات ہے مشعال؟“

”سر!۔۔۔ اوہ۔۔۔“  
وہ چونک کر اسی قدر بولی تھی کہ لفٹ رکنے پر دروازہ کھلتے ہی دوسرے افراد باہر نکلے تو وہ بے چین ہو کر پھر بولی۔

”سر!۔۔۔ اوہ۔۔۔“  
”ریکس! آئیے۔“  
وہ اس کا ہاتھ تمام کر لفٹ سے نکلا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگا، لیکن کچھ نہیں پایا کہ وہ کے

دیکھ کر حواس کھوری تھی۔ تب اس سے پوچھنے لگا۔  
”کیا بات ہے؟ آپ کسے دیکھ کر پریشان ہو رہی ہیں؟“  
”جی۔۔۔ وہ۔۔۔“

مشعال کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے؟  
”سوری! اگر آپ بتانا نہیں چاہتیں تو۔۔۔“  
اس نے کندھے اُچکے تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ بات نہیں ہے سر! اس میں، میں خوش نہیں جانتی، یا شاید جانتی ہوں، یا شاید نہیں۔“  
”یا شاید جانا چاہتی ہیں۔“  
اس نے کہا تو وہ ناگہمی میں بولی۔

”جی!“  
”ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسا، کسی کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے؟ تو ایسے میں بندہ مستقل اُلجھتا رہتا ہے، ہے ناں؟“

اس نے آخر میں تصدیق چاہی تو وہ نظریں جھکا کر بولی۔  
”جی!“  
”چلیں، آپ روم میں جائیں، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“

وہ کہہ کر واپس لفٹ میں داخل ہو گیا تھا۔  
☆ ☆ ☆

وہ دوا نیال حسن تھے جنہیں دیکھ کر مشعال حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے

”یہ شاید دانیال کا ہے۔“  
 ”جی؟“  
 ”وہ کبھی نہیں۔“

”ابھی جو صاحب یہاں سے گئے ہیں، جاؤ یہ انہیں دے دو۔“  
 علی احمد نے موبائل اس کی طرف بڑھا کر کہا تو اس کے اندر جیسے بجلی دوڑ گئی۔ فوراً موبائل لے کر روم سے اُٹھ آیا اور لابی میں آئے جہاں ایک کسی خیال کے تحت دانیال حسن کے موبائل سے اپنے موبائل پر ٹیل دی، پھر تیزی سے ان کے پیچھے جا کر پکارا تھا۔  
 ”سر!“

دانیال حسن نے پلٹ کر دیکھا تو اس نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔  
 ”سر! آپ کا سیل فون۔“  
 ”اوٹھیں گس!“

دانیال حسن موبائل لے کر دروازہ کھلا دیا۔ وہ انہیں جہاں تک دیکھ سکتی تھی، دیکھتی رہی۔ پھر واپس اپنے روم میں آئی تو پہلے ان کا نمبر سیکر کیا تھا اور اس روز گھر پہنچنے پر جب وہ سوئے کے لئے لیٹی تو ٹانیہ کا ہاتھ تمام کر لاؤ سے بولی تھی۔

”امی! مجھے میرے پاپا کے بارے میں بتائیں۔“  
 ٹانیہ نے ایک دم اسے دیکھا تو وہ اس کا ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر مزید لجاجت سے بولی تھی۔  
 ”بتائیں ناں امی! میں ان کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے بتائیں وہ کہاں ہیں؟“  
 ”جتائیں بیٹا! میں نہیں جانتی۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔“  
 ٹانیہ نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔  
 ”اور انہیں خبر ہے کہ ہم کہاں ہیں؟“  
 ٹانیہ سوچے انداز میں لفٹی میں سر ہلاتے لگی۔  
 ”اچھا! آپ مجھے شرواع سے بتائیں، کیا ہوا تھا؟“  
 وہ جھلکی۔

”بس بیٹا! ہم دونوں دشمن کی سازش کا شکار ہو گئے۔ میں تو سمجھ رہی تھی، لیکن تمہارے پاپا انہیں سمجھے، اور پتا نہیں اب مجھے ہوں گے کہ نہیں؟“  
 ٹانیہ کے ذہن تازہ ہو گئے تھے۔  
 ”دشمن کون تھے؟“

پاپا کو اتنے قریب سے دیکھ رہی ہے، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ انہیں پکارے، پھر انہیں بتائے کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ لیکن اتنے لوگوں کے سچے تماشا بننے کے خیال سے ہی خود کو روکنے کی سعی وہ بے اختیار شامان کا بازو تھام گئی تھی، اور اسے احساس نہیں تھا۔ جبکہ شامان علی کو چاک اس کا احساس ہوا تھا۔ ایسا احساس جو اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا کر گیا تھا۔ ایسا تو اس نے سارہ کی رفاقت میں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

بہر حال اپنی سیٹ پر آکر بھی مشعل کم سمجھی۔ بظاہر کمپیوٹر اسکریں پر نظر میں جمائے، لیکن اس کا ذہن دانیال حسن کو سوچ رہا تھا۔ جب ہی شامان علی کے آنے کا اسے پتا نہیں چلا تھا۔ وہ تو جب موبائل کی ٹون بجی، تب اس نے چونک کر شامان کو دیکھا۔ شامان اپنی جگہ کم سمجھتا تھا۔

”سر! آپ کا فون۔“

اس نے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”مجھ سے کچھ کہا؟“

”جی سر! آپ کا فون بج رہا ہے۔“

اس نے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اوہ!“

شامان نے موبائل اٹھا کر دیکھا، لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی۔ ٹون بند ہو گئی، جب موبائل رکھ کر ایک فائل اٹھا لی اور اسے چیک کر کے اسے پکار کر بولا۔

”مشعل! یہ فائل پاس سے سائن کروا کے سلیم صاحب کو بھیج دو۔“

”جی!“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس سے فائل لے کر علی احمد کے روم میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔ سامنے دانیال حسن، علی احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کھڑے تھے۔

”اچھا یار! میں چلا ہوں۔“

”اوکے! رات میں گھر پر ملاقات ہوگی۔“

”اچھی بات ہے!“

دانیال حسن مسکرائے، پھر اس کے قریب سے نکل کر چلے گئے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

”آئیے میں مشعل!“

علی احمد نے اسے مخاطب کیا، تب وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”ارے!“

علی احمد اپنی سیٹ پر بیٹھتی ہی ٹیبل پر رکھا موبائل دیکھ کر کہنے لگے۔

ثانیہ کے چہرے پر کرب چھپتا دیکھ کر اس نے مزید تفصیل نہیں پوچھی۔

”ذہن کوئی غیر نہیں اپنے ہی تھے، جن پر تمہارے پایا کو بہت مان تھا۔ ماں کا درجہ دیتے تھے وہ اہم بھائی کو۔ وہ جو کبھی تھیں، وہی دانیال کے لئے حرف آخر ہوتا تھا، اور انہوں نے ہی اپنی بہن ستاکو دانیال کی زندگی میں شامل کرنے کے لئے مجھے ان کی زندگی سے نکال دیا تھا۔“

ثانیہ نے بتایا تو وہ شاکہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”تو کیا پاپا نے ان کی بہن سے شادی کر لی تھی؟“

”ہاں! آخری بار جب میں نے فون کیا تھا تو سیدھا بھائی نے یہی بتایا تھا کہ دانیال شادی کر کے ملے

کے ساتھ باہر چلے گئے ہیں۔“

ثانیہ کی آواز بوجھ ہو گئی تھی۔

”پھر پھر وہ آئے نہیں؟ میرا مطلب ہے، اتنے برس بیت گئے، درمیان میں کبھی تو آتے ہوں گے۔“

”جہاں نہیں! آئے بھی ہوں تو ہمیں نہیں معلوم۔“

ثانیہ کا انداز کھویا ہوا تھا۔ اس نے اپنے اندر اٹھتے مزید سوالوں پر بند باندھ کر انھیں بند کر لیں۔

☆ ☆ ☆

شولی اپنے ابو سے گاڑی لے آیا تھا اور اس وقت کہیں جانے کو تیار ہو کر خود کو آئیے میں دیکھ رہا تھا کہ روٹی آدھی صبح طوفان کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھنے لگی۔

”شولی! اسنا ہے تم ذہنی جار ہے ہو؟“

”ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

وہ آئیے میں اسے دیکھ کر بے نیازی سے بولا تھا۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے، کتنے دنوں کے لئے؟“

روٹی ہمیشہ سے اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

”ہمیشہ کے لئے جارہا ہوں، تاکہ تم سے جان چھوٹ جائے۔“

وہ اس کی طرف گھوم کر بولا۔

”ایسے ہی جان چھوٹ جائے۔ میں تمہاری جان چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ ذہنی تو یہ کھڑا ہے تم اگر ۱۱

کے آخری کوئے میں بھی جاؤ گے تو میں وہاں بھی پہنچ جاؤں گی۔ سمجھے مسٹر شولی؟“

روٹی نے ایک سانس میں بول کر اسے چڑایا تو وہ فی میں سر ہلانے لگا۔

”نہیں! مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی۔“

”تم مجھے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔“

روٹی ایک دم جذباتی ہو گئی تھی۔

”کوئی اتنی مشکل تو نہیں ہوں میں۔ تم اکاؤنٹنگ میں سرکھپاتے ہو۔ سیدھا سادہ پلس مائنس کا سوال

تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، حیرت ہے۔“

”حیرت تو مجھے بھی ہے کہ آخر تمہیں مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟ میں ٹھہراؤنگ، اکڑ۔“

”اب میں کیا کروں؟ مجھے تمہارا اکڑ ہی اچھا لگتا ہے۔“

وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”اچھا!۔۔۔“

وہ اپنی گدی کھانے لگا۔ ہونٹوں میں محسوس کی جانے والی سکراہٹ دہلی تھی۔

”ہاں! اور یہ تم اتنے بن ٹھن کر کہاں جار ہے ہو۔۔۔؟“

روٹی نے پوچھا تو وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے ہوئے پوچھنے لگا۔

”چلو کی۔۔۔؟“

”کہاں۔۔۔؟“

روٹی نے فوراً پوچھا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”سوال جواب نہیں، چلتا ہے، تو چلو نہیں تو میں جارہا ہوں۔“

”ایک منٹ! میں امی سے کہہ آؤں۔“

وہ غلط میں بھائی تھی اور وہ ثانیہ سے کہہ کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد روٹی آئی تو اسے گاڑی میں بیٹھ دیکھ کر حیرت میں گھر گئی۔

”اب جلدی بیٹھو۔“

اس نے روٹی کی طرف کا دروازہ کھول کر کہا تو وہ بیٹھنے ہی پوچھنے لگی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟“

”اپنی ہے۔“

اس کی بے نیازی پر وہ تنک کر بولی۔

”اپنی سے مطلب؟“

”مطلب میرے باپ کی ہے۔ باپ کی چیز اپنی ہی ہوتی ہے، کبھی۔۔۔؟“

اس نے کہتے ہی اسپینڈر سے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔



”اس کا مطلب ہے ہم امیر باپ کی اولاد ہو، جیسی جگڑے ہوئے ہو۔“  
روہی نے کہا تو وہ خاصا منظور ہوا۔

”اب جیسا بھی ہوں، تم ہی نے پہلی کی تھی۔ بالکوئی سے جھانک جھانک کر اشارے کرتی تھیں۔“  
”کوئی نہیں!“  
”وہ پیش ہو گئی۔“

”اچھا! یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی۔؟“  
”آئس کریم!“  
”صرف آئس کریم۔؟“

”اس کے بعد تھارا بھول چاہے کھلا دینا۔ بلکہ ایسا کرو، پہلے کچھ کھاتے ہیں، پھر آئس کریم۔“  
روہی کی فرمائش پر اس نے گاڑی بیڑا ہٹ پر دوک لی اور وہیں بیڑا آؤر ڈر کر کے اسے دیکھنے لگا۔  
”سنو! تم ڈی جاکر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔؟“

روہی اس کے دیکھنے سے قدرے نرم ہو کر پوچھنے لگی۔  
”بھول گیا تو کیا کرو گی۔؟“  
اسے جیسے بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔

”میں بہت روؤں گی اور بس روٹی روٹی کروں گی۔“  
”اور جب کوئی پوچھے گا، کیوں رو رہی ہو۔؟ تو کیا ہو گی۔؟“  
اس نے کہا تو وہ یک دم تیز ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟ تم چاہتے ہو میں روٹی روٹی کروں۔؟“  
”نہیں! ایسا تو میں نہیں چاہتا۔“  
وہ بے شکل سکرابٹ چھپا رہا تھا۔

”چھری نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا، تمہیں ہر پل میری یاد ستائے گی، بتاؤ ستائے گی میری یاد کہ نہیں۔؟“

وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔  
”ہاں۔! یاد تو آؤ گی۔“  
وہ معصوم بن گیا۔  
”پھر تم جلدی آ جاؤ گے ناں۔؟“  
روہی نے فوراً پوچھا تو وہ ہنسنے لگا۔

”پاگل ہو تم بالکل! میں کہیں نہیں جا رہا، اور اگر گیا بھی تو تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔ چلو گی ہاں۔؟“  
اسے خود ابھی ادراک ہوا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔  
☆☆☆☆

وہ ہمیشہ سارہ کے بلانے پر سر کے بل بھاگا آتا تھا۔ ابھی بھی اسی طرح اپنے ضروری کام چھوڑ کر آیا تھا، لیکن جب سارہ نے ہیٹ کی طرح بے باکی سے اس کا بازو تھام کر خوشی کا اظہار کیا تو جانے کیا ہوا، وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

”ہائے شامی! اتنے خوب صورت موسم میں میرا دل چاہ رہا ہے کہ۔۔۔۔۔“  
سارہ اس کے بازو پر سر لگاتے ہوئے جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ اس نے ایک دم اپنا بازو چھڑا کر ٹوک دیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔۔۔۔۔؟“  
”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

سارہ تا بھیجی میں اسے دیکھنے لگی تو وہ ادھر ادھر نظر میں دوڑا کر بولا۔  
”کچھ خیال کرو، ہم پبلک پلےس پر ہیں۔“  
”اوگاؤ شامی! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟“

وہ زور سے ہنسی، پھر کہنے لگی۔

”کہیں تم پر اپنے ڈیلی کا رنگ تو نہیں چڑھا رہا۔؟ پلیز اب یہ مت کہہ دینا، دوپٹہ اوڑھا کر، سر جھکا کر چلو، راستے میں مت ہنس۔ اوگاؤ! مجھے تو سوچ کر ہی وحشت ہو رہی ہے۔“  
وہ ہونٹ سمجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو شامی۔؟ ہم کوئی پہلی بار تو یہاں نہیں آئے۔؟“  
وہ کچھ نہیں بولا، گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو سارہ جھنجھلائی۔  
”کیا ہو گیا ہے شامی۔؟ کیوں یور کر رہے ہو۔؟ اگر موڈ نہیں تھا تو منع کر دیتے۔ کیا ضرورت تھی

آنے کی۔؟“  
”واقعی۔۔۔۔۔ غلطی ہو گئی۔“  
وہ بے اختیار بولا تھا۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“



”اوہ.....! اور کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے.....؟“

انہوں نے فحش کے اظہار کے ساتھ پوچھا۔

”کوئی نہیں سر!“

سیدہ سادا جواب تھا علی احمد کچھ دیر سے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے۔

”تم بہت بہادر لڑکی ہو، یقیناً اپنی ماں کی طرح۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت پر دستِ

ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ دینا۔“

”جھجک یو سر.....!“

وہ قصد اسکرانی تھی۔

اور اس شام گھر آتے ہی وہ الماری میں سے دانیال حسن کی تصویر نکال کر دیکھنے لگی۔ ان سے بات

کرنے کے بعد اب اس کا دل ان سے ملنے کو چھلنے لگا تھا۔ تصویر میں جس طرح دانیال اور ثانیہ کے چہروں پر

مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسے ہی وہ بھی مسکرانے لگی کہ اچانک ثانیہ کی پکار پر اس نے بولکھلا کر الماری تو بند کر دی،

لیکن تصویر ہاتھ میں رہ گئی۔

”یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے.....؟“

ثنانیہ نے یوں ہی پوچھا تھا۔

”یہ..... میں..... یہ دیکھ رہی تھی۔“

اس نے تصویر دکھائی تو ثانیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”اصل میں امی.....! میں نے ابھی کچھ دن پہلے ایسا ہی چہرہ دیکھا تھا۔ شاید یہی تھے۔“

اس کی توجہ پر ثانیہ نے سر دھجے میں پوچھا تھا۔

”کہاں دیکھا تھا.....؟“

”بیمیز میں، میرا مطلب ہے، آفس جاتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں نظر آئے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے دانیال نہیں ہیں.....؟“

ثنانیہ کی خود کلامی سن کر اس نے فوراً بے نیازی کا لہا دواڑھ لیا۔

”کہیں بھی ہوں، ہمیں کیا.....؟ کوئی فرق نہیں پڑتا ہمیں امی.....! وہ اگر اپنی دنیا میں خوش ہیں تو ہم

بھی سکون سے ہیں۔ اتنے برسوں میں انہیں اگر ہمارا خیال نہیں آیا تو ہم کیوں پر واہ کریں.....؟“

”کیا واقعی تمہیں پر واہ نہیں ہے.....؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے باپ سے ملنے کو.....؟“

ثنانیہ نے ایک دم اس پر گرفت کی تھی۔ وہ ڈھسے لگی۔

”امی.....!“

ثنانیہ کے سینے میں منہ چھپا کر وہ سک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے جب ثانیہ کے سونے کا یقین ہو گیا، جب وہ بہت احتیاط سے اٹھی تھی اور دبے پاؤں کمرے سے

نکل کر شوٹی کے کمرے میں جھانکا اور اسے اسٹوری ٹیبل پر بیٹھے دیکھ کر اندر داخل ہوئی تو آہٹ پر شوٹی نے چونک کر

اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے.....؟“

”وہ..... تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا تو شوٹی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا بات.....؟“

”پہلے وعدہ کرو تم امی سے نہیں کہو گے۔“

اس کی بات پر شوٹی ہلکوک ہو گیا۔

”ہیں.....؟ ایسی کیا بات ہے جو تم خالہ سے چھپا رہی ہو.....؟“

”بس.....! ہے ایک بات، تم وعدہ کرو ناں.....!“

وہ زچ ہوئی شوٹی نفی میں سر ہلانے لگا۔

”پہلے بات بتاؤ.....!“

”شوٹی.....! اچھا تمہیں میری قسم کسی کو مت بتانا۔“

”اتنا تجسس کیوں پھیلا رہی ہو.....؟ میں خالہ کو بلا تا ہوں، خا.....“

شوٹی نے منہ کھولا تھا کہ وہ اس کے بازو پر منگا مار کر بولی۔

”پاگل ہو گئے ہو.....؟ سوری ہیں امی۔“

”اور نا تا نا.....؟“

”وہ بھی سوری ہیں۔“

”تو پھر جاؤ صبح بات کریں گے۔“

شوٹی واپس ٹیبل پر بیٹھا۔

”نہیں.....! میں ابھی بات کروں گی، ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

وہ جارحانہ انداز میں شوٹی کے پاس آئی تو وہ دونوں بازو بیٹھے پر باندھ کر بولا۔

”جو کہتا ہے، جلدی کہو.....!“

”وہ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے پاپا کو دیکھا ہے۔“  
وہ روانی سے شروع ہو گئی۔

”بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے ان کا نمبر بھی مل گیا تھا، پھر میں نے انہیں فون بھی کیا تھا، لیکن ان کی بات نہیں سنی۔“

”پھر؟“

”پھر تم بتاؤ، میں کیا کروں۔؟“

وہ اُلٹ کر تھی اور اس کی آنکھیں سمجھتے ہوئے ہی شوبی کہنے لگا۔

”کہنا کیا ہے۔؟ اگر تمہارا دل اپنے پاپا سے ملنے کو چاہتا ہے تو ضرور ملو۔“

”دل تو چاہتا ہے شوبی! لیکن میرے اندر یہ خوف بھی ہے کہ ان کے دوسرے بچوں کے سامنے میں نظر انداز ہو جاؤں گی۔ تب مجھے زیادہ دکھ ہوگا۔“

وہ آرزو کی میں گھر گئی تھی۔

”تو پھر انتظار کرو۔ میرا مطلب ہے، اگر انہیں تم سے ملنے کی ترپ ہوگی تو وہ خود تمہارے پاس آئیں گے۔“

شوبی نے کہا تو وہ بے بسی سے پوچھنے لگی۔

”کیسے آئیں گے۔؟ انہیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔؟“

”یہ پتا کرنا ان کا کام ہے۔ ان کی گنج ہوگی تو وہ ضرور تم تک پہنچ جائیں گے، سمجھی۔؟“

شوبی نے دھیر سے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”چلو اب جاؤ، خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سوئے دو۔“

شوبی کہنے کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے دروازے تک لے آیا تو وہ روپائی ہو گئی۔

”جاؤ شاہاش!“

مزید شوبی نے اسے پکڑا کر باہر نکالا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

”اُف! اللہ کرے۔“

وہ منہ ہی منہ میں اسے کوستے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور دم سے اپنی جگہ پر ڈھس گئی تو چانی نے جو اسے محتاط انداز میں اٹھ کر جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور اب یوں آتے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی تھی اور اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی بے خبر کیسے رہی۔؟

”میں یہ کیسے بھول گئی کہ شوبی میرا بیٹا نہیں ہے۔ نہ مشعال اس کی سگی بہن ہے۔ کبھی سوچا ہی نہیں میں نے کہ یہ دونوں اب بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے ان پر نظر رکھنی چاہیے۔ خدا سزا تو ان کو بچ بچ ہو گئی تو۔؟“

چانی بے حد خائف ہو گئی تھی۔ درزیہ وہ نظروں کے مشعال کو دیکھا، وہ سو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ صبح وہ پڑھ رہی روزمرہ کے کاغذات پر تھی کہ خیر صاحب نے اسے پکار کر پوچھ لیا۔

”چانی۔۔۔ اتم مجھے پریشان لگ رہی ہو بیٹا۔ کیا بات ہے۔؟“

”کچھ نہیں اب۔۔۔ بس ایسے ہی میں مشعال اور شوبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

وہ بے دھنائی میں بچ بول گئی۔

”مشعال اور شوبی۔۔۔؟“

خیر صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ہاں اب۔۔۔!“

وہ ایک دم ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”میں یہ سوچ رہی تھی اب۔۔۔ کہ مشعال کی شادی شوبی کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے، مگر مشعال اور شوبی کی مرضی ہو تو۔“

خیر صاحب نے تاغیر کے ساتھ کہا تو وہ فوراً بولی۔

”کیوں نہیں ہوگی مرضی۔؟ ساتھ ملے بڑھے ہیں، ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے

بغیر وہ بھی نہیں سکتے۔“

”ہوں۔۔۔!“

خیر صاحب سوچنے لگے تو وہ ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ابا۔۔۔ آپ رابو سے بات کریں ناں۔“

”ہاں۔۔۔ ارابو سے بھی بات ہو جائے گی، پہلے شوبی اپنے دل پر تو کھڑا ہو جائے۔“

خیر صاحب نے کہا تو وہ بے صبری سے بولی۔

”ہو جائے گا ابا۔۔۔ اتھان دے لے تو پھر جا ہی کرے گا ناں۔“

”جا اب اسے آرام سے تو نہیں مل جاتی بیٹا۔! پھر ابھی تو تم نے شوبی کو ذہنی جانے پر اکسا دیا ہے۔“

اگر اس کا وہاں دل لگ گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا۔“

”تو کیا ہو ابا۔۔۔؟ شادی ہو جائے تو پھر مشعال بھی اس کے ساتھ ہی چلی جائے گی۔“

وہ گویا تہیہ کر چکی تھی۔ خیر صاحب اثبات میں سر ملانے لگے۔

☆ ☆ ☆

وہ کچھ سوچ کر ہی خامے خراب علیے میں سارہ کے پاس آیا تھا اور وہ بھی خالص لیت، جب ہی وہ اسے

دیکھتے ہی ہڑ گئی۔

”عد ہے شامی! کن کاموں میں اچھے ہوئے ہوتے؟ کیا مجھ سے زیادہ اہم ہیں تمہارے

کام؟“

وہ افسردہ شکل بنا کر کٹنی میں سر ہلانے لگا۔

”پھر سیل کیوں آف کر رکھا تھا؟ اور یہ تم نے اپنی کالی حالت بنا رکھی ہے؟ مائی گاڈ شامی! لوڑ گلاس کے فضول سے لڑ کے لگ رہے ہو۔“

سارہ نے اس کے حلیے پر سر پٹ کر کہا تو وہ اسی افسردگی سے بولا۔

”بس! ڈعا کرو، ہیکاری بننے کی نوبت نہ آئے۔“

”کیا مطلب؟“

سارہ ہنوز تیز تھی۔

”مطلب یہ میری جان! کہ میرے ڈیڈی نے مجھے اپنے بزنس سے الگ کر دیا ہے۔“

اس نے بتایا تو سارہ کو شاک لگا تھا۔

”کلک! کیا؟ مگر کیوں؟“

”کیونکہ تم مجھے کام نہیں کرنے دیتی۔ آفس ناٹم میں بلائی ہو۔ نہ آؤں تو ناراض ہو جاتی ہو اور تمہاری

ناراضگی کے ڈر سے میں کام چھوڑ کر بھاگا چلا آتا ہوں۔ ڈیڈی میرے روز روڑ کے بہانوں سے تنگ آ گئے تھے۔ آخر

انہوں نے مجھے نکال ہی دیا۔ خوش ہو جاؤ اب تم۔ اب میرا سارا وقت تمہارے لئے ہے۔“

وہ پھٹ پڑا تھا۔

”اسی لئے میں کہتی تھی کہ شادی کر لو۔“

سارہ نے سچ کر کہا تو وہ سانس سنبھل کر بولا۔

”ہاں! اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ چلو ابھی کر لیتے ہیں شادی۔“

”کیا؟“

وہ چبھی تھی۔

”میں کچھ کرتا جو نہیں ہوں۔ آفس ناٹم میں کام چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔ میں کیا کروں؟“

جب تک تمہیں دیکھ نہ لوں، میرا دن ہی نہیں گزرتا۔“

اس نے مسکین شکل بنائی تو سارہ شہنشاہ بن گئی۔

”وہ تو تھیک ہے شامی! لیکن کام بھی تو ضرور ہے۔“

”ہاں! کام بھی کروں گا۔ میں نے ابھی سے جاب کی کوشش شروع کر دی ہے۔“

”جواب؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟ آئی مین، تمہارے ڈیڈ کا

اینا بڑا بزنس ہے۔“

سارہ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”ہاں! لیکن ڈیڈ کا ہے ناں، میرا تو نہیں۔“

”تمہارا کیوں نہیں؟ تمہارے ڈیڈی کا سب کچھ تمہاری ہوا گا ناں۔ اب نہیں تو۔۔۔“

اس کے دیکھنے پر سارہ بولکھلا کر خاموش ہو گئی تھی۔

”پاکل نہیں!۔۔۔“

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”میں اب ڈیڈی سے کچھ نہیں لوں گا۔ وہ کیا سمجھتے ہیں، میں ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا؟ سب کر سکتا

ہوں، مگر کے دکھاؤں گا۔ پھر تم میرے ساتھ دو میرے جینے کے لئے تمہاری محبت ہی کافی ہے۔“

”اونو شامی! تم جذباتی ہو رہے ہو۔ زندہ رہنے کے لئے صرف محبت ہی کافی نہیں ہوتی، پیٹ

کھانے کو مانگتا ہے۔ محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔“

وہ جھنجھلا رہی تھی۔

”اوہو! پیٹ کہاں سے آ گیا؟“

وہ دمزد ہو کر بولا تھا۔

”سارا مسئلہ ہی پیٹ کا ہے شامی! اسے ہر حال میں دودھ کی روٹی چاہئے۔“

سارہ نے زور دے کر کہا، پھر بھی وہ اطمینان سے بولا۔

”ہاں تو دودھ کی روٹی کما ہی لوں گا میں۔ آدھی تم کھانا، آدھی میں، یا ساری تم ہی کھا لینا، خوش؟“

”شٹ آپ!۔۔۔“

”کم آئی یار! ڈرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں دن بھر مزدوری کے بعد تھکا ہارا گھر آؤں تو تم

ٹاٹ کے پردے کے ساتھ گلی میرا انتظار کر رہی ہوگی، پھر میرے ہاتھ ڈھلاؤ گی۔“

”اس کے بعد ہم چار پائی پر بیٹھ کر دال روٹی کھائیں گے۔“

وہ گلک کر بولی تھی۔

”واہ! محبت میں دال روٹی شامی دسترخوان کا مزہ دیتی ہے۔“

اس کے مزے پر وہ ساختہ بولی تھی۔

”محبت ہو گی تب ناں۔۔۔“

”کیا مطلب؟“

وہ ایک دم اسے دیکھنے لگا۔

”بس.....! چھوڑو یہ فضول باتیں اور جا کر اپنے ڈیڑی سے سو رہی کرو۔“

”وہ نہیں مانیں گے۔“

اس نے باپوسی کا اظہار کیا۔

”تمہیں انہیں منانا ہے شامی! کسی بھی طرح، جاؤ۔ مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ مجی انتظار کر رہی ہوں

گی۔ ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔“

وہ آخر میں جلت دکھاتی ہوئی طہنی ملی گئی اور وہ کتنی دیر وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

پھر کتنے دن گزر گئے۔ سارہ نے اسے فون ہی نہیں کیا، جس سے وہ خاصا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اسے کم از کم

یہ تو پوچھنا چاہئے تھا کہ وہ اپنے ڈیڑی کو منانے میں کامیاب ہوا ہے کہ نہیں؟ یا وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ڈیڑی کو

منانے کی خوشخبری وہ اسے سنائے گا.....؟ وہ ایسی ہی باتیں سوچتا تھا۔ اس وقت وہ بار بار اپنا سیل فون اٹھا کر چیک

کر رہا تھا۔ ملازم چائے کی فرسے اس کی ٹیبل پر رکھ کر گیا تو اس نے مشعال کو پکار لیا۔

”جی سر.....؟“

وہ فوراً متوجہ ہوئی تھی۔

”پلیز.....! چائے بنا دیں۔“

اس نے کہا تو مشعال اٹھ کر اس کی ٹیبل پر آگئی، اور کپ میں چائے ڈال کر اس کے سامنے رکھی تو وہ

پوچھنے لگا۔

”میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا.....؟ آئی مین، میرے فون آنے سے پہلے.....؟“

”نوسر.....! آج تو کوئی فون نہیں آیا۔“

”اچھا.....!“

وہ سوچنے لگا، پھر مشعال کے پکارنے پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”ایک بات پوچھوں سر.....! آپ برا تو نہیں مانیں گے.....؟“

”نہیں، پوچھیں!“

اس نے کہا تو مشعال قدرے جھجک کر بولی۔

”سر.....! وہ..... آپ کی دوست سارہ..... میرا مطلب ہے، سارہ صرف آپ کی دوست ہے یا اس

سے کچھ زیادہ.....؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے.....؟“

اس نے اُلٹا مشعال سے پوچھا تو اب وہ سہولت سے بولی تھی۔

”سر.....! مجھے لگتا ہے، آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا ہی ہے ناں سر.....؟“

”ایسا ہی ہے۔“

وہ مسکرایا تھا۔

”پھر دیر کیوں کر رہے ہیں سر.....؟ میرے خیال میں آپ کے ساتھ کوئی پرابلم تو نہیں ہو سکتی.....؟“

مشعال نے کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

”سب سے بڑی پرابلم، میرے ڈیڑی نہیں مان رہے۔ انہیں لگتا ہے، سارہ اچھی بیوی نہیں بن سکتی اور

اب اس یہ بھی لگتا ہے کہ سارہ کو کچھ سے نہیں، میرے ایشیٹس سے پیار ہے۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے.....؟“

مشعال نے بے ساختہ پوچھا اور اس کے دیکھنے پر گڑبڑا گئی تھی۔ شامان نے چائے کا کپ رکھ کر انم

دیکھا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہائمر آف ہو گیا، چلیں میں آپ کو بھی ڈراپ کر دوں گا۔“

”جی.....؟“

وہ خائف ہو گئی۔

”چلیں مشعال.....! باقی باتیں راستے میں کریں گے۔“

اس کے دوستانہ انداز پر مشعال اچھے ہوئے اپنا ایک اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ پھر راستے میں

اسے ہی بات شروع کرنی پڑی۔ وہ جانے کس سوچ میں تھا.....؟

”سر.....! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سی بات کا.....؟“

”وہی جو آپ کہہ رہے تھے کہ سارہ آپ سے نہیں، آپ کے ایشیٹس سے پیار کرتی ہے۔ میرا مطلب،

گیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے.....؟“

وہ اپنی بات دہرا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”نہیں.....! مجھے ایسا نہیں لگتا، اور میں اپنے ڈیڑی پر ثابت کر دوں گا کہ سارہ کو کچھ سے محبت ہے۔“

اس کے فحش لہجے میں غمزہ جھک رہا تھا۔

”کیسے ثابت کریں گے.....؟“

وہ پوچھنے بغیر وہ نہیں سکی تو جانے کس خیال سے وہ اپنے آپ مسکرایا، پھر بولا تھا۔

”میں نے سارہ سے کہا ہے کہ مجھے ڈیڑی نے اپنے بزنس سے الگ کر دیا ہے۔“

”ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟“

اب یہ سب جانا اس کی مجبوری تھی۔

”یہ دیکھنے کے لئے کہ سارہ کو میری پرواہ ہے یا ڈیڑی کی دولت کی؟“

اس نے بتایا تو وہ اپنی جگہ جڑ بڑھ کر بولی۔

”یہ آپ نے انھیں کیا سراسر!“

”کیوں؟“

شامان نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”کیونکہ اگر آپ کے ڈیڑی کی بات سچ ہوگی تو آپ کو بہت ڈکھ ہوگا۔ مشعال نے کہا تو وہ ایک دم گامی

کو بریک لگا کر بولا۔

”نہیں! مجھے ڈکھ نہیں ہوگا۔“

”ڈکھ نہیں ہوگا۔؟“

وہ حیرت اور افسوس میں گھر گئی۔

”جس کی محبت پر آپ اتنا خوبصورت رہے ہیں، وہ اگر آپ کی آزمائش پر پوری نہ اُتری تو آپ کو ڈکھ

نہیں ہوگا۔؟ اپنی محبت ہار جانے کا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا سر۔۔۔ کہ آپ کا اپنا دل بہت

سے خالی ہے اور جہاں سر سے محبت ہی نہیں ہے، وہاں آزمائش کیسی؟ برا مت ماننے کا سر۔۔۔! میں تو یہ گوارا

ہوں کہ سارہ سے تعلق توڑنے کا اصرار آپ اسی کے سر رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا مت کیجئے۔ اسے آزمانے سے پہلے

اپنے دل میں چھانکی لیں۔“

وہ بولتی چلی جا رہی تھی اور وہ سنانے میں اسے دیکھنے لگا کہ اچانک مشعال نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا،

پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی۔

”یہاں سے میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“

پھر اترنے سے پہلے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”ایک بات اور، جیت کا مزہ تب ہی آتا ہے شامان علی! جب ہار جانے کا ڈر بھی ہو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اتر کر تیز قدموں سے اپنی سلت میں چڑی۔ شامان علی نے تب تک اس پر

نظریں نہیں بنائی تھیں، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔

☆ ☆ ☆

میرا اور بچوں کو ان کی ضرورت ہوگی۔ لیکن سہاوا اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

اس لئے اس نے الہا روتیہ رو رکھا تھا کہ وہ ہیشکل مینڈ بھری ٹھہر سکے تھے اور اس دوران انہوں نے

قوروی بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح ثانیتک رسائی ہو جائے، لیکن شاید ان کی قسمت میں ہی نہیں تھا جو وہ ماپیس

لوٹ گئے تھے۔

اور اب وہ مستقل طور پر باہر کی دنیا کو خیر باد کہہ آئے تھے تو یہاں اپنا کوئی نہیں تھا۔ ان کا آبائی گھر بھی

میرا فروخت کر کے بچوں کے ساتھ جانے کہاں جا رہی تھی۔؟ کتنے ہاسوں سے اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ جب

تک وہ وہی گھر میں تھی، وہ اس کے روتے سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود اپنا فرض کچھ کر سینیٹ میں ایک دو بار فون

کر کے اس کی اور بچوں کی خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ پھر اسی گھر کے نمبر سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر کسی اور کا ہو

چکا ہے تو اس کے بعد سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

بہر حال یہاں آ کر پہلے تو وہ اپنے لئے رہائش کے انتظام میں لگے رہے تھے، اور جب ٹھکانہ ہو گیا تب

نئے سرے سے ثانیتک اور خوبصورت صاحب کو تلاش کرنے کے ساتھ برس کے سلسلے میں پرانے دوستوں سے رابطہ کرنے

میں لگ گئے، علی احمد کے آفس بھی وہ برس کے سلسلے میں ہی گئے تھے اور انھیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ جن کی کشش

انھیں دو بار وہ مل بھیجی لائی ہے، وہ ان کے اتنے قریب ہو سکتی ہے۔

اور پھر مشعال کے فون نے تو ان کی اندر کی دنیا تہہ بالا کر دی تھی۔ اسنے برسوں میں وہ اس کرب سے

میں گزرے تھے جس سے اب دو جا رہے تھے۔ ستم یہ تھا کہ وہ اپنی پچان کروا کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ دن میں کتنی بار

اسے فون کرتے تو ادھر یا تو اس کا سیل آف ملتا یا ٹیل جاتی بھی تو وہ کال ریسیڈ نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت بے مقصد

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ دل شکستے سے سوچ رہے تھے۔

”میری بیٹی نے مجھے دھوڑ لیا، میں اسے کہاں دھوڑوں؟ وہ میرا فون بھی ریسیڈ نہیں کر رہی۔

لیکسٹ؟ ہاں، مجھے اسے ٹیکسٹ بھیجنا چاہئے۔ اوگاڈو! یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔؟“

انہوں نے فوراً سیل فون کال کر پیج ٹاپ کر کے سینڈ کیا تھا۔

”مشعال بیٹا! ایک بار مجھ سے، اپنے باپ سے مل لو۔“

☆ ☆ ☆

خوبصورت صاحب فون پر راہبہ سے بات کر رہے تھے۔ ثانیتک بڑے شوق سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ جب انہوں

نے اللہ حافظہ کبر کر فون بند کیا تو وہ ٹھٹکی سے بولی۔

”ہا! آپ نے راہبہ سے بات تو کی نہیں۔“

”کیا بات۔؟“

دانیال حسن اسنے برس بن باس کاٹ کر اب وطن واپس لوٹے تھے۔ ورمیان میں ایک بار ان کا آٹا

تھا، وہ بھی اپنے بھائی مال حسن کی ناگہانی وفات پر، اور اس وقت انہوں نے سوچا تھا کہ ایسے وقت میں ان کی

خوہ صاحب نے ناہانگی کے انداز میں اسے دیکھا تو وہ جھنجھلا گئی۔

”لیجئے.....! اتنی جلدی بھول گئے؟.....؟ ابھی اس دن تو میں نے کہا تھا کہ راجہ سے مشعال اور شوبی کی

بات کریں۔“

”ہاں.....! وہ تو مجھے یاد ہے۔“

”پھر آپ نے راجہ سے کہا کیوں نہیں؟.....؟“

اس کے شاک کی ہونے پر خوہ صاحب اسے ٹوک کر کہنے لگے۔

”تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟.....؟ پہلے بچوں سے تو پوچھ لو، اور صرف بچوں ہی سے نہیں، ان کے باپوں

تک بھی بات پہنچانی پڑے گی۔“

”باپوں تک؟.....؟“

اسے جیسے کرفٹ لگا تھا۔

”ہاں.....! عباد اور دانیال، بچوں کی زندگی کے فیصلے ان کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ تم نے اگر مشعال اور

شوبی کو پال پوس کر بڑا کر دیا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب صرف تم ہی ان کی ولی وارث ہو، اور اپنے سر پر جو

چاہو گی، کرو گی۔ ایسا تو میں بھی نہیں سوچتا۔“

خوہ صاحب نے زری سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ جیسے سے اٹھ گئی۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اب؟.....؟ عباد، دانیال، انہوں نے بچوں کے کون سے حقوق پورے

کئے ہیں جو آپ ان کا حق جتا رہے ہیں؟.....؟“

”جتا نہیں رہا، سمجھا رہا ہوں تمہیں۔ دیکھو جیتا.....! ابھی تو یہ گھر کی بات ہے۔ فرض کرو، اگر مشعال کی

شادی غیروں میں کرنی پڑے، تب اس کے باپ کا پوچھا جائے گا کہ نہیں؟ یا تم اسی ڈر سے چاہ رہی ہو کہ بس فوراً

مشعال کی شادی شوبی کے ساتھ ہو جائے۔“

خوہ صاحب کی آخری بات نے اسے پریشان کر دیا۔

”نہیں اب!.....! مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔ مشعال کا باپ کوئی چور اچکا نہیں ہے، جس کے بارے میں

بتاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو۔“

”پھر کیا بات ہے جو یوں اچانک تم پر بچوں کی شادی سوار ہو گئی ہے؟.....؟“

خوہ صاحب ہنوز نرم تھے۔

”اب میں آپ کو کیا بتاؤں اب!.....! مجھے عجیب واہموں نے گھیر لیا ہے۔“

وہ اپنے آپ میں اٹھ کر بولی تھی۔

”کیسے واہے؟.....؟“

”چتا نہیں!.....!“

وہ زوج ہو کر ان کے پاس سے اٹھ آئی اور کچھ کچھ میں نہیں آیا تو مشعال کو پکڑ لیا۔

”مشعال.....! میری بات سنو.....!“

”جی امی!.....!“

مشعال پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”بیٹا.....! اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ تمہیں خیال کرنا چاہئے۔“

اس نے کہا تو مشعال سادگی سے پوچھنے لگی۔

”کس بات کا امی؟.....؟“

”ہر بات کا۔“

پھر نظریں چرا کر بولی۔

”اور یوں وقت بے وقت منہ اٹھا کر شوبی کے کمرے میں نہ چلی جایا کرو۔“

”امی.....! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟.....؟“

مشعال جو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا۔

”غلط نہیں کہہ رہی ہوں میں۔ تمہیں خود احساس ہونا چاہئے۔ بچی نہیں ہو اب تم!.....!“

اس کے بکڑنے پر مشعال چمکی۔

”چتا ہے، بڑی ہو گئی ہوں میں اور آپ بھی بڑھ چکی ہو گئی ہیں، جب ہی اٹنا سیدھا سوچنے لگی ہیں۔ حد

ہے، شوبی کے کمرے میں نہ جاؤں، کھسا جائے گا وہ مجھے۔“

آخر میں مشعال سر جھٹک کر اپنے آپ بولے ہوئے چلی گئی تو وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ تھک گیا تھا۔ اس کی ساتیں جھنجھکی تھیں جن میں مسلسل مشعال کی باتیں گونج رہی تھیں۔

”ہدامت ماننے کا گھر.....! میں تو یہ کبھی ہوں کہ سارہ سے تعلق توڑنے کا الزام آپ اسی کے سر رکھنا

چاہتے ہیں۔ ایسا مت کیجئے گا گھر!.....! اسے آزمانے سے پہلے اپنے دل میں جھانک لیں۔“

”اور پھر؟.....؟“

”جیت کا مزہ تو ہی آتا ہے، جب بار جانے کا ڈر بھی ہو۔“

اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ مسلسل تین دنوں سے خود کو ٹھنڈا رہا تھا، اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ کر ہی اس

نے خود سارہ کو فون کیا تھا اور اسے اس کی فیورٹ جگہ پر پہنچنے کا کہہ کر خود بھی وہیں پہنچ گیا تو پہلے سر ملے پر ہی اس کی



آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”ایک بات بتاؤ سارہ..... تمہارے اندر بارنے کا ڈر ہے؟“

”کیا مطلب؟ صاف بات کہو، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

سارہ جو یہ سننے کو یہ جین تھی کہ اس نے اپنے ڈیڑی کو مانا لیا ہے، اس بات پر الجھ کر بولی تھی۔

”صاف بات ہی تو کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں یہ خیال پریشان نہیں کرتا کہ اگر میں تمہیں نہ ملا تو کیا

ہوگا؟“

اس کی وضاحت پر سارہ چکر بولی تھی۔

”نہیں! میں ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی۔“

”کیوں نہیں سوچتی؟ محبت میں ایسے اندیشے تو ہوتے ہیں۔ ملنے سے پہلے تجھ نے کا خوف، اس

کے بعد ہی تو ملنے کا مزہ آتا ہے۔“

پھر جیسے وہ کھو گیا تھا۔

”محبت کا مزہ تو ہی آتا ہے، جب باجائے کا ڈر بھی ہو۔“

”اف شامی! بس کرو کہ کوئی دنیا میں رہنے لگے ہو تم۔“

سارہ نے ہنسنے لگا کہ اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

”ہاں! شاید وہ کوئی اور ہی دنیا ہے جہاں محبت اندیشوں میں پروان چڑھتی ہے۔ بالکل اسی طرح

جیسے کائناتوں کے سچے گلاب۔ میں اس دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔ تم چلو گی میرے ساتھ؟“

اس نے آخر میں سارہ کی آنکھوں میں ہنسا دیا، پھر آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر گویا ہوا۔

”لیکن نہیں! اُم نہیں، کیونکہ ہمارے درمیان سب کچھ ہے سوائے محبت کے، اور جو دل محبت سے

خالی ہو، وہ زیادہ دور تک ساتھ نہیں چل سکتے۔“

”یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔ کوئی اور بھائی ہے تمہیں جس نے محبت کی جھوٹی

جگہ داستانیں سن کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

سارہ بڑی طرح تھلا گئی تھی۔ وہ ہونٹ کھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہ اس کا بازو کھینچ کر بولی۔

”سچائی سے منہ کیوں موڑ رہے ہو شامی؟“

”سچائی وہ ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو فریب دے رہے تھے۔ شکر کرو کہ

مجھے کسی بے وقت سے پہلے احساس ہو گیا، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔“

اس نے کہا تو سارہ چیخ پڑی۔

”شت آپ شامی! تم میری تو جین کر رہے ہو۔“

”نہیں! مجھے اگر تمہاری تو جین کرنی ہوتی تو آرزائش کی کسوٹی پر پہلے میں خود کو نہ رکھتا۔ آرام سے

الزام تمہارے سر رکھ دیتا کرتا میرے ساتھ کھڑے نہیں ہو۔ تمہیں مجھ سے نہیں، میرے انٹینس سے پیار ہے۔“

وہ بہت ضبط سے بول رہا تھا۔

”تمہارا انٹینس..... کیا ہے تمہارا انٹینس؟ اپنے ڈیڑے سے ہٹ کر تم کیا ہو؟“

سارہ نے جیسے ہوئے لہجے میں طنز کیا جب بھی وہ آرام سے بولا تھا۔

”کچھ بھی نہیں! ڈیڑے سے ہٹ کر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ تو بتاؤ، اب تمہیں میرا ساتھ منظور

ہے؟“

سارہ یک دم چکر مچ گئی۔ کچھ کچھ میں نہیں آیا۔

”حق..... تم تو پاگل ہو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تو اس نے اسے ڈور تک جاتے ہوئے نہیں

دیکھا فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی راہ لی تھی۔ اب اسے ادھر ادھر نہیں بھٹکتا تھا۔ کچھ پانے کے لئے کھونا بھی پڑتا

ہے۔ سب سے پہلے شخصی آزادی، اور اس کے لئے وہ خود کو تیار کر رہا تھا۔

پھر اسی رات اس نے ایک آخری کوشش بھی کی۔ اپنے دل کی ساری گلیاں کھٹک ڈالیں کہ کہیں سارہ کی

محبت تو نہیں گر لاری یا اس کے اندر کوئی ملال۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ گویا وہی سچ تھا کہ اس کے اور سارہ کے سچ

سب کچھ تھا سوائے محبت کے۔

بہر حال وہ اطمینان سے ہو گیا اور پھر جس نے اسے اپنے اندر جھانکنے پر اکسایا تھا، اسے اپنا کارنامہ

شاننے کے لئے منجھو دہت جلدی آٹھ منٹ کیا۔ اس وقت مشعل نہیں آئی تھی۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کس وقت

آتی ہے۔ وہ تو کبھی بھی آیا، اسے موجود ہی پایا۔ آج پہلی بار وہ اس سے پہلے موجود تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پتا

نہیں لیت ہو گئی تھی یا اس کا نام ہی سبکی تھا کہ وہ بیچے وہ روم میں داخل ہوئی تو وہ بے اختیار اپنی ریٹ واقع پر ٹانم

دیکھنے لگا۔

”سوری سر..... میں آج کچھ لیت ہو گئی ہوں۔“

مشعل اس کے قائم دیکھنے سے سبکی بھی کر دے کہ وہ اس پر لیت ہونا بتا رہا ہے۔

”کچھ نہیں، بہت زیادہ.....“

وہ اسے دیکھ کر بولا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور آفس Rull کے مطابق لیت آنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔“

”جی.....“

وہ قدر سے خائف ہو گئی تھی۔

”جی! اب آپ بتائیں، کیا سزا دی جائے آپ کو۔۔۔؟“

وہ ہلکا ہر بخیدہ تھا۔ مشعال خاموش رہی تو خود ہی کہنے لگا۔

”چلیں، میں خود آپ کی سزا تجویز کرتا ہوں۔“

”سوری سر۔۔۔!“

”تو سوری! آپ کی سزا ہے دوستی۔“

اس نے کبیر کا ایک دم مشعال کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ قدرے پریشانی سے اس کے ہنڈے ہوئے

ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”چلیں، اگر آپ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتیں تو۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے مشعال نے اس کا ہاتھ تمام لیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”جھینک یو! اب آپ بیٹھے گا نہیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ جانے کیا سوچ چکا تھا، اسے حیران چھوڑ کر گلیات میں روم سے نکلا اور علی احمد کے روم میں داخل ہوا تو

وہ اسے دیکھتے ہی بولے۔

”کیا ہوا۔۔۔؟ کیا پھر باہر کا کوئی کام یاد آ گیا تمہیں۔۔۔؟“

”کام تو نہیں ڈیڈ! وہ۔۔۔ بس مشعال کو اپنے ساتھ لے چلے جانا چاہتا ہوں۔۔۔“

اس نے سہولت سے کہا تو علی احمد کی پٹھنوں میں اوپر اٹھ گئیں۔

”کیوں۔۔۔؟ مشعال کو کیوں۔۔۔؟“

”میری مشعال کے ساتھ دوستی ہو گئی ہے ڈیڈ! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”میں جانتا ہوں، مشعال اچھی لڑکی ہے۔“

علی احمد کا لہجہ آتشیں تھا۔

”پھر آپ منع کیوں کر رہے ہیں۔۔۔؟“

”میں نے کب منع کیا ہے۔۔۔؟ ہاں، مشعال سے پوچھ لو۔ وہ جانا چاہے تو ٹھیک ہے۔“

انہوں نے کہا تو اس پر پھر گلیات سوار ہو گئی۔

”جھینک یو!“

وہ ”جھینک یو“ کہتے ہوئے تیزی سے نکلا تھا۔ علی احمد کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

نکل رہا تھا کہ ٹانیہ نے پکار لیا۔

”شوٹی!“

”جی خال۔۔۔!“

وہ پلیٹ کر ٹانیہ کے پاس آ گیا۔

”یہاں میرے پاس بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

ٹانیہ نے صوفے پر اپنے قریب ہاتھ مار کر کہا تو وہ ٹانہ دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”جی خال۔۔۔! کہنے کیا بات ہے۔۔۔؟“

”وہ۔۔۔ جیٹا۔۔۔! میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم اپنے ابو سے ملتے ہو۔۔۔؟“

ٹانیہ نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”جی۔۔۔! ملتے میں ایک بار ملتے چلا جاتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔۔۔! اچھی بات ہے، ضرور ملا کرو، اور ہاں۔۔۔! مجھے ان کا فون

نمبر دو تمہارے نانا بابت کریں گے۔“

ٹانیہ نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔

”نانا! ابو سے بات کریں گے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔! کہہ تو رہے تھے۔“

”کیا کہہ رہے تھے نانا!۔۔۔! ابو سے کیا بات کرنی ہے انہیں۔۔۔؟“

اسے یقین نہیں آ رہا تھا یا وہ شکوک ہو گیا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس کہہ رہے تھے کہ اب شوٹی کا جو بھی معاملہ ہوگا، اس کے باپ سے پوچھ

کر رکھیں گے۔“

ٹانیہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

”میں سمجھا نہیں خال۔۔۔! میرا کون سا معاملہ ہے۔۔۔؟“

وہ الجھا اور ٹانیہ جھنجھلا گئی۔

”ارے۔۔۔! کوئی ایک معاملہ ہے تمہاری آگے تعلیم، ذہنی جانا، پھر شادی۔ ان سارے معاملات میں

تمہارے ابو کی رضامندی بھی شامل ہونی چاہئے۔ یہی کہہ رہے تھے تمہارے نانا!۔۔۔“

”بس رہیں دےیں خال۔۔۔! مجھے انکی جان کا کوئی گنجیت میں مت پھنساؤں۔ آپ کچھ کہیں گی، نانا!۔۔۔“

کچھ اور میرے ابو کچھ اور، پھر میں کسی کی مانوں گا۔۔۔! مجھے معاف کریں۔“

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

شوٹی نے روٹی سے کہا تھا کہ وہ اسے یونیورسٹی سے پک کرے گا اور اس وقت وہ وہیں جانے کے لئے

”میرے لئے جو آپ سوچیں گی، مجھے وہی منظور ہوگا۔“

”جگ کہہ رہے ہوشی؟ میں جو سوچوں گی، جو چاہوں گی۔؟“  
وہ یک دم بڑبوش ہوئی۔

”بالکل.....! آپ کہیں گی، پھنسی چڑھ جاؤ تو چڑھ جاؤں گا۔“  
اس نے کہا تو ٹانہ دہل گئی۔

”اللہ نہ کرے۔ خبردار جو اس بدفائیس منہ سے نکلی تو پتہ نہ کرو۔“  
”تو پتہ نہ.....!“

وہ کان چاڑھ کر اونچی آواز میں تو بہ کا ورد کرتے ہوئے جیسے جان چھڑا کر وہاں سے بھاگتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت گھبراہٹ ہوئی تھی۔ خائف نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا، پھر شہان کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”سر.....! آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر میرے کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو مجھیں میری جاب ختم۔“

”ریشکس مشعال.....! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تمہارا کوئی جاننے والا آ بھی گیا تو میں سنبھال لوں گا۔ کہہ دوں گا ہم آفس مینٹگ پر ہیں، اور پابلیز.....! اب یہ سرور کہنا چھوڑو۔ ہم نے دوستی کی ہے۔ دوستوں میں تکلف نہیں ہوتا، کبھی؟“

اس نے خود تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔

”اچھا.....! وہ..... سارہ نہیں آئی؟“

اسے یقین تھا کہ وہ اسے سارہ کی وجہ سے ہی یہاں لایا ہے۔

”سارہ کیوں آئے گی؟“

شہان نے کہا تو اس نے نا بھیجی میں پوچھا۔

”کیوں؟ آپ نے اسے نہیں بلایا؟“

”نہیں.....! سارہ اب کبھی نہیں آئے گی۔“

وہ کہہ کر ویٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ انھیں آئینہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”پوچھو کی نہیں کیوں؟“

شہان نے ویٹر سے فارغ ہو کر اسے دیکھا تو وہ جہیز ہو کر بولی۔

”نہیں.....! یہ آپ کا پرنس میٹر ہے۔“

”اس وقت بھی میرا پرنس میٹر تھا، جب میں سارہ کی آزمائش کرنے جا رہا تھا، پھر تم نے مجھے آئینہ کیوں دکھایا تھا.....؟ یہ کیوں کہا تھا کہ میں پہلے سے اندر جھانک لوں.....؟“

شہان نے فوراً جتا ہوا وہ بھی بے ساختہ بولی تھی۔

”تو کیا آپ نے.....؟“

”ہاں.....! میں نے اپنے دل کی ساری گھیاں کھال ڈالیں، کوئی بہت دھیرے دھیرے چل رہا تھا، لیکن وہ سارہ نہیں تھی۔“

”پھر.....؟“

اسے اپنی آواز ڈور سے آتی ہوئی محسوس تھی۔

”کیا پھر.....؟“

شہان نے اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ شہان لگی۔

”میرا مطلب ہے، آپ نے سارہ سے کیا کہا.....؟“

”جیہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، اس لئے ہم زندگی کے ساتھ بھی نہیں بن سکتے۔ قصہ ختم۔!“

شہان نے یوں ہاتھ اٹھائے جیسے قصے کے ساتھ اب یہ موضوع بھی ختم ہو جاتا جائے، اور وہ کچھ کر خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کے اندر عجیب سا شور اٹھنے لگا تھا۔ پھر اس کے لئے وہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔

”میں چلوں گی سر.....! آئی ایم سوری، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہو گیا ہے مشعال؟“ اچھا ٹھہرو، میں آرڈر کنسل کروا کے آتا ہوں، پھر تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔“  
وہ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت سے پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”نوسر.....! آپ زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔“

وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آئی اور اس سے پہلے کہ شہان آرڈر کنسل کروا کر آتا، وہ رکشہ میں بیٹھ چکی تھی۔ گھر آتے ہی وہ دواش روم میں بند ہو گئی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہنے کو چاہ رہا تھا۔ داش بین کا ٹیپ کھولنے کے ساتھ اس نے آنسوؤں پر بندھے بندھے ٹوڑ ڈالے، تو پھر اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی ہے۔ جب آنسو خوں ہی ختم ہو گئے، اب اس نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور ٹپ بند کر کے داش روم سے نکل آئی۔ سامنے تو یہ نظر نہیں آیا تو الماری کھول کر دوسرا تو یہ نکال رہی تھی کہ ٹانہ پکار کر پوچھنے لگی۔

”مشعال.....! الماری میں کیا تلاش کر رہی ہو.....؟“

”اُف.....!“

اس نے زور سے الماری کا بیٹ بند کر دیا اور ٹائیڈ کو دیکھ کر راضی سے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے امی؟“ کیسی کھنکھری پالی ہیں آپ نے؟ میں کیا کر رہی ہوں؟“ کہاں کھڑی، کہاں بیٹھی ہوں؟“ پہلے تو کبھی آپ نے نہیں ٹوکا۔“

”تو ابھی کیا کیا ہے میں نے؟“ یہی تو چاہتا ہے ناں کہ کیا تلاش کر رہی ہو۔“

ٹائیڈ کو کبھی غصہ آ گیا۔

”کیا تلاش کروں گی میں؟“ خزانہ چھپا رکھا ہے ناں آپ نے الماری میں، وہی تلاش کر رہی تھی۔“ کہیں کا غصہ کہیں نکل رہا تھا۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا؟“ یہ کیسے بات کر رہی ہو تم۔“

”آپ کی فضول سوچوں سے ہی میرا دماغ خراب ہوا ہے۔“

دوسرا جھٹک کر جانے لگی کہ ٹائیڈ نے اس کا بازو دیکھ کر کھینچ لیا۔

”کیا فضول سوچا ہے میں نے؟“ بتاؤ۔“

”مجھے نہیں پتا۔“

وہ اپنا بازو چھڑا کر پرے ہٹ گئی، تب اس کا چہرہ دیکھ کر ٹائیڈ جھٹک گئی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ روتی رہی ہو کیا؟“ کیوں روتی رہی تھی؟“ بتاؤ۔“

اس کی آنکھیں پھر لرزے ہو گئیں۔

”آپ کو کیا؟“ بس آپ میری فکر نہ کریں۔“

”میں تمہاری فکر نہ کروں تو اور کون ہے تمہاری فکر کرنے والا۔“

ٹائیڈ نے ڈھکے سے اسے دیکھا، پھر یک دم نرم پڑ کر کہنے لگی۔

”بیٹا۔! میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی تم سے، جو تم نے دل پر لگائی۔“ ٹھیک ہے، شوبی اور تم ساتھ

کھیلے، ساتھ بڑے ہوئے ہو، لیکن اب۔“

”اب کیا؟“ بتائیں اب کیا ہوا ہے۔“

اس کے لیے میں تعریف تھا۔

”اب میں تم دونوں کی شادی کا سوچ رہی ہوں۔“

ٹائیڈ نے بڑے آرام سے اس کے سر پر ہم دے مارا تھا۔

”کس؟“ کیا۔“

وہ صدمہ برداشت کر رہی تھی۔

”ہاں۔! مجھے یہی مناسب لگ رہا ہے کہ میں تم دونوں کی شادی کروں۔“

ٹائیڈ اپنی دھن میں تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی۔۔۔؟ آپ نے یہ سوچا کیسے؟“ کہیں بہن بھائی کی شادی بھی ہوتی ہے۔“

”کے بہن بھائی نہیں ہوتے۔“

ٹائیڈ نے کہا تو وہ پھٹ پڑی۔

”تو یہ بات آپ کو کس لیے پہلے بھائی چاہئے تھی، بچپن میں ہی۔ اس وقت تو بس ایک ہی رشتہ پر زور تھا۔ بہن بھائی، بہن بھائی۔“

”تو بیٹا۔! معصوم بچوں کے ساتھ ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ بڑے ہو کر تم دونوں کی شادی ہوگی۔“

اس کے سینے سے پریشان ہو کر ٹائیڈ بے چارگی سے بولی تھی۔

”بس کریں امی۔! میں مر جاؤں گی، اگر آپ نے ایسا سوچا بھی۔“

دور و بڑی۔

”آپ نے تو مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے۔ شوبی نے گا تو وہ کتنا ہرٹ ہوگا کہ آپ ہم دونوں پر شک کر رہی ہیں۔“

”میں شک نہیں کر رہی ہوں بیٹا۔! تم۔۔۔ شعل۔! تم روتو نہیں بیٹا۔!“

ٹائیڈ اس کے رونے پر پریشان اور بوکھا بھی گئی تھی۔ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا تو وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو یلپ ٹاپ پر مصروف تھا کہ موبائل کی ٹون نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ لیکن اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی اور موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“

”تم نے میرے ساتھ فائل کھلیا ہے شامی۔!“

دوسری طرف سارہ تھی۔

”جھوٹا دیا ہے تم نے مجھے، اور یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ دو سال مجھے شادی کی آس میں رکھ کر اب کہتے ہو، ہمارے سب کچھ ہے سوائے محبت کے۔ محبت نہیں تھی تو میری فون کالز پر بھاگ بھاگ کر کیوں آتے تھے۔؟“

”سارہ۔! دیکھو تم مجھے غلط مت سمجھو۔“

وہ دھیرج سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن سارہ غصے میں تھی۔

”میں اب تمہیں سچ بھی ہوں۔ تم ایک نمبر کے فراڈ ہواور میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“

سارہ نے دھمکی کے ساتھ فون بند کر دیا۔

”ہائ سنس!“

اس نے سو بائیں پیڈ پر چپک دیا۔ کام سے بھی جی اُچاٹ ہو گیا۔ لب ٹاپ رکھ کر اس نے ٹائم دیکھا، ابھی صرف دس بجے تھے۔ اتنی جلدی تین دنے والی نہیں تھی۔ لیکن اب کرنے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ اس نے بے دلی سے ٹی وی کارپوٹ کنٹرول اٹھا یا تھا کہ زوبیہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر بولی۔

”شامی! تمہارے لئے گڈ نیوز ہے۔“

”اچھا!۔۔۔!“

وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”آجائیں می! کیا گڈ نیوز ہے۔۔۔؟“

”خوش ہو جاؤ۔“

زوبیہ اندر آتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں نے تمہارے ڈیڈی کو منا لیا ہے۔ وہ تمہاری سارہ کے ساتھ شادی پر ایگری ہو گئے ہیں۔“

”کیا!۔۔۔؟“

وہ پریشان ہو گیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں می!“

”وہی جو تم چاہ رہے تھے۔ لیکن تم خوش کیوں نہیں ہوئے؟ پریشان کیوں ہو گئے ہو۔۔۔؟“

زوبیہ اس کی پریشانی سے اُلجھ گئی۔

”کیونکہ مجھے سارہ کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔“

اس نے زور دے کر کہا تو زوبیہ کی حیرت فطری تھی۔

”ہیں؟ سارہ کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔؟ کل تک تو تم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔“

”کل تک؟ کل زنگی تھی!۔۔۔ اور کل کے ساتھ سارہ بھی میری زندگی سے نکل گئی۔“

”لیکن کیوں؟ میرا مطلب ہے، کیسے؟ کیا اس کی کہیں اور شادی ہو گئی ہے۔؟ بتاؤ

شامی! کیا ہوا ہے۔۔۔؟“

زوبیہ نے مزید اُلجھ کر پوچھا تو وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا۔

”یہ سب چھوڑیں می! یہ بتائیں آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔۔۔؟“

”خوشی؟۔۔۔“

زوبیہ نے کندھے اُچکائے، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔

”ہاں!۔۔۔! ہے تو خوشی کی بات۔ تم نے مجھے ہی مصروفیت دے دی۔“

”نئی مصروفیت۔۔۔؟“

وہ سمجھا نہیں۔

”ہاں!۔۔۔! اب میں تمہارے لئے لڑکی تلاش کروں گی۔ لیکن پہلے میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں۔“

زوبیہ اچانک بڑبوش ہو کر گلت میں چلی گئی تو وہ کسی خیال سے مسکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ لب جا رہی نہیں رکھے گی اور ابھی بھی اس کا آفس جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اسے ریزائن تو دینا تھا، اور یہی سوچ کر کہ آج وہ ریزائن دے آئے گی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گئی۔ پھر بیک اُٹھا کر اس میں کرایہ وغیرہ چیک کر رہی تھی کہ شوبی ہاتھ میں چائے کا کپ لئے آ گیا۔

”آفس جا رہی ہو۔۔۔؟“

”ظاہر ہے، اور کہاں جاؤں گی۔۔۔؟“

وہ اپنی مصروفیت ترک کر کے بغیر بولی۔

”ہاں!۔۔۔! ظاہر ہے، اور کہاں جاؤں گی۔۔۔؟“

شوبی نے کہہ کر آواز کے ساتھ چائے کا کپ لیا تو وہ سلگ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“

شوبی غالباً اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

”دیکھ رہی ہوں، آج کل تم ہواؤں میں اُڑ رہے ہو۔ کوئی کمال نہیں ہے باپ کے پیسے پر اترا نا۔ خود

کماؤ پھر جو مرضی کرو۔“

وہ اسے بے نقط سنا کر باہر نکل آئی۔ اس کے اندر کسی ایک بات کا غصہ نہیں تھا، بہت ساری باتیں تھیں،

جب ہی وہ بات بات پہنچے سے اُٹھ کر رہی تھی، اور اس کے اندر خود اپنے ساتھ بھی جنگ جاری تھی۔ دل الگ

بغاوت پر آمادہ تھا اور ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر۔ جب ہی وہ خود کو سمجھا نہیں پاری تھی۔ بس چاہتی تھی، پلک جھپکنے

میں وہ ہر منظر سے غائب ہو جائے، اور جتنا وہ بھاگنا چاہتی تھی، اسی قدر اسے تلخ حقائق کا سامنا تھا۔

ابھی اپنے روم میں داخل ہوئی تھی کہ عقب سے ملازم نکلا کر بولا۔

”میس! آپ کو باس بار پہنچے ہیں۔“

وہ بے دلی سے بیک ٹیبل پر رکھ کر باس کے درم میں داخل ہو کر بولی۔

”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام!“

علی احمد نے جواب کے ساتھ اسے پیٹنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے چہرے سے ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”ویری گڈ مشعل!“

اس کے پیٹنے ہی علی احمد اسے سراہ کر بولے۔

”تم نے وہ کام کر دیا ہے جو میں نہیں کر سکا۔“

”جی؟“

وہ بھی نہیں۔

”آئی ایم سو پی مشعل! شامان نے سارہ کو گڈ بائے کہہ دیا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ میں اور میری سسر تو اس میٹر میں بالکل نا کام ہو گئے تھے۔“

”لیکن سر! میں!“

اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن علی احمد نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی شامان کو سارہ کے پھنسل سے نکال لو گی۔ کیونکہ وہ سارہ کے خلاف کچھ نہ نہائی نہیں چاہتا تھا۔ تم نے پانہیں کیے۔“

”سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔“

وہ یہ بات جج جج کر کہنا چاہتی تھی، لیکن اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”سر! میں نے شامان کو کسایا ضرور دھا، لیکن سارہ کے خلاف نہیں۔“

”پھر؟“

علی احمد نے پوچھا ضرور، لیکن غالباً انہیں جواب سے غرض نہیں تھی، جب ہی ٹیلی فون کی بیل پر انہوں نے فوراً ریسیور اٹھایا تھا اور بات کرتے ہوئے اسے یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر اپنے درم میں آگئی اور پیٹنے ہی کیپیڈ آؤن کے کنارے اپنا رین لٹیرنا پ کرنے لگی۔ لیکن بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے وہ حند چھارہ ہی تھی۔ لفظ گڈ بور ہے تھے۔ پھر بھی اس نے پرواہ نہیں کی۔ لیٹر نائپ کر کے پرنٹ آؤٹ نکالا، پھر لفافے میں ڈال کر سوئے گئی۔

”کیا واقعی میں نے شامان کو سارہ سے الگ کیا ہے؟ نہیں نہیں! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ میں نے تو صرف شامان کو خود کو آڑ مانے کو کہا تھا، کیونکہ مجھے کسی لڑکی کی تو بین منظر نہیں تھی۔“

”جیلو!“

شامان کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں گم تھیں؟“

اس نے پوچھا تو وہ ہنس لٹی میں سر ہلا سکی۔

”اگر کچھ سوچنا باقی رہ گیا ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔“

اس نے کہا تو وہ پچھلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ کیوں جاتے ہیں سر؟ جانا تو مجھے ہے۔“

”تمہیں؟ تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”پانہیں!“

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بس! مجھے جانا ہے۔“

”مشعل!“

”سر! پلیز، آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی، اور میں کیوں بتاؤں آپ کو۔؟“

بھری مرضی میں جہاں بھی جاؤں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے؟“

وہ یہاں بھی تھمتے سے اٹھ کھڑی۔ اسے خود پراگل اختیار نہیں رہا تھا۔ بیک اٹھا کر تیزی سے نکلی تھی۔

”مشعل!“

شامان ان ہی تیزی سے اس کے ساتھ ساتھ جیسر کی میڑھیاں اترتے ہوئے بلڈگ سے نکلا تھا کہ

اوپر سے اترنے لگی۔ حیرت سے دونوں کو دیکھا، پھر حشرات سے مشعل کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔

”تو اس کے لئے تم نے مجھ سے محبت نہ ہونے کا کہا نہ کیا تھا۔؟ شٹ! ایک معمولی لڑکی کی خاطر

م نے مجھے۔“

”شٹ آپ سارہ! تم ہماری تو چرن کر رہی ہو۔“

اس نے مشعل کا ہاتھ تمام کر شے سے سارہ سے کہا تو وہ سگتے لیچے میں بولی۔

”ہماری؟ میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا شامی!“

”مجھے کہو یا، ایک ہی بات ہے، اور پلیز! اہٹ جاؤ ہمارے راتے سے۔“

”تم مجھے راتے سے نہیں بنا سکتے شامی! میں کوئی بے جان پتھر نہیں ہوں جسے تم ٹھوکر مارتے ہوئے لڑ جاؤ گے۔“

شامان نے ہونٹ بھیچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی، کیونکہ اس کے ہاتھ میں مشعل کا ہاتھ کا پ رہا

تھا۔

”کیا سمجھتے ہو، میں اتنی آسانی سے ہار مان لوں گی؟ وہ بھی اس معمولی لڑکی کے مقابلے میں؟“  
ہرگز نہیں..... اسے تو میں اس اوقات پر لا کر چھوڑ دوں گی۔

سارہ انگارے چبا رہی تھی۔  
”جانتی ہو اس کی اوقات کیا ہے۔؟“

وہ مضبوط لفظ چبا چکا کر بولا تھا۔

”شہنائی علی کے دل میں سب سے اونچے مقام پر بیٹھی ہے یہ جہاں تمہاری نظریں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ چلو مشعال.....!“

اس کے ساتھ ہی وہ مشعال کو کھینچتے ہوئے گاڑی تک لایا اور جب گاڑی کا دروازہ کھولا تب مشعال نے ایک دم جیسے ہوش میں آکر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھین لیا تھا۔

”آئی ایم سوری مشعال..... امیری وجہ سے تم ہرٹ ہوئی۔“  
وہ کچھ نہیں بولی، البتہ آنسو روانی سے تھک گئے تھے۔

”پلیز مشعال..... تم اس کی باتوں کو سیریس مت لو۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ آئی ایم سوری یار.....! میں معافی مانگ رہا ہوں ناں تم سے، اور تمہیں یقین دلانا ہوں۔ معمولی تم نہیں، معمولی سارہ ہے، اور اس نے خود ثابت کر دیا ہے۔ تم پلیز رومت۔ مجھے تمہارے آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی ہے۔“

وہ اس کے رونے سے پریشان ہو کر بولے چلا جا رہا تھا۔

”دیکھو، اس طرح تمہارا گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ سر راہ تماشا مت بناؤ، پلیز۔“  
وہ آخر میں جھنجھلا کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھانا چاہتا تھا، لیکن وہ پکلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

”تمہارا آپ بنا رہے ہیں مسٹر شہنائی.....! پلیز، آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں آنا تو نہیں چاہیے، بس.....!“

وہ غصے سے کہہ کر تیز قدموں سے دوسری سمت چل پڑی۔ اس کا ضدی انداز بتا رہا تھا کہ وہ ضد کے کی د پلٹ کر دیکھے گی، اور ایسا ہی ہوا۔ وہ چلتی چلتی اسی غصے سے خود پناہ نہیں تھا، وہ کہاں جا رہی ہے؟ آنسوؤں کے دھند راستہ ڈھنڈلا رہا تھا۔ اسے نہ آنسو صاف کرنے کا ہوش تھا نہ داند خراب ٹھیک کا، اور روڈ پار کر رہی تھی، پھر کسی گاڑی، بریک بڑی زور سے چرچائے تھے۔ اس کی سماعتوں میں مختلف آوازیں گونڈ ہو رہی تھیں، اور پھر خاموشی چھا کر دیر خاموشی۔

”معدہ ہے راجہ.....! اس کی بھی کیا معصوفیت؟ پھر بڑی کوئی دنیا کے آخری کونے میں نہیں ہے۔ لوگ تو آخری کونے سے بھی آتے جاتے ہیں۔ تم ہو کر آنے کا نام بھی نہیں لیتیں۔“

تاہم اس وقت فون پر راجہ سے بات کرتے ہوئے بہت شام کی ہو رہی تھی۔  
”کیا تمہارا دل بھی نہیں چاہتا ہم سے ملے.....؟ سال بھر کا شوبہ کو چھوڑ کر گئی تھیں، اب ماشاء اللہ وہ جوان ہو گیا ہے۔ کیا تمہارا اس کے تمہارا دل اس کے لئے بھی نہیں تڑپتا.....؟“

”کیوں نہیں تڑپتا.....؟ لیکن میں کیا کروں.....؟ شیراز امیری ہر بات مانتے ہیں، لیکن جہاں پاکستان جانے کا کہتی ہوں، صاف منع کر دیتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں ان کا موڈ آف رہتا ہے۔“

راجہ نے اپنی مجبوری بتائی۔

”عجب ہیں شیراز بھائی۔ چلو خود آئیں، تمہیں سوچ بھیج دیں۔“

اس نے کہا تو راجہ فوراً بولی۔

”ہاں.....! اس بات کے لئے میں انہیں آہستہ آہستہ کنوئس کر رہی ہوں۔ اچھا، یہ بتاؤ، شوبہ کی کیا ہے.....؟ تم نے اس کی شادی واوی کا سوچا کی نہیں.....؟“

راجہ نے بات بدلتے ہوئے شوق سے پوچھا۔

”ہاں.....! آج کل تو اب میں بس یہی سوچ رہی ہوں۔ شوبہ جلدی سے اپنے بیروں پر کھڑا ہوتا تو اس کی شادی کروں۔ شادی پر تو آؤ گی ناں.....؟“

”بالکل آؤں گی، اور پتا ہے ابھی میں نے تمہیں اسی سلسلے میں فون کیا ہے کہ اگر تم مناسب سمجھو تو شوبہ اور مشعال.....“

راجہ قصداً خاموش ہو گئی تھی اور وہ ہنس پڑی۔

”ہاں.....! سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا، لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

راجہ نے پوچھا تھا کہ لائن کٹ گئی

”نو.....!“

اس نے کرڈل پہ ہاتھ مارا، پھر نمبر ڈائل کرنے لگی تھی کہ خوبصورت صاحب آتے دیکھ کر باقی باتیں بعد کے لئے اٹھا رکھیں اور ریسیور رکھ کر خوبصورت صاحب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”السلام علیکم یا.....!“

”خوش رہو.....! اس کا فون تھا.....؟“

خوبصاحب نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”راہیکا!“

اس نے اسی قدر کہا تھا کہ خوبصاحب پوچھنے لگے۔

”پھر تم نے شوئی اور مشعال کی بات کی؟“

”ارے نہیں اب! اتفاق سے ادھر راہیکا ہی بنی چادر ہی تھی۔ لیکن ہم غلط سوچ رہے تھے۔“

اس نے کہا تو وہ نہ سمجھنے کے انداز میں بولے۔

”کیوں؟ اس میں غلط ہے؟ اچھا ہے، مگر کی بات گھر میں طے ہو جائے گی۔“

”ہاں! لیکن مشعال اور شوئی کسی رشتے پر آمادہ نہیں ہیں۔“

”تم نے بات کی، بچوں سے؟“

خوبصاحب نے فوراً پوچھا تھا۔

”جی! مشعال نے بات کی تھی، اور اب! وہ تو تھے سے ہی اکڑ گئی۔ بہت روٹی، کہنے لگی، کہیں

بہن بھائی کی بھی شادی ہوتی ہے۔؟“

”اچھا!“

خوبصاحب ہنستے ہوئے بولے۔

”تم نے پردہ ہی ایسی کی ہے۔ خیر! اچھی بات ہے۔“

”اچھی بات تو ہے اب! لیکن اب یہ بتائیں، ان کی شادیاں کیسے ہوں گی؟“

وہ اچانک فکر مند ہو گئیں۔

”کیسے ہوں گی سے مطلب؟ جیسے سب کی ہوتی ہیں۔“

خوبصاحب کے اطمینان پر وہ زچ ہو گئی۔

”اب! میرا مطلب ہے، اچھے رشتے ہوں گے، جب ناں!“

”پھر پھر ایس کیوں ہوتی ہو؟ جب اللہ کو منظور ہوگا، پتا بھی نہیں چلے گا، سب کام ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ! چلیں آپ آرام کریں، میں جلدی سے کھانا بنالوں۔“

وہ کہتے ہوئے اچانک کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

اسے اور اس سے متفرک کر دیا تھا۔

”لیکن اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟“

وہ سوچنے لگا۔ لیکن کچھ سمجھ میں آیا تو اٹھ کر اس کی ٹیبل پر آگیا کہ شاید وہ اس کے لئے کوئی مسیح چھوڑ گئی

ہو، اور مسیح تو نہیں، اس کا ریزائن لیر تھا۔

”ریزائن؟ مشعال نے ریزائن کیوں دیا؟“

وہ اٹھتے ہوئے لیٹر چیک کر علی احمد کے روم میں آکر ان سے پوچھنے لگا۔

”ڈیڈی! مشعال آئی تھی؟“

”ہاں! آئی ہے، مشعال، اپنے روم میں ہوگی۔“

علی احمد نے کہا تو وہ ان کی لائپلی پر متوجہ ہوا۔

”مشعال روم میں نہیں ہے ڈیڈی! وہ ریزائن چھوڑ گئی ہے۔“

”واٹ؟ بٹ وائے؟ مجھ سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

علی احمد نے کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

”آپ کے پاس آئی تھی وہ؟“

”ہاں! ابھی کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی وہ۔ میں نے اس کے کام کو سہا تھا۔ پھر اس نے ریزائن

کیوں دے دیا؟ کال کر دے۔“

علی احمد کو خود بخود نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس طرح کیوں چلی گئی؟

”جی!“

وہ جب سے موبائل نکالتے ہوئے ان کے روم سے نکل آیا۔ پھر کتنی دیر وہ بار بار اس کا نمبر رٹائی کرتا رہا،

لیکن ادھر اس کا میل فون آف تھا۔

☆☆☆

اس نے کسما کر آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ذہن ماؤف تھا، جب ہی سمجھ نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے؟

خالی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی ایک جگہ جا کر ٹھہر گئیں تو پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

”پاپا!“

وہ جھٹکے سے اٹھی اور دیوار پر لگی دانیال اور ثانیہ کی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تب ہی عقب سے

آواز آئی۔

”تھینک گاڈ! تمہیں ہوش آ گیا۔“

اس نے کتنی دیر تک مشعال کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر پریشان آفس لوٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے؟ وہ اس سے کیوں ناراض ہو گئی ہے؟ مزید سارہ نے اس کی توہین کر لے



وہ فوراً اٹھتی تھی۔

”شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ہم وہاں روڈ پر گرنے لگی تھیں۔“

دانیال حسن نے کہا تو اس وقت اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی، بس ایک بات کہ وہ اپنی پناہ گاہ میں

آگئی ہے۔

”پاپا!۔۔۔!“

وہ بھاگ کر ان کے سینے سے جا گئی۔

”پاپا!۔۔۔! میں شعل ہوں، میں شعل ہوں پاپا!۔۔۔! آپ کی بیٹی، شعل!۔۔۔!“

”شعل!۔۔۔!“

دانیال حسن نے ایک دم اسے ہاتھوں میں سمجھتی لیا۔

”بھئی بیٹی شعل!۔۔۔!“

”پاپا!۔۔۔!“

وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”بھئی جان!۔۔۔! میں بہت برا ہوں، مجھے معاف کر دو، میں تمہیں دھوڑنے میں ناکام ہو گیا۔ میں

ڈنکا کا ناکام ترین شخص ہوں۔“

وہ اپنی ناکامی پر پشیمانی سے رو رہے تھے۔

”تمہیں پاپا!۔۔۔! ایسا نہ کہیں۔“

وہ تڑپ گئی۔

”بری تو میں ہوں جو میں نے آپ کو اتنا ستایا۔ آپ کا فون رسیڈ نہیں کیا۔“

”بھئی بھئی سراسی اور چائیں بیٹا!۔۔۔! آپ کی امی مجھے معاف کر لیں گی کہ نہیں؟ کسی ہیں آپ کی

امی!۔۔۔؟ آپ مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

”چلیں!۔۔۔!“

وہ فوراً تیار ہو گئی۔

”لیکن بیٹا!۔۔۔! پہلے آپ یہ جوس لیا لو۔“

انہوں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور پھر جوس کا گلاس اسے تھما کر پوچھنے لگے۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو؟۔۔۔!“

”چائیں پاپا!۔۔۔! اچانک پکڑ آ گیا تھا۔“

وہ نظریں چرا کر بولی گئی۔

”کڑوری سے ہوتا ہے، آپ جوس پیو اور جب تک آپ یہ قسم کرو، میں فریض ہو کر آتا ہوں، پھر چلتے

ہیں بھیک!۔۔۔!“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو دانیال حسن اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ تب جوس پیئے ہوئے اسے

اچانک خاموشی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اندازہ لگا لیا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے، وہ کمرہ وسط

میں ہے۔ پھر بھی ادھر ادھر کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

”امی نے تو بتایا تھا، پاپا شادی کر کے جا رہے تھے۔“

اس نے سوچا تب ہی دانیال حسن آ کر بولے۔

”چلیں بیٹا!۔۔۔؟“

”جی!۔۔۔!“

وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور خود کو روکنے روکنے بھی پوچھ گئی۔

”پاپا!۔۔۔! گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟۔۔۔؟“

”اور کون ہو گا بیٹا!۔۔۔؟ ہاں، اب آپ اور آپ کی امی آجائیں تو پھر یہ گھر خالی، بویران نہیں لگے گا۔“

انہوں نے کہا پھر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر چل پڑے۔

کچھ دیر پہلے وہ بہت دل گرفتہ تھی اور کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اب دانیال حسن کے ساتھ

بٹھیں وہ خود کو بہت مضبوط لگ رہی تھی۔ پھر تیار ہوا کہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی

رکوائی تو دانیال حسن اسے یوں دیکھنے لے بیٹھے پوچھ رہے ہوں۔

”میں باہر ہی سے تو نہیں لوٹا یا جاؤں گا!۔۔۔؟“

وہ کبھی یائیں، لیکن سسرالی ضرور، پھر اتر کر بولی۔

”آئیے ناں پاپا!۔۔۔!“

دانیال حسن اتر کر اس کے پاس آگئے تو وہ ان کا ہاتھ تھام کر سیدھی اندر آ گئی۔ پھر سیٹنگ روم میں ان کا

ہاتھ چھو ڈکڑا آگے بڑھ کر پکارنے لگی۔

”امی!۔۔۔! امی!۔۔۔!“

”آ رہی ہوں بیٹا!۔۔۔!“

ٹانہ دیکھتے ہوئے کمرے سے نکلتی تھی کہ اس کے پیچھے دانیال حسن کو کھڑے دیکھ کر وہیں ساکت ہو گئی۔

جبکہ اس کے ذہن میں جھٹکے سے چلنے لگے تھے۔ شعل نے پلٹ کر دانیال حسن کو دیکھا، ان کی نظریں ٹانہ پر جمی

تھیں۔ تب شعل قہقہہ آدرمیان سے ہٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

”ٹانہ!۔۔۔!“

دانیال حسن نے پکارا جب ہوش میں آئے ہی اس کے اندر زعفر بھر گیا تھا۔

”کیوں آئے ہیں آپ؟ کیا کوئی زخم لگا یا باقی رہ گیا تھا؟“

”نہیں! اپنے زخم دکھائے آیا ہوں۔“

ان کی آواز یوں جھل گئی۔

”اپنے زخم؟“

ٹانیہ کے لہجے میں حد درجہ کڑواہٹ تھی۔

”ہاں! تمہارے زخموں پر تو شاید وقت نے کھرہ بڑھادی ہوگی، لیکن میں برسوں سے اپنا لیبو و جود

لے کر در پھر رہا ہوں۔“

انہوں نے کہا تو وہ مزید چٹ گئی۔

”در بدر تو میں ہوئی ہوں دانیال حسن! آپ تو خوشی سے نئی دنیا بسائے چلے گئے۔ یہ جاننے کو بھی

نہیں رکے تھے کہ اللہ نے آپ کو یہی دی ہے یا پتا؟ کیونکہ آپ کو کوئی فرقی نہیں پڑتا تھا۔“

”میں تمہیں جتنا دل چاہتا تھا؟ کیونکہ اگر مجھ پر سہما بی اور حنا کی حقیقت نہ بکھلتی تو شاید یہی ج

ہوتا۔“

”شاید؟“

وہ طنز سے ہنسی گئی۔

”ہاں شاید! کیونکہ سچ ہے کہ جب میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تک گیا اور پھر مجھے یہ معلوم

ہوا کہ تم سب راجہ کے ساتھ ذہنی چلے گئے ہو تب میں بھی مایوس ہو کر یہ ملک چھوڑ گیا تھا۔“

ان کی بات پر اس نے منہ موڑ لیا تو وہ اس کے قریب چلے آئے۔

”میرا یقین کرو ٹانیہ! اس کے بعد جو چاہے سزا دو۔ میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔ لیکن بھر خدا کے

لئے مجھے معاف کر دینا۔“

انہوں نے عاجزی سے کہا۔

”معاف کر دو بیٹی!“

خوبصاحب جانے کب وہاں آن کھڑے ہوئے تھے، ٹانیہ فوراً ان کی طرف گھومی تھی، جبکہ دانیال نے

انہیں دیکھ کر سر جھکا لیا تھا۔

”صبح کا بھولا شام میں لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“

خوبصاحب صاحب کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ ایک مہمانوں میں چہرہ چھپا کر رہ پڑی۔

”ٹانیہ!“

دانیال حسن نے بے تابی سے اسے کندھوں سے تھام لیا اور اگلے پل وہ ان کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”علی! میں تو ج کچ بولکھا گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا شامی کی کہاں بات کروں؟ شاید صاحب

کے ہاں جاؤں یا سبز بھال کے ہاں، اور بیٹی تو مختل صاحب کی بھی بہت پیاری ہے۔“

زوبیہ کی بولکھا بہت پر علی احمد اسے محفوظ طور پر تھے۔

”آپ بتائیں ناں، پہل کہاں سے کروں؟“

زوبیہ نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے کہا تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”بھئی! مجھے معاف رکھو۔ یہ نا اہلستا تمہارا شعبہ ہے، اگر نہیں سمجھ میں آ رہا تو شامی سے پوچھ لو۔“

”شامی تو بات مذاق میں آڑا دیتا ہے۔ مجھے بتائیے، وہ کیا کہے گا؟“

”کیا کہے گا؟“

”کہے گا، بی! چار پانچ ہائیں، پھر آکھیں بند کر کے ایک پرچی اٹھائیں، جس کا نام لنگے، پہلے اسی

کے ہاں پر پوزل لے جائیں۔“

زوبیہ روٹے انداز میں بول رہی تھی۔ علی احمد بے ساختہ قبضہ کر کے تھوڑے عرصے میں عاجز ہو گئی۔

”علی! چلیز، بی سیریس۔ میں اب جلدی شامی کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بچے کھانا پناہتی

ہوں۔ اگر اس لڑکی سارہ کا معاملہ نہ ہوتا تب تک شامی کے دو بچے یہاں کیل رہے ہوتے۔“

”یہ تو ہے!“

علی احمد تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

”پھر بتائیں ناں، میں کیا کروں؟“

”دیکھو، جو بات تم مجھ سے کہہ رہی ہو، وہ شامی سے کہو کہ اب تک اسے دو بچوں کا پ بن جانا چاہئے

تھا۔ پھر تم اس سے پوچھو، بلکہ پوچھو مت، بتاؤ کہ تم سبز بھال کے ہاں اس کا پر پوزل لے کر جارہی ہو۔“

علی احمد نے سنجیدہ ہو کر کہا تو وہ بلا ارادہ بولی گئی تھی۔

”اور اگر اس نے منع کر دیا تو؟“

”منع کرے تو دوسرا پر پوزل اس کے سامنے رکھ دینا۔ کسی ایک پر تو وہ ہائی بھرے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔! میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔“

وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ علی احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ ہاتھ سے انہیں رکے گا اشارہ کرتے ہوئے

”شامی! شامی! شامی!“ پکارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اندر داخل ہو کر بھی پکارا تو وہ اپنے کسی

خیال سے چونک کر بولا۔

”جی جی!“

”کیا کر رہے ہو بیٹا؟“

زویہ نے اسے فارغ دیکھ کر بھی پوچھا۔

”کچھ نہیں! خود سے باتیں کر رہا تھا۔“

شائمان نے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

”بس! آپ خود سے باتیں کرنا بند، میں تمہارے ساتھ باتیں کرنے والی لاری ہوں۔“

”جی! آپ کو جلدی کیا ہے؟“

وہ جھجک کر بولا تو زویہ ایک دم بخود ہو گئی۔

”بس شامی! یہ نال مول کا سلسلہ ختم کرو۔ میں اب کچھ نہیں سنوں گی۔“

”چلیں تو جو آپ سنا چاہتی ہیں، وہ سنائیں۔“

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں! میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ کل میں مسز جمال کے ہاں تمہارا پوزل لے کر جا رہی ہوں۔“

اس نے کہا تو وہ قصداً حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”مسز جمال؟ وہ تو مسز ہیں جی! ان کے لئے آپ میرا پوزل لے کر جائیں گی؟“

”اگل ہو گئے ہو؟ میں ان کی بیٹی کی بات کر رہی ہوں۔“

اس نے جھلا کر کہا۔

”اچھا اچھا! لیکن جی! ان کی بیٹی تو۔۔۔“

”بہت پیاری ہے۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”ویسے شاہد صاحب اور عقیل صاحب کی بیٹیاں بھی میری نظر میں ہیں۔ تم نے دیکھا ہوا ہے انیلا اور نشی

کو۔۔۔؟“

”ہو سکتا ہے، دیکھا ہو۔“

وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔

”خیر! کیوں مسئلہ نہیں ہے۔ جب چاہو، دیکھ سکتے ہو۔ بلکہ ایسا کرو، کل تم میرے ساتھ چلتا۔“

اس نے کہا تو اب وہ فوراً بولا تھا۔

”کل نہیں جی! آپ کچھ دن رُک جائیں، پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔“

”شامی!۔۔۔!“

”جی! کہہ رہا ہوں ناں، بس کچھ دن۔ مجھے سوچنے کا موقع تو دیں، پلیز!۔۔۔!“

اس کی منت پر وہ خاموش ہو گئی، لیکن پھر بڑبڑاتے ہوئے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آکر بیٹھے تھے۔ ماحول خوش گوار تھا کہ اچانک مشعال پوچھنے

لگی۔

”پاپا!۔۔۔! اب آپ نہیں رہیں گے ناں، ہمارے ساتھ۔۔۔؟“

دانیال حسن نے شہناز کا تانیہ کو دیکھا تو خوبصورت صاحب بول پڑے۔

”یہ بیٹا کیوں رہیں گے بیٹا!؟ اب تم جاؤ اپنے گھر۔۔۔!“

”آپ نے تو مجھے مشکل سے نکال لیا انکل۔۔۔!“

دانیال حسن منمن ہو کر بولے۔

”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں تانیہ اور مشعال کو اپنے ساتھ لے جاؤں، بلکہ آپ بھی چلیں۔ یہاں

اکیلے کیا کریں گے؟“

”اکیلا کیوں؟ شونی ہے میرے ساتھ۔“

خوبصورت صاحب نے کہا تو مشعال فوراً بولی۔

”شونی تو نانا!۔۔۔! ڈیڑی جا رہا ہے۔“

”زیادہ دنوں کے لئے نہیں جا رہا، آ جاؤں گا جلدی۔“

”تو ٹھیک ہے! جب تم ڈیڑی سے آؤ گے تب نانا بھی یہاں آ جائیں گے۔“

ان دونوں کی بحث شروع ہو گئی تو خوبصورت صاحب نے پہلے تانیہ کو جانے کی تیاری کرنے کو کہا، پھر ان

دونوں کو لکھا۔

”الزومت تم دونوں۔ جاؤ مشعال!۔۔۔! تم بھی ماں کے ساتھ تیاری کرو۔“

مشعال، شونی کو چڑاتے ہوئے تانیہ کے پیچھے آگئی تو پھر بس کچھ ضروری چیزیں ہی دونوں نے بیگ میں

رکھیں، اس کے بعد خوبصورت صاحب نے جیسے دوسری بار تانیہ کو زخمت کیا تھا۔

”حسن والا! آ کر مشعال نے پہلے سارے گھر میں کھوم پھر کر دیکھا، پھر اپنے لئے کمرہ منتخب کر کے وہیں

ڈیرہ جمالیا۔ کشادہ کمرہ خوبصورت فینچر سے آراستہ تھا۔ اس نے اپنا بیگ دیوار گیر الماری میں ڈال دیا۔ پھر بیڈ پر

بیٹھی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر شہناز کا نمبر دیکھ کر اس نے کچھ سوچا، پھر موبائل اٹھالیا۔

”ہیلو!“

”مشعال! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا میری باتیں اتنی بری لگی ہیں کہ تم نے ریزائن۔“

”شامان! چھوٹے ہی بولا تو اس نے اس کی بات کاٹ دی۔“

”توسر! میں نے آپ کی وجہ سے ریزائن نہیں دیا۔“

”پھر؟“

”وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔“

”بس! الجھے ریزائن کرنا تھا۔ آئی ایم سوری! میں جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔“

”وہ بہت سے بولی تھی۔“

”ٹھیک ہے! میں وجہ نہیں پوچھوں گا۔ بٹ آئی ایم سوری نو! کہ میں آپ کا ریزائن۔“

Except نہیں کر سکتا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میں نے آپ کو اپنا ٹکٹ نہیں کیا تھا۔ آپ کو اپنا ریزائننگ لیٹر باس کو دینا ہو گا۔“

اس نے کہا تو وہ جڑ بڑ ہو کر بولی۔

”توسر! آپ میرا لیٹر باس کے پاس بھجوا دیں۔“

”سوری مشعال! جاب کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، اس وجہ جانے بغیر ریزائن۔“

نہیں لیں گے۔

”ٹھیک ہے! میں آ جاؤں گی۔“

اس نے کہہ کر لائن کاٹ دی اور آفس جانے کا سوچ کر ریزائن ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”چلی جاؤں گی امی! آخر پہلے بھی تو جاتی تھی، اب میں جاؤں؟“

ٹانیہ نے مسکرا کر ثبات میں سر ہلایا تو وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ گوکہ اندر سے وہ پریشان تھی لیکن

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کسی مقام پر کمر و درمیں پڑے گی۔ جب ہی اپنے تئیں امتحان سے آفس میں داخل ہوئی۔ پھر

روم میں آ کر اپنا ریزائنیشن لیٹر تلاش کر رہی تھی کہ شامان کی آواز پر ٹیبل پر ادھر ادھر حرکت کرتا اس کا ہاتھ دک گیا۔

”ہیلو!“

”السلام علیکم!“

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر پھر ٹیبل دیکھنے لگی۔

”ناراض ہو۔۔۔؟“

شامان نے ٹیبل پر دونوں ہاتھ جما کر پوچھا۔

”نہیں!“

اس نے اپنی مصروفیت حرکت نہیں کی۔

”تو تم واقعی ناراض ہو۔۔۔؟“

”نہیں! کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔“

”تو پھر میری طرف دیکھو۔!“

شامان نے کہا۔ اس نے سر اٹھانچا کر کے دیکھا تو وہ جلدی سے جیب سے گلاب نکال کر اس کے سامنے

کر کے بولا۔

”تم نے کہا تھا، دو سب دوست کو گلاب دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی۔“

مشعال کی نظر میں گلاب پر ٹھہر گئیں، جبکہ چہرے پر ایک رنگ آ کر گڑ گیا تھا۔

”میرا خیال تھا۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”شاید میں نے تمہارا دفاع کرنے کے لئے سارہ سے کہہ دیا تھا کہ تم شامان علی کے دل میں سب سے

اچھے مقام پر بیٹھی ہو، لیکن پھر مجھ پر اوراک ہوا کہ یہی سچ ہے، اور اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ تم پہلی لڑکی ہو جس کے

سامنے میں نے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میرے دل کی ساری گلیوں میں دھیرے دھیرے

سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے والی وہ تم ہو، تم مشعال۔۔۔!“

وہ گسم گسمی تھی۔ شامان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر گلاب اس کے سامنے رکھ کر روم سے نکل

گیا، تب اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر پہلے ریزائنیشن لیٹر ڈھونڈ کر باس تک پہنچایا۔ اس کے بعد جانے کیا

خیال آیا کہ میز جیوں سے واپس لپٹ کر روم میں آئی تھی اور جیسے خود سے بھی چھپا کر گلاب اپنے پاس میں ڈالنا تھا، لیکن

زندگی کی دھوپ دخل گئی تھی۔ اب غنڈی چھاؤں تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر مشعال کو اپنے ماں باپ

چہروں پر چٹکتی ہوئی مسکراہٹیں بہت پیاری لگی رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں اس مسکراہٹوں کی اہمیت کی، ما

لگی۔ پھر دانیال حسن کے آفس جانے کے بعد وہ بھی تیار ہو کر آئی تو ٹانیہ پوچھنے لگی۔

”تم کہاں جا رہی ہو بیٹا۔۔۔؟“

”آفس! میرا مطلب ہے، میں ریزائن دینے جا رہی ہوں۔“

اس نے فورا وضاحت بھی کی تو ٹانیہ مطمئنانہ سے ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹا! اب تمہیں جاب کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جاؤ گی۔۔۔“

پھر وہ اسے چھوئے اور اس میں لمبی محبت کی خوشبو اپنے اندر اُتارنے سے گریز کرنے لگی۔ گو کہ دل بھی ترفیب دینے لگا تھا، لیکن وہ خانگی تھی۔ جیسے علی احمد نے کہا تھا۔

”تم نے وہ کام کر دیا مشعل! جو میں نہ کر سکا۔ شامان نے سارہ کو گنڈہ بائے کہہ دیا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ چھین جاتا ہے۔ میں اور میری سز تو اس میز میں بالکل ناکام ہو گئے تھے۔“

پھر سارا تھی۔

”تم مجھ راستے سے نہیں ہٹا سکتے شامی! میں کوئی بے جان پتھر نہیں ہوں جسے تم ٹھوک مارتے ہوئے گزر جاؤ گے۔ کیا سمجھتے ہو، میں اتنی آسانی سے ہارن لوں گی؟ وہ بھی اس معمولی لڑکی کے مقابلے میں؟ ہرگز نہیں! اسے تو میں اس کی اوقات پر لا کر چھوڑ دوں گی۔“

یہ باتیں مسلسل نہ صرف اسے چوکتی تھیں، بلکہ اپنے آپ میں مجرم ہی بنی ہوئی تھی۔ گو کہ سچ یہی تھا کہ اس نے شامان کو سارہ کے خلاف نہیں اکسایا تھا۔ لیکن علی احمد تو یہی سمجھتے، بلکہ انہیں یقین تھا اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ شامان کو سارہ کے چنگل سے نکال کر اس نے اسے اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ اس خیال سے ہی اس کی روح کانپ جاتی تھی، جب ہی وہ شامان کا فون رینگنے نہیں کر رہی تھی۔ وہ دن میں کتنی بار اسے کال کرتا تھا اور وہ اس کا نمبر دیکھ کر کانوں میں انگلیاں خنوس لیتی، اور اس کے کیسٹ پر بے بغیر Delete کر دیتی۔ گو کہ اس کے بعد اسے خود سے لڑنا پڑتا تھا، لیکن وہ اپنی عزت نفس داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔

بہر حال اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ خوش تھی، لیکن پورے ہی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس وقت وہ چپ چاپ ہی بیٹھی تھی کہ دانیال حسن اس کے پاس بیٹھ کر کہنے لگے۔

”بھئی! کیا بات ہے؟ ہمارے بیٹے لگتا ہے یہاں آکر پورے ہو گئے ہیں؟“

”اصل میں کبھی فارغ نہیں رہی ناں، کالج کے بعد جاب پر جانے لگی تھی۔“

ثانیہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو دانیال حسن خود میں نادم ہو کر اس سے بولے۔

”تو بیٹا! آپ ابھی بھی آفس جوائن کر سکتی ہو۔ آپ آئی مین، میرا آفس۔ کیوں ثانیہ! اگر تمہاری

اجازت ہو تو مشعل میرا آفس جوائن کر لے۔“

”ارے! اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“

ثانیہ نے ہنس کر کہا تو وہ اس سے بولے۔

”بس، تو کل سے آپ میرے ساتھ چلو گی، ٹھیک؟“

اس نے ثانیہ کو دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اوہو! مجھے تو ابھی ایک میٹنگ میں جانا تھا۔“

دانیال حسن اچانک یاد آنے پر اٹھ کھڑے ہوئے تو ثانیہ بھی اٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے۔! آپ میٹنگ میں جائیں، میں مشعل کے ساتھ مارکیٹ جاؤں گی۔“

”ہاں بھئی! میری بیٹی کو اچھی سی شاپنگ کروانا، جو یہ کہے۔ اوکے بیٹا۔!“

دانیال حسن اس کا گال تھپک کر گلت میں پلے گئے تو ثانیہ اس سے بولی۔

”چلو بیٹا! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

اس کا بالکل دل نہیں چار ہوا تھا، لیکن ثانیہ کی خاطر اٹھ گئی، اور پھر ثانیہ کی خاطر ہی اسے شاپنگ میں دلچسپی لینی پڑی۔ ثانیہ بہت شوق سے اس کے لئے سونوں کے ساتھ میچنگ جیولری اور سینڈل وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی ماں پر پیار کے ساتھ نرم بھی آنے لگا۔

”کتنا تڑپ سے یہ عورت!“

”بس کریں امی!“

آخر وہ تھک گئی۔

”کچھ بعد کے لئے بھی اٹھا رہیں۔“

”ہیں؟“

ثانیہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”چلو ٹھیک ہے۔! پھر کسی دن آجائیں گے۔“

”لایئے۔! یہ مجھے دے دیں۔“

اس نے ثانیہ کے ایک ہاتھ سے شاپنگ بیگز لے لئے، پھر دونوں مال سے ٹھکیں تو ڈرائیور نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

”بیٹھو بیٹا۔!“

ثانیہ نے اس سے کہا، تب ہی کسی نے پکارا تھا۔

”مشعل!۔!“

ثانیہ نے فوراً الٹ کر دیکھا، پھر اس سے پوچھنے لگی۔

”کون ہے؟“

”پتا نہیں امی! میں نہیں جانتی۔ آپ بیٹھیں ناں۔!“

اس نے کہتے ہوئے زبردستی ثانیہ کو بٹھایا، پھر خود بیٹھی تھی کہ شامان قریب آکر کہنے لگا۔

”مشعل! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ جلیز! دو منٹ کے لئے میری بات سنو۔!“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“

اس نے گاڑی کا دروازہ کھینچ لیا۔

"معتل! اپلیز۔"

"چلو حفظہ!"

وہ ڈرائیور سے کہہ کر ادھر ادھر سے شاہر سنبالے لگی، جبکہ دھیان ثانیہ کی طرف تھا جو کبھی اسے دیکھتی کبھی پیچھے رہ جانے والے شاہمان کو، اور غائب ڈرائیور کی وجہ سے خاموش تھی، لیکن گھبراتے ہی اسے بازو سے ہلاتی کھینچتا تو وہ عاجزی سے بولی۔

"امی! اپلیز، مجھ سے کچھ مت پوچھئے گا۔"

"تم سے نہ پوچھوں تو کیا اس سے پوچھتی کہ وہ کون ہے۔؟ اور تمہیں کیسے جانتا ہے۔؟"

ثانیہ نے قدرے شے سے کہنا تو وہ اپنے آپ میں اچھٹے لگی۔

"معتل! ادھر میری طرف دیکھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم اپنی پرانی بھینچے میں بننا دیکھو تو۔"

گی۔۔۔۔۔

"مجھے کوئی پرالہم نہیں ہے امی!"

"تو پھر اسے دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئی تھی۔؟ یہ کیوں کہا کہ تم اسے نہیں جانتی۔؟ بتاؤ جینا۔"

کون تھا وہ۔؟

ثانیہ نے نرمی اختیار کی، تب وہ اس طرح اچھٹے ہوئے بولی۔

"امی! وہ۔۔۔ جہاں میں جاب کر رہی تھی، وہاں کے پاس جینا ہے۔"

"تمہیں شک کرتا تھا۔؟"

ثانیہ کے مشکوک انداز پر وہ بڑھتی ہوئی۔

"نہیں امی! آپ کچھ غلط نہ سمجھیں۔ مجھے کبھی اس نے شک نہیں کیا تھا۔"

"پھر تم نے اس کی بات کیوں نہیں مانی۔؟"

"مجھے بتا ہے، اسے کیا بات کرنی تھی۔؟ میں کہتا کہ میں اپنی جاب پر واپس آ جاؤں۔"

اس نے کہا تو ثانیہ پھر نرم پڑ گئی۔

"تو جینا۔۔۔ تم آرام سے اس سے کہ سکتی ہو کہ جہیں اب جاب کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اور اس کے بعد یہ بھی بتانا پڑے گا، کیونکہ مجھے میرے پاپا مل گئے ہیں۔ بس کریں امی! ہر بات

ہر ایک سے کہنے والی نہیں ہوتی۔"

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس نے راجھی گولے کو ڈور پائوں میں اترتے دیکھا، پھر روٹی پر نظر میں ٹھہر گئیں۔ اس کی آنکھوں میں شام اتر آتی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اس کے ذہنی جانے سے آداس ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اسے کیسے یقین دلانے کہ وہ اسے تھوڑے دنوں کے لئے جا رہا ہے۔ چند لمبے اسے دیکھا، باہر اس کا دھیان بنانے کی خاطر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"دیکھو، وہ بالکل کھانا پتا ہے کہاں جا کر رہے گا۔؟ میں بتا سکتا ہوں۔ جس رفتار سے وہ چل رہا ہے،

اس سے لگتا ہے بس کوئی نیک ہی جا پائے گا۔ ہے ناں۔؟"

آخر میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ جھپٹا لیا۔

"کیا ہو گیا ہے یار۔۔۔ میں کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہا، جو تم نے باقاعدہ سوگ منانا شروع کر دیا

ہے۔ دیکھو، اب رونا مت شروع کرو جینا۔ مجھے لڑکیوں کے آنسو پونچھنے کا تجربہ نہیں ہے۔"

"تم بہت برے ہو۔"

وہ اس کے رونے انداز پر مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھنے لگا۔

"لڑکیوں کے آنسو پونچھنے میں آتے، اس لئے۔؟"

"آنسوؤں کی نوبت ہی کیوں آئے۔؟ اس سے پہلے تیلی دلا سائیں دے سکتے۔؟"

روٹی نے شامی ہو کر کہا تو وہ پہلے ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"سچ بتاؤں، اگر امی میرے انتظار میں دن نہ گن رہی ہوتیں تو میں ابھی اپنا جانا ملتوی کر دیتا، اور پھر

تمہیں ساتھ لے کر جاتا۔"

روٹی اس کے لہجے کی سچائی میں کھوئی۔

"اور کیا سنا جاتی ہو۔؟ مجھے جمت کے دعوے کرنے نہیں آتے۔ کیا ضروری ہے کہ میں زبان سے

کہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔؟ تم سنا تھیں ہو گی تو میرا کہیں دل نہیں لگے گا۔؟ ہاں۔؟ انہیں لگے گا

دل۔ اس لئے اسے تمہارے پاس چھوڑ چکا گا۔ کبھی۔؟ سنبال کر رکھنا، رکھو گی ناں سنبال کر۔؟"

"نہیں۔! تو بچھو ذکر کچھ سے میں ڈال دوں گی۔"

وہ کہتی ہوئی چل پڑی۔

"تم سے سبکی امید ہے۔"

وہ تیز قدموں سے اس سے آگے چل پڑا اور پھر اسے سیدھا گھر لے آیا، تو وہ بگڑ گئی۔

"سوری۔! ایسی روٹی ہوئی شکل کے ساتھ میں کھانا نہیں کھا سکتا۔ چلو سیدھی اوپر جاؤ اور خبردار جو سوچ

مجھے ہی آف کرنے آئی تو۔۔۔۔۔"

اس کے رعب سے کہنے پر وہ اسے انگوٹھا کھاتی ہوئی سڑھیاں چڑھ گئی تو وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے۔

میں آگیا۔ ابھی اسے اپنا سوٹ کیس پیک کرنا تھا۔ جلدی جلدی دو چار سوٹ الماری میں سے نکالے، پھر شیوگ باکس وغیرہ پیک کر رہا تھا کہ خوبصورت صاحب کے گنگٹانے کی آواز آنے لگی۔ ان کی پوزی آواز میں عجیب سا رد تھا۔ وہ سوٹ کیس چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ خوبصورت صاحب صوفے کی بیک پر سر رکھے گنگٹانے پر تھے۔

”بلھے آ کی جانا میں کون؟“

”ماتا بابا!۔۔۔!“

اس نے دھڑے سے پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے؟ تم ابھی تک سوئے نہیں؟“

”آپ بھی تو جاگ رہے ہیں۔“

وہ کہتے ہوئے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاں! اب اس عمر میں نیند کم ہی آتی ہے۔ خیر! یہ بتاؤ، صبح تمہاری فلائٹ کس وقت

ہے؟“

”گیارہ بجے۔!“

”ہیں؟ گیارہ بجے؟ اور تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟ پھر صبح گیارہ بجے تک پڑے سوئے

رہو گے۔“

”اچھا ہے ماتا بابا۔۔۔ فلائٹ بس ہو جائے گی۔ میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا ماتا بابا!۔۔۔!“

وہ ان کی تنہائی کے خیال سے واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”بیٹا! وہاں تمہاری ماں۔۔۔۔۔“

”ماں سے زیادہ آپ کو میری ضرورت ہے۔“

وہ فوراً بول پڑا۔

”آپ کہہ دیں امی سے، اگر وہ اتنا ہی میرے لئے ترپتی ہیں تو خود آ جائیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”شوٹی بیٹا! چند دنوں کی تو بات ہے۔ ماں کے صبر اور انتظار کو کمزیریت آزماؤ بیٹا!۔۔۔۔۔ چلو اب سو

جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ جاؤ شاباش!۔۔۔“

خوبصورت صاحب نے اسے بچوں کی طرح پکڑا کر اٹھوڑا تو وہ دھمکے لہجے میں بولا۔

”آپ اپنا خیال رکھیں گے ناں؟“

”بالکل رکھوں گا۔ تمہاری شادی سے پہلے مرنے والا نہیں ہوں میں۔ واپس آؤ گے تو میںیں بیٹھا ملوں

گے۔“

خوبصورت صاحب نے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔

”پکی بات؟“

”بالکل پکی!۔۔۔“

خوبصورت صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

☆☆☆

دانیال حسن شاور نے کر ٹکٹے کو ٹائیم الماری سے ان کا کوٹ نکال رہی تھی۔ پھر ان کی طرف گھوم کر پوچھنے

لگی۔

”دانیال! کمال بھائی کیسے ہیں؟۔۔۔ ابھی بھی وہیں رہتے ہیں یا کہیں اور شفٹ ہو گئے

ہیں؟“

”کمال بھائی تو دس سال پہلے دُنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔“

دانیال حسن نے اس کے ہاتھ سے کوٹ لیتے ہوئے بتایا تو اسے دھچکا لگا تھا۔

”سنگ۔ کیا؟ کیسے؟ آپ کہاں تھے؟“

”امریکہ! یہاں ہوتا تو کیا کر لیتا؟۔۔۔ سائنس پوری ہو جائیں تو پھر ساری تدبیریں دھری کی

دھری رہ جاتی ہیں۔“

سامخوگرز دس سال ہو گئے تھے، جب ہی وہ نرلی بتا رہے تھے۔ جبکہ ٹائیم شاکل دھری۔

”بہت افسوس ہوا۔ سیما بھائی اور سچے کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔!“

وہ اب آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش کر رہے تھے۔

”کیا مطلب، پتا نہیں؟“

دانیال حسن نے برش رکھ کر اسے دیکھا، پھر کہنے لگے۔

”بھائی کے بعد تقریباً چار پانچ سال میں سیما بھائی اور بچوں سے رابطے میں رہا۔ اس کے بعد انہوں

نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ کینیڈا جا رہی ہیں۔ اب پتا نہیں کینیڈا میں ہیں یا کہیں اور؟۔۔۔ مجھ سے بہر حال انہوں

نے رابطہ نہیں کیا، اس لئے مجھے نہیں معلوم۔“

وہ خاموش ہو رہی تو پوچھنے لگے۔

”مشعال تیار ہے؟“

”ہاں شاید۔!“

”چلو! پھر تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔“

”ہاں! شونی بھی ذہنی جا رہا ہے ناں، اسے آف کر کے پھر میں کچھ دیر پا کے ساتھ رہوں گی۔“  
وہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئی تو آگے مشعل تیار کھڑی تھی۔

”اچھا، پھر ہمیں اجازت۔۔۔؟“

انہوں نے ٹائی کو دیکھا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چلو بیٹا!۔۔۔!“

”اللہ حافظ امی!۔۔۔!“

مشعل اسے ہاتھ ہلا کر دانیال حسن کے ساتھ چل پڑی، اور جب آفس پہنچی تو آفس دیکھ کر وہ خوش

ہوئی۔

”پاپا! آپ کا آفس بہت شاندار ہے، جہاں میں جاب کر رہی تھی، اس سے بھی زیادہ شاندار۔“

مشعل نے خامسے جوش سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”آپ چاہو تو دوسرے روم دیکھ لو اور اسٹاف سے بھی مل لو۔ پھر جو آپ کرنا چاہو، جہاں بیٹھنا چاہو۔“

”بیٹھوں گی تو میں آپ کے پاس ہی پاپا!۔۔۔!“

وہ فوراً بولی تھی۔

”ایز یو لائک!۔۔۔!“

”اوکے! میں آپ کے اسٹاف سے مل آؤں۔“

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تو بیٹھے ہی انہیں یاد آیا کہ آج علی احمد نے آئے تو کہا تھا۔ تب یاد دہانی کے لئے

انہوں نے علی احمد کو فون کیا، پھر ملازم کو بلا کر کہنے لگے۔

”دیکھو مسٹر علی احمد آ رہے ہیں، انہیں احرام سے یہاں لے آنا۔“

”جی سر!۔۔۔!“

ملازم چلا گیا تو انہوں نے اس نئے پراجیکٹ کی فائل نکال لی، جس پر انہیں علی احمد کے ساتھ کام کرنا تھا۔

پھر تقریباً دس منٹ بعد علی احمد روم میں داخل ہوتے ہی بولے تھے۔

”واؤ!۔۔۔! سٹیک تو تم نے اچھی کر لی۔“

”جیک بول!۔۔۔! بیٹو۔“

انہوں نے اٹھ کر علی احمد سے مصافحہ کیا، پھر انہیں بیٹھے کو کہا، جب ہی مشعل اندر آئی تو وہ اسے دیکھ کر

بولے۔

”پیل اس سے ملو، یہ مشعل ہے۔“

”مشعل!۔۔۔؟“

علی احمد چونک کر مشعل کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولے تھے۔

”جانتا ہوں۔“

”تم مشعل کو جانتے ہو۔۔۔؟“

دانیال حسن نے قدرے حیرت سے پوچھا تو مشعل بول پڑی۔

”جی پاپا! میں ان ہی کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔“

”پاپا!۔۔۔؟“

علی احمد نے سوالیہ نظروں سے دانیال حسن کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”ہاں علی!۔۔۔! مشعل میری بیٹی ہے۔ تمہیں تو سب پتا ہے کہ میں اپنی فیملی کے لئے کتنا ترپا ہوں، لیکن

اب اللہ کرے شکر ہے۔“

”اللہ کا شکر تو ہے، لیکن مجھے تم سے بڑا دکھ ہے۔“

علی احمد نے کہا تو وہ سمجھے نہیں۔

”مجھے۔۔۔؟“

”بالکل!۔۔۔! تم نے سارے دکھ، ساری پریشانیاں میرے ساتھ شیئر کیں اور خوشی اکیلے بہنم کر

لی۔۔۔؟“

علی احمد کا شکوہ سنا تھا۔

”نہیں!۔۔۔! میں تمہیں تانے والا تھا۔“

”بس رہنے دو!۔۔۔! ویسے حیرت ہو رہی ہے۔ تمہاری بیٹی میرے پاس تھی، یعنی بچہ بغل میں اور

ایجنڈا رات میں۔۔۔! مجھے اگر پتا ہوتا تو مشعل تمہاری بیٹی ہے، تو میں اسی وقت تمہیں اطلاع کر دیتا۔ خیر!۔۔۔! یہ بتاؤ،

بالی کیسی ہیں!۔۔۔؟“

علی احمد کو ایک نایاب کا خیال آیا تھا۔

”فیک ہیں، اچھی ہیں۔“

”وہ تو مجھے مشعل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ جس طرح انہوں نے مشعل کی تربیت کی ہے، اس

سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنی سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ میں نے مشعل سے بھی کہا تھا کہ وہ ایک اچھی ماں کی بیٹی ہے۔

یوں مشعل!۔۔۔؟“

آخر میں علی احمد نے تصدیق کے لئے مشعل کو دیکھا تو وہ جبراً مسکرائی تھی۔

”جی بالکل!۔۔۔!“



شام خانہ نے سر جھٹکا تھا۔

”تو بیٹہ! کیوں اپنی مٹی کو پکڑ دے رہے ہو۔؟ صاف بتاؤ تمہیں شادی کرنی ہے کہ نہیں۔؟“ انہوں نے کہا تو زویہ فرابولی۔

”کیوں نہیں کرنی۔؟“

”ہاں ڈیڈ! کیوں نہیں کرنی۔؟“

اس نے زویہ کا مودہ ٹھیک کرنے کے لئے اپنا مودہ دلا تھا۔

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔؟ میرا مطلب ہے تمہاری مٹی نے جو لڑکیاں بتائی ہیں، تو کسے سلیکٹ کیا ہے تم نے۔؟“

انہوں نے پوچھا تو وہ قدرے رک کر بولا۔

”ان میں سے تو ڈیڈ! کوئی نہیں ہے۔“

”پھر۔؟“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”آپ اسے جانتے ہیں ڈیڈ! وہ مجھے پسند ہے۔“

”کس کی بات کر رہے ہو۔؟“

”مشعال، اور آپ سن لیں۔ وہ نہیں تو کوئی نہیں۔“

وہ کہہ کر زکائیں، نیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔ جب زویہ ان کا بازو تھام کر پوچھنے لگی۔

”آپ جانتے ہیں مشعال کو، کون ہے۔؟“

”ہاں! وہ۔“

علی احمد نے چونک کر زویہ کو دیکھا، پھر بتانے لگے۔

”مشعال میرے دوست دانیال کی بیٹی ہے۔ تمہیں شاید یاد ہو، میں سال پہلے دانیال اور اس کی بیوی

ثانیہ، ہم نے انہیں ڈنر پر بھی بلایا تھا، پھر وہ امریکہ چلے گئے تھے۔“

”ہاں ہاں! مجھے یاد ہے۔ مشعال ان کی بیٹی ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے۔؟“

زویہ نے یاد آنے پر فرابولی چھوڑ کر کہنے لگے۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، البتہ مشعال۔۔۔ میرا مطلب ہے، شامی سے پوچھو، کیا مشعال بھی اسے

پسند کرتی ہے۔؟“

”کیا مطلب۔؟“

زویہ! ابھی تھی۔

”شامی! آخر تم چاہتے کیا ہو۔؟ تمہارا مقصد کیا ہے۔؟ خدا خدا کر کے سارہ سے جان بھولی تھی، پھر اب یہ مشعال کہاں سے آگئی۔؟“

زویہ اس کے بہانوں سے عاجز آگئی تھی، اور ابھی وہ یہی کہتی تھی کہ شامان نے ٹالے کے لئے کوئی نام لے دیا ہے، جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں می! کہ مشعال اب کیوں آئی۔؟ اسے تو بہت پہلے آ جانا چاہئے تھا۔“

”کیا۔؟ کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“

”آپ اچھی طرح سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟ مزید یہ بھی سن لیں کہ اگر ڈیڈی نے مشعال کے بارے میں کچھ غلط کہا تو میں یہ مگر چھوڑ دوں گا۔“

اس کے خوس لہجے پر زویہ چکرائی ضرور، لیکن پھر اس پر بگڑ گئی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ اس سے پہلے تم سارہ کے لئے ایسا کہتے تھے۔“

”نہیں! میں نے سارہ کے لئے گھر چھوڑنے کی بات کبھی نہیں کی تھی، اور اسے آپ محض میری دھمکی مت سمجھیں۔ میں مشعال کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”شامی!“

زویہ خانگ ہو گئی۔

”بیٹا! تم کیوں ایسی باتیں کرتے ہو، تمہیں اپنے ڈیڈی سے ضد ہے کیا جو بات وہ پسند نہیں کرتے، تم اسی پر کیوں اڑ جاتے ہو۔؟“

”ضد مجھے نہیں، ڈیڈی کو مجھ سے ہے۔ جیسی تو وہ میری پسند رنجش کرتے ہیں۔ سارہ کا خاندان انہیں پسند نہیں تھا اور دیکھنے کا، مشعال کے بارے میں کہیں گے معمولی جاب کرنے والی معمولی لڑکی۔“

اس نے اپنے آپ کو سوچ لیا تھا۔

”تو بیٹا! اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو تم۔؟ میرا جرم یہ ہے کہ میں تمہیں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن شاید میری قسمت میں یہ ہے ہی نہیں۔“

وہ رو ہائی ہو گئی، جب علی احمد کے آنے پر وہ ان سے بولی۔

”آپ دونوں باپ بیٹا جودل چاہے کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔“

”کیا ہوا ہے۔؟“

علی احمد اس چانک اُفتاد پر بیٹھا گئے۔

”وہی، میری شادی۔؟“

”تم پوچھو اس سے، اور یہ بھی کہو کہ پہلے وہ خود مشعال کو پر پوز کرے۔ وہ ابگری کرے گی، جب ہم باقاعدہ اس کا پر پوز لے کر جائیں گے۔“

انہوں نے زور دے کر کہا تو زویہ سبزید اُٹھی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے، مشعال ابگری نہیں کرے گی؟“

”میں شیور نہیں ہوں۔“

وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو زویہ اس فی صورت حال کو کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مشعال اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ادھر می ڈیڈی شادی پر اسرار کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کرے؟ تو طے تھا کہ وہ اپنی زندگی، اپنے دل میں مشعال کے علاوہ اور کسی کو جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بات اس نے علی احمد سے بھی کہہ دی تھی اور وہ چونکہ پھر زکا نہیں تھا، اس لئے ان کے رد عمل سے بے خبر تھا۔

”چنانچہ انہوں نے می سے کیا کہا ہوگا؟“

رات وہ یہی سوچتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر صبح کافی دن چڑھا تھا، جب زویہ اس کے کمرے میں آئی اور اسے بے خبر سوتے دیکھ کر کھڑکی سے پردے کھینچتے ہوئے اسے پا کر رولی۔

”شامی! اُدیکھو، لکنا دن چڑھ آیا ہے۔ وہ کسسا یا ضرور لیکن آکھیں نہیں کھولیں، تو زویہ اس کے پاس آئی تھی۔“

”کیا ہو گیا ہے بیٹا؟ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کہیں کچھ کھا کر تو نہیں سوئے تھے؟“

”کچھ سے کام نہیں چلے گا می! اُکھانا دوتا تو ایک ہی باز رہ کھالوں گا۔“

وہ کہتے ہوئے بیڑے اتر گیا۔

”شامی! آکھیں ایسا باتیں کرتے ہو۔؟ اچھا یہ بتاؤ تمہاری مشعال سے بات ہوئی۔؟“

زویہ فوراً اصل بات کی طرف آگئی۔

”نہیں! وہ میرا فون ہی آئیڈ نہیں کر رہی۔“

وہ وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“

”چاہئیں!“

”پھر کیسے بات بنے گی بیٹا؟ تمہارے ڈیڈی کبہرے ہیں، پہلے تم مشعال سے بات کرو۔“

زویہ نے کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

”میں مشعال سے بات کروں؟ کیا بات کروں؟“

”نہی کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”یہ آپ سے ڈیڈی نے کہا ہے۔؟“

اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! وہ کبہرے تھے، مشعال ابگری کرے گی تو پھر ہم تمہارا پر پوز لے کر جائیں گے۔“

زویہ نے بتایا تو وہ کچھ نہیں کیا۔

”ڈیڈی نے ایسا کیوں کہا ہے؟ کہیں انہوں نے تو۔۔۔“

”شامی!“

زویہ ٹوک کر کہنے لگی۔

”تم! ڈیڈی کو الزام دینے کی بجائے اپنے آپ کو دیکھو۔ جنہیں اپنی محبت پر بھروسہ نہیں ہے۔“

مشعال تمہارا فون آئیڈ نہیں کرتی، تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، اور تم ہو کہ۔۔۔“

”او فو می! آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟ میں کرلوں گا مشعال سے بات۔“

اس نے کہا تو زویہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

”تم کرنے رہنا، میں ایک دودن میں جاؤں گی اس کے گھر، شادی کی بات تو ہوتی رہے گی۔ میں

ٹائیہ بھائی سے تو مل آؤں۔“

”ٹائیہ بھائی؟ یہ کیوں ہیں؟“

وہ پھر حیران ہوا۔

”مشعال کی می، جنہیں نہیں پتا؟ مشعال تمہارے ڈیڈی کے دوست دانیال حسن کی بیٹی ہے۔“

زویہ تباہ کر پوچھنے لگی۔

”تم مشعال سے کہاں ملے؟“

وہ فوراً جواب نہیں دے سکا۔ سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے، تو ”بتاؤں گا“ کہتے ہوئے واش روم میں بند ہو گیا تھا۔ پھر شاور لینے کے دوران وہ سلسل ہی سوچنا رہا کہ یہ بات ڈیڈی نے پہلے اسے کیوں نہیں بتائی؟ یا وہ خود بھی لاعلم تھے؟ کچھ بھی تھا، وہ اب فوراً مشعال سے ملنا چاہتا تھا۔ شاور کے نکلا تو پہلے اسے فون کیا تو پہلی بار اس کی کال ریسپونڈ نہیں ہوئی مگر دوسری بار رٹائی کرنے پر مشعال کال لینے کے ساتھ خاصے اکھڑے لچے میں بولی تھی۔

”فرمائیے!“

”مشعال.....! میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

اس نے فوراً کہا تو وہ سابقہ انداز میں ہوئی۔

”یہی پوچھیں گے ناں کہ دانیال حسن کی بیٹی کو جاب کی کیا ضرورت تھی.....؟ دیکھیں شامان

صاحب.....! یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں جاب کیوں کر رہی تھی.....؟ میں نے ریڑائن کیوں دیا.....؟ آپ کو ان

باتوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی چاہئے۔“

”مجھے واقعی ان باتوں سے غرض نہیں ہے مشعال.....!“

اس نے دھیر سے کہا۔

”غرض نہیں ہے تو پھر کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے.....؟ بار بار فون کرتے ہیں۔ رائے میں نظر آتی تو

پکار لیتے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ یہ کتنی غلط حرکت ہے.....؟“

وہ سخت لالاں تھی۔

”آئی ایم سوری مشعال.....! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن پلیز.....! تم میری بات سنو.....!“

اس نے معذرت کے ساتھ عاجزی سے کہا تو وہ بڑبڑا ہوا کر ہو کر ہوئی۔

”کیا بات.....؟“

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ دیکھو منع کرتا۔ یہ بہت ضروری ہے مشعال.....! مجھ کو میری زندگی کا

معاملہ ہے۔ ایک بار آ جاؤ، پلیز.....! آ رہی ہوں.....؟“

اس کی منت پر ادھر خاموشی چھا گئی تو وہ پکار پکار کر بولا۔

”سنو مشعال.....! میں چری مال کے کینے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے خود سلسلہ منقطع کر دیا اور ایک دم متحرک ہو گیا۔ وہ من میں تیار ہوا اور تقریباً

آدھے گھنٹے بعد چری مال کے کینے میں موجود تھا، اور وہ پورے دو گھنٹے بعد آئی تھی اور خاموشی سے اس کے سامنے

بیٹھ گئی تو کتنی دیر وہ اسے دیکھ گیا۔ جب وہ بڑبڑا ہونے لگی، جب کوپا ہوا۔

”کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے، میری محبت سے.....؟ کیا صرف اس لئے کہ تم نے میرے ساتھ سارہ کو

دیکھ لیا ہے.....؟ ہاں.....! میں نے سارہ کے ساتھ وقت گزارا ہے، اس کے ساتھ زندگی بھی گزار سکتا تھا۔ اگر تم نہ

آتیں۔“

مشعال نے ٹھٹھا: ہونٹ دانتوں میں دبا کر گویا کچھ نہ کہنے کا تجربہ کیا۔

”تم نے مجھے محبت کا اور اک دیا ہے مشعال.....! میرے دل میں محبت کی آگ ساکرا کر اب دامن کیوں

بچا رہی ہو.....؟ نہیں مشعال.....! تم دامن نہیں بجا سکتیں.....! چاہو گی تب بھی نہیں.....! جو آگ میرے دل میں بھڑک

رہی ہے، اس کی پیش سے تم بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں.....“

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔ بہت زور دینا انداز تھا۔

”میں محفوظ رہوں یا جل کر رہ جاؤں، آپ کو اس سے غرض نہیں ہوتی چاہئے۔“

”تو تمہیں کیا غرض تھی.....؟ بھاگنے دینی مجھے سارہ کے پیچھے۔“

”میں نے آپ کو سارہ کے پیچھے بھاگنے سے نہیں روکا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اس کی آزمائش

سے پہلے خود کو آزمائیں۔“

وہ سچ کر بولی تھی۔

”اس لئے تاکہ تم جانتی تھیں، جب میں اپنے دل کو نونوں کا تو تمہاری جینگی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے

گی۔“

وہ جانے انہماک میں اسے فصد دلدار تھا۔

”نہیں.....! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“

وہ خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جبکہ دھیان ایسی کی طرف تھا۔ وہ اپنے آپ میں الجھ رہی تھی۔ جب

وہ بار بار کر بولی۔

”سنو.....! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی میں ہر قدم تمہیں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ

سے شادی کرو گی.....؟“

مشعال نے کچھ کہنے کے لئے منکھولا تھا کہ وہ فوراً بولا۔

”ناں کہنے سے پہلے سوچ لینا۔ میرا دل تمہارے انکار کی تاب نہیں لاسکے گا۔ میں تمہیں فوراً نہیں کر رہا

مشعال.....! لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہاں یا ناں سے پہلے اپنے اندر جھانک لو۔ ہو سکتا ہے تمہارے دل کے کسی کونے

میں جھپی میری محبت کی چنگاری اچانک بھڑک اٹھے۔“

وہ چاہنے کے باوجود نظریں نہیں اٹھا سکی اور اپنے چہرے پر جیسی اس کی نظریں بری طرح محسوس ہو رہی

تھیں۔ تب وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے ڈونٹک جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

دانیال حسن کو اچانک یاد آیا کہ انہیں خواجہ صاحب کے ہاں سے ٹائیڈ کوپک کرنا ہے تو انہوں نے فائل

بند کر دی اور اٹھنے لگے تاکہ ایک لڑکی کو اپنے روم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر رک گئے۔

”جی.....؟“

ان کا انداز سوالیہ تھا۔

”میرا نام سارہ ہے اور میں نے نکل مشعال کو یہاں سے آپ کے ساتھ لٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔“  
اس نے کہا تو وہ خوش اخلاق سے بولے۔

”اوہ.....! تو آپ مشعال کی دوست ہیں؟“  
”دوست؟“

وہ طنز آمیز سکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سوری.....! میں مشعال جیسی لڑکیوں سے دوستی تو دور کی بات، ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔“

”ہاؤ ٹیل یو؟“

ان کی پیشانی پر بے شمار شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”جانتی ہیں، آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں؟“

”بہت اچھی طرح، وہی مشعال جو کچھ عرصہ پہلے علی احمد صاحب کے آفس میں ان کے بیٹے شہمان پر ڈور سے ڈال رہی تھی۔ آپ کو کیا آپ کے بیٹے کو پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”شٹ آپ.....!“

غصے سے ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔

”شرم آتی چاہتے تھیں، میں مشعال کا باپ ہوں۔“

”باپ؟“

سارہ کو سمجھ کا لگا تھا۔

”ہاں باپ۔ مشعال میری بیٹی ہے۔“

انہوں نے زور دے کر کہا تو وہ بد نظیری سے بولی۔

”آپ کی بیٹی ہے تو لگام ڈال کر رکھیں اسے، اور اسے یہ بھی سمجھا دیں کہ شامی میرے سو کا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے اور شامی کے درمیان سے ہٹ جائے، ورنہ.....“

”شٹ یور ماؤ تھو اینڈ گیٹ آؤٹ.....! آئی سے گیٹ آؤٹ؟“

وہ بالکل آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا، اسے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔  
”ہو نہہ.....!“

سارہ غصے سے سر جھٹکتی ہوئی، پھر جھٹکتے ہوئے چلی گئی تو انہوں نے سر ہٹا کر لیا۔ ان کا ذہن بری طرح

جھنجھٹا تھا۔ یہ بھی یاد نہیں رہا کہ انہیں ٹائیڈ کو لینے جانا تھا۔ انہوں نے اس لڑکی کو تو کھال دیا تھا، لیکن اس کی باتیں مسلسل کانوں میں گونجنے لگی تھیں۔

”وہی مشعال جو پہلے شہمان پر ڈور سے ڈال رہی تھی، اب آپ کو کیا آپ کے بیٹے کو پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”میرے خدا!.....!“

ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ حلق میں کانٹے جیسے لگے تھے۔ انہوں نے گلاس کو دیکھا، پانی نہیں تھا، اور ملازم کو بلانے کی ہمت نہیں ہوئی، نہ اٹھنے کی سکت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہانگوں میں جان ہی نہ ہو۔ جب ہی فون کی بیل بج اٹھی تو انہوں نے بمشکل ریسپورڈ دیا تھا۔

”کہاں رہ گئے دانیال؟“

ادھر ٹائیڈ تھی۔

”ہاں.....! میں.....! میں آفس میں ہوں۔ مشعال کہاں ہے؟“

ان کا ذہن مشعال میں الجھا ہوا تھا۔

”مشعال گھر پر ہے۔“

ٹائیڈ نے بتایا تو وہ کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے! تم بھی گھر چلی جاؤ، مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ریسپورڈ رکھ دیا۔ پھر خود پر قابو پانے میں انہیں بہت دیر لگی، اور گھر آتے آتے تو رات ہو گئی۔ وہ بے حد نڈھال لگ رہے تھے، جب ہی ٹائیڈ انہیں دیکھتے ہی پریشان ہو گئی۔

”دانیال.....! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟“

”ہوں.....!“

وہ سیدھے دوش روم چلے گئے۔ چہنج کر کے نکلے تو لیٹ گئے۔

”کھانا نہیں کھا میں نے کیا.....؟“

ٹائیڈ نے انہیں لینے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں.....! مجھے جھوک نہیں ہے۔“

انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تو ٹائیڈ مزید پریشان ہو کر ان کے قریب آ گئی۔

”دانیال.....! کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں.....! بس وہ.....“

”کیا بس وہ؟ کیا میں ناں دانیال.....! کیا ہوا ہے؟“

ٹائیڈ نے ان کی آنکھوں پر رکھا ہوا پکڑ کر کھینچ لیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”پتا نہیں ٹائیڈ.....! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ میرا دوست علی احمد یاد ہے تمہیں؟“

”علی احمد...؟“

”ثانیہ نے چند لمحے سوچا۔“

”ہاں! آپ مجھے ان کے گھر بھی لے گئے تھے، اس وقت ان کا ایک بیٹا تھا۔“

”ہاں! وہی۔“

”وہ اٹھتے ہوئے بولے۔“

”مشعل اسی کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔“

”اچھا۔! تو مجھے نہیں معلوم۔“

”معلوم تو علی احمد کو بھی نہیں تھا کہ مشعل میری بیٹی ہے۔“

”ظاہر ہے، انہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔؟“

”ثانیہ کہہ کر پوچھنے لگی۔“

”تو آپ اس لئے پریشان ہیں کہ مشعل علی احمد کے آفس میں جاب کر رہی تھی۔؟“

”نہیں! میں اس لئے پریشان نہیں ہوں۔“

”وہ اٹھے، پھر جیسے تانے پر آمادہ ہو کر کہنے لگے۔“

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ آج آفس میں میرے پاس ایک لڑکی آئی تھی جو یہ کہہ گئی ہے کہ میں مشعل کو

”سمجھاؤں کہ وہ اس کے اور شامان کے درمیان سے ہٹ جائے۔“

”شامان...؟“

”ثانیہ پریشان ہو گئی۔“

”شامان کون ہے۔؟“

”علی احمد کا بیٹا ہے۔“

”انہوں نے بتایا تو ثانیہ کو فوراً ہی یاد آیا کہ اس روز شاپنگ مال پر شامان کس طرح مشعل کو پکارتے

”ہوئے آیا تھا۔“

”تم کیا سوچتے گئیں...؟ کیا مشعل نے انہیں شامان کے بارے میں بتایا تھا۔؟“

”انہوں نے پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔“

”نہیں! اس نے تو کچھ نہیں بتایا، لیکن میں پوچھوں گی اس سے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ مشعل مجھ

”سے کچھ نہیں چھپائے گی۔“

”دانیال حسن اسے دیکھ کر رو گئے تھے۔“

”...ٹھنڈی لی پیریشانی بظاہر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر مشعل ان کے درمیان کوئی بات ہوئی تو وہ

”انہاں کی نظروں میں بھی ہرٹ ہوگی اور ابھی وہ مشعل سے پوچھنے کے لئے خود کو تیار کر رہی تھی کہ زوبیہ آگئی۔“

”درمیان میں بیس سال تھے، پھر بھی ثانیہ نے اسے پہچان لیا، کیونکہ وقت اس پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوا تھا۔“

”میں زوبیہ ہوں، مسز علی احمد۔ پچھنا۔؟“

”زوبیہ نے اپنے تعارف کے ساتھ کہا تو وہ اس کی اچانک آمد پر مشکل ہو کھلا ہٹ چپا کر بولی۔“

”جی جی! ابھی کئی دانیال آپ کو گواہ کر رہے تھے۔ بیٹھیں پلیز!“

”شکریہ!“

”زوبیہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔“

”مجھے بھی علی نے ابھی کچھ دن پہلے بتایا ہے کہ آپ لوگ یہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔“

”کیسی ہیں آپ، اور بچے وغیرہ۔؟“

”ثانیہ نے پوچھا تو زوبیہ بیٹھتے ہوئے بولی۔“

”بچے...؟ جیسی...! ایک ہی بیٹا ہے، اور آپ کے کہنے بچے ہیں۔؟“

”میری بھی ایک ہی بیٹی ہے۔“

”اچھا! شادی کر دی بیٹی کی۔؟“

”زوبیہ نے انجان بن کر پوچھا۔“

”نہیں! ابھی تو نہیں، ایک جگہ بات چل رہی ہے، دیکھیں اللہ کیا منظور ہے۔؟“

”اس نے قصداً غلط بیانی کی تو زوبیہ فوراً بولی تھی۔“

”اللہ کو یہ منظور ہے کہ ہم ایک ہو جائیں۔“

”جی...؟ میں سمجھتی نہیں۔“

”وہ پھر انجان بنی، جبکہ دل میں اہاں اٹھنے لگا تھا۔“

”ناگہم کی کیا بات ہے ثانیہ...؟ اللہ نے اتنے عرصے بعد شاید اسی لئے ہمیں ملایا ہے کہ ہمارے بچوں

”کا جوڑا ہانوں پر لکھا ہے۔“

”زوبیہ نے جتنے جوش سے کہا، وہ اسی قدر زور بھی بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میں جائے کا کتنی ہوں۔“

”ارے نہیں ثانیہ! چائے میں جب علی کے ساتھ آؤں گی، تب پیوں گی۔ ابھی تو میں کہیں اور جا

”رہی تھی، سوچا تم سے مل لوں۔“

زود یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

”اور ہاں! میری بات سوچنا ضرور میں پھر آؤں گی۔“

ٹانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے رخصت کر کے مشعال کے کمرے میں آئی اور اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے امی؟“

مشعال نے پوچھا تو وہ حیرتی سے اس کے قریب آ گئی۔

”جو میں پوچھوں، سچ کچ بتانا۔ تمہارے اور شامان کے درمیان کیا معاملہ ہے؟“

”میرے اور شامان کے درمیان؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ اور آپ شامان کو کیسے جانتی

ہیں؟“

مشعال اندر سے خائف ہو گئی تھی۔

”تم میری بات کا جواب دو۔“

اس کی سختی سے مشعال رو پانسی ہو گئی۔

”میرے اور شامان کے درمیان کچھ نہیں ہے امی! آپ سے یہ بات کس نے کہی ہے؟ مجھے

بتائیں تو۔“

”کیا کرو گی جان کس؟“

”کچھ نہیں کروں گیا، لیکن یہ تو پتا چل جائے گا کہ میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کون کر رہا ہے؟ اور

اس کا مقصد کیا ہے؟“

مشعال نے کہا تو وہ دانت چس کر بولی۔

”اس کا مقصد جو بھی ہو، تمہارے پاپا کو یہ بات بہت بری لگی ہے۔“

”پاپا؟“

مشعال پکڑا گئی۔

”ہاں! کوئی لڑکی تمہارے پاپا سے کہہ گئی ہے کہ تم اس کے اور شامان کے راستے سے ہٹ جاؤ۔“

ٹانیہ نے کہا تو وہ مزید پکڑا گئی۔

”آف! وہ یقیناً سارہ ہی ہوگی۔“

”کون سارہ؟ تم جانتی ہو سارہ کو؟“

اس نے فوراً پوچھا۔

”جی! وہ شامان کی دوست ہے، اور اس نے مجھ سے بھی کہا تھا، جب ہی تو میں نے ریزا ان کے

دیا تھا۔ میں کسی کے درمیان نہیں ہوں امی! سارہ کو غلط فہمی تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں امی! میرا

یقین کریں۔ میں کسی کے درمیان نہیں تھی۔ سارہ جھوٹی ہے۔“

وہ رونے لگی۔ ٹانیہ نے اسے چپ نہیں کرایا، مزید جیسے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

”اور جو ابھی شامان کی امی آئی تھیں، تمہارا پر پوزل دے گئی ہیں، انہیں کیا جواب دیا جائے؟“

بتاؤ!۔“

”سبک کیا؟“

وہ ہونچکی ہو گئی۔

”میں کیا بتاؤں؟ جو آپ کا دل چاہے، کریں۔ منع کر دیں بے شک!۔“

مشعال روتے ہوئے بولی تھی۔

”منع تو میں کر دوں گی۔“

ٹانیہ جیسے خود سے فیصلہ کرتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆☆

مشعال بیڈ پر اوندھے منہ گری سکتی دیر روٹی رہی۔ پھر اس نے غصے سے سیل فون اٹھا کر شامان کا نمبر

پیش کیا تھا۔

”میں بڑی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

اوسرے وہ کال ریو کر تے ہی بولا تھا۔

”میں آپ کو ہمیشہ کے لئے انتظار کی دقت سے بچا رہی ہوں شامان بلی! کیونکہ میں سیل فون کے

ساتھ اپنے دل سے بھی آپ کا نام Delete کر رہی ہوں۔“

اس نے کہا۔

”چلو تم نے تو اعتراف کیا کہ تمہارے دل پر میرا نام نقش تھا۔“

وہ پریشانی میں بھی جتا کر پوچھنے لگا۔

”ایسا کیوں کر رہی ہو؟“

”مجھے یہی کرنا چاہئے، کیونکہ آپ کی وجہ سے میں اپنے پیرئس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں

رہی۔“

”میری وجہ سے؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“

”کسی نے بھی کیا ہو، وجہ آپ ہی ہیں، اور پلیز! آئندہ مجھے فون مت کیجئے گا۔“

وہ سیل آف کرنے لگی تھی کہ وہ بول پڑا۔

”مشعل..... چلیز، میری بات سنو.....! مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

”سارہ سے پوچھیں، وہ میرے پاس کیوں گئی تھی؟“

اس نے کبہہ کرکیل آف کر دیا تھا۔ پھر سارا دن وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ ٹانیہ اور دانیال حسن کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کی جان جاری تھی۔ دو پہر میں تو ٹانیہ نے خود اسے نہیں بابا، لیکن رات کے کھانے کے لئے ملازمہ کو بھیجا تو بھی اس نے بھوک نہ ہونے کا کبہہ کر منہ کر دیا، اور کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ شاید ٹانیہ خود آئے گی۔ لیکن وہ نہیں آئی، تب وہ مندر سر لیٹ کر سو گئی، اور اسے بتا بھی نہیں چلا، رات کس وقت دانیال حسن کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے سیل فون کی بجائے جمل بھر رہی تھی، جب ہی دانیال حسن نے اس کا سیل فون اٹھا کر منیج دیکھا تھا۔

”تم اپنے دل سے میرا نام Delete نہیں کر سکتی مشعل! کیونکہ میری محبت اتنی بڑی نہیں ہے۔“

انہوں نے شانمان کا نام دیکھا، پھر سیل رکھ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ صبح اس نے منیج کے ساتھ شانمان کا نام بھی Delete کر دیا تھا۔ لیکن دل کا کیا کرتی، جو اس نقش کو چھوٹے سے بھی نہیں دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

خواجہ صاحب وہیں بیٹھے تھے جہاں شوبی جاتے ہوئے انہیں چھوڑ کر گیا تھا، جب ہی اس نے سفری بیک پیجنگ کر خوشی سے نعرہ لگایا تھا۔

”نانا بابا! میں آ گیا نانا بابا!.....!“

”ارے! میرا بچہ۔!“

خواجہ صاحب نے ہاتھیں پھیلا دیں تو وہ ان سے لپٹ گیا۔

”بہت جلدی آ گئے؟“

”ہیں؟ میں تو سوچ رہا تھا، آپ کہیں گے، بہت دن لگا دیئے۔“

شوبی نے کہا تو وہ سکرا کر پوچھنے لگے۔

”ماں کسی ہے تمہاری؟“

”اچھی ہیں، آپ کو بہت سلام کہہ رہی تھیں۔“

وہ جواب کے ساتھ پوچھنے لگا۔

”آپ اس دن سے کیسے بیٹھے ہیں نانا بابا!.....؟“

”ہاں!..... تم سے کہا تھا، میں بیٹھا ہوں، تو بیٹھا رہا۔“

خواجہ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ پھر ان سے لپٹ گیا۔ تب ہی روٹی کھانے کی ٹرے لائے آگئی۔

”نانا بابا!.....!“

پھر شوبی کو دیکھ کر خوش گوار حیرت میں گھر گئی تو وہ اس کے ہاتھوں میں ٹرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

”کیا ہے یہ؟“

”یہ میں نانا بابا کے لئے کھانا لائی ہوں۔“

”صرف نانا بابا کے لئے کیوں؟ میں کیا کھاؤں گا؟.....؟“

”شوبی!.....!“

خواجہ صاحب نے اسے ٹوکا پھر روٹی سے بولے۔

”جاؤ بیٹی!.....! جگن میں رکھ دو، اور ہاں!.....! اپنی ماں سے کہنا، تکلیف نہ کرے۔ شوبی آ گیا ہے، اب یہی پکائے گا۔“

”جی نہیں نانا بابا!.....! میں کوئی نہیں پکائوں گا۔ پکانے والی ملے آئیں اب۔ میں امی سے بھی کہہ آیا ہوں۔“

اس نے کہتے ہوئے روٹی کو آکھ ماری تو وہ جو ہمیشہ آنکھیں دکھاتی تھی، بھر مار بھاگ گئی جس پر وہ زور سے ہنستا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹانیہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کا جائزہ لے رہی تھی کہ دانیال حسن کمرے میں داخل ہو کر ذکر رک گئے اور آئیے میں سرائتی نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کہاں کی تیاری ہے بھی؟.....؟“

”لیجئے، اتنی جلدی بھول گئے؟.....؟“

ٹانیہ ان کی طرف لپٹ کر کہنے لگی۔

”بس!.....! آپ بھی جلدی سے فریش ہو جائیں۔ مسز آمنہ کے ہاں جاتا ہے۔ وہ کتنی بار فون کر چکی ہیں۔ بس چلیں، دیکھ آتے ہیں ان کے لڑکے کو۔“

”تم نے مشعل سے پوچھ لیا ہے؟.....؟“

دانیال حسن پر ٹانیہ کی ٹکٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”پوچھوں گی مشعل سے بھی، پہلے لڑکا تو دیکھ آئیں۔“

جانے لے کہا تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”نہیں ٹانیہ۔! یہ ساری باتیں بعد میں آتی ہیں، پہلے بیٹی کی رضامندی ضروری ہے، اور ہاں..... اتم نے بتایا تھا علی احمد کی سڑ بھی اسی سلسلے میں آئی تھیں۔“

”انہیں تو خیر میں منع کر دوں گی۔ مجھے مشعال کی شادی وہاں نہیں کرنی۔“

وہ فوراً بولی تھی۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے تم نے اپنے آپ سوچ لیا، فیصلہ کر لیا.....؟“

”ہاں.....! میں مشعال کی ماں ہوں۔ کیا مجھے حق نہیں ہے اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے

کا.....؟“

وہ پہلی بار ہٹ دھرم لگ رہی تھی۔

”بالکل ہے، لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ مشعال کی مرضی معلوم

کئے بغیر ہم اپنے طور پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

انہوں نے دھیرے دھیرے سمجھا دی کہ کوشش کی تو وہ ناگواری سے بولی۔

”میں مشعال سے پوچھ چکی ہوں۔ شائمان کے لئے اسے منع کر دیا ہے۔“

”اچھا.....؟“

وہ حیران ہوئے۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے تم مشعال کے ساتھ زبردستی کر رہی ہو.....؟“

”ہاں.....! کر رہی ہوں زبردستی۔“

دو جگہ ٹکی تھی۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کا نصیب مجھ جیسا ہو۔ گھر سے بے گھر کی جائے۔“

”ٹانیہ.....؟“

وہ ہنسنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”مطلب مجھے میرے گھر سے نکالنے والی حنا تھی اور وہاں سارہ موجود ہے۔ وہی سارہ جو آپ کو وارن کر گئی تھی۔ کیا وہ ہماری بیٹی کو چین سے رہنے دے گی.....؟ نہیں دانیال.....! میں لے جانتے ہو جیسے ہوئے اپنی بیٹی کو آزمائشوں میں نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، میں نے بیس سال کیسے گزارے ہیں.....؟ سر پر پھٹ تو تھی، پھر بھی بے سائبانی کا احساس ہر پل کچھ کٹا تھا۔ بیوگی کے دکھ سے بڑا دکھ کھینچا ہے میں نے۔ اب اور ہمت نہیں

روہ نے لگی تو دانیال نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر قدرے بھر مارا انداز

میں بولے تھے۔

”میں نے علی احمد سے ہائی بھری ہے۔ وہ اور ان کی سزا بھی آنے والے ہوں گے۔“

”کیا.....؟“

وہ جھکے سے اٹھی تھی۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا دانیال.....؟ محض اپنی دوستی کی خاطر بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہیں.....؟“

پھر اس کے لمحے میں طرست آتا تھا۔

”آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مشعال آپ کے سامنے بڑی نہیں ہوئی، آپ نے بچپن میں اسے اپنی

ہاتھوں میں نہیں چھلایا۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، اس کے ساتھ کچھ بھی ہو.....؟“

”کچھ نہیں ہوگا ٹانیہ.....! کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ زور سے کہنے لگی۔

”میں تمہیں یقین دلانا ہوں، میں نے دوستی میں، مشعال کی محبت کو دیکھتے ہوئے اور یہ سوچ کر شائمان

کے رشتے کی بانی بھری ہے کہ آخر تک یہاں بیوی کے درمیان حنا اور سارہ جیسی رنجش پیدا کرتی رہیں گی۔ بس

اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔“

”آپ کے کہنے سے ختم ہو جائے گا، کیا شیطان مر جائے گا.....؟ نہیں دانیال.....! شیطان تو ازل سے

آدم اور حوا کے درمیان موجود ہے۔“

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ دانیال حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ٹانیہ کے ساتھ بولے۔

”بے شک شیطان موجود ہے۔ لیکن..... کیا تمہیں یاد نہیں، میرے ایک دوست جہانزیب اور اس کی

بیوی جانیہ کے درمیان بھی ایک شیطان ہی تو تھا، جس نے اویسے جھگڑے استعمال کر کے ان دونوں میں فساد برپا

کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر جانیہ بھائی نے عقل مندی کا کام لیتے ہوئے جہانزیب کو اپنے اعتماد میں لے کر

اس شیطان کے مطلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ نتیجہ کیا نکلا.....؟ آخر شیطان کو ہی ہارنا پڑا نا.....!“

دانیال حسن ایک لمحے کو خاموش ہوئے، پھر کہنے لگی۔

”ہاں.....! میں مانتا ہوں کہ شیطان واقعی ہی موجود ہے، لیکن اس سے بڑی ذات اللہ کی ہے، اور یہ

ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کو آرام سے شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بڑے رنگین

خواب دکھاتا ہے شیطان، انسان اپنی مدد بھڑکھڑاتا ہے۔ ہوش تب آتا ہے جب وہی رنگین خواب بھیا تک تعبیر

لے کر سامنے آتے ہیں۔“

”پھر بھی آپ.....؟“



”ہاں.....! پھر بھی میں شیطان کا تعرض لوٹنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اس کا وار چل گیا تھا اور میرے دوست جہانزیب پر بھی اس شیطان مردود کا وار چل جاتا، اگر جانیہ بھابی اسے اپنے اعتماد میں نہ لیتیں۔ مگر اب میں اپنی بیٹی مشعال پر اس شیطان مردود کا وار ہرگز، ہرگز نہیں چلے دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنے دل سے سارا کا خوف نکال دو۔“

وانیال حسن نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”وانیال.....!“

وہ کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

”مشعال اور مشعال کی خوشیاں مجھے خود سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ میں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے شانمان کا رشہ منظور کیا ہے۔ کیونکہ وہ مشعال کی پسند ہے۔ پھر بھی اگر تم نہیں چاہتیں تو میں علی احمد کو منع کر دوں گا۔“

”نہیں.....!“

اس نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر رکھی انگلی والا ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ وانیال حسن نے مسکرا کر اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

زندگی میں دُھوپ نہ ہو تو چھاؤں کی تمنا ہو ہی نہیں سکتی، اور یہ تمنا میں ہی تو دل کو اُکساتی ہیں۔ ابھی چلنا ہے، اور چلنا ہے، چلتے چلے جانا ہے، تاوقتیکہ منزل پہ نہ پہنچ جائیں۔

جانیہ اپنی منزل پر پہنچ کر آسودگی سے پلکیں موندتے ہوئے مشعال اور شانمان کی خوشیوں کی تمنا کرنے کے ساتھ دل سے دُعا گوئی۔

**اختتام**